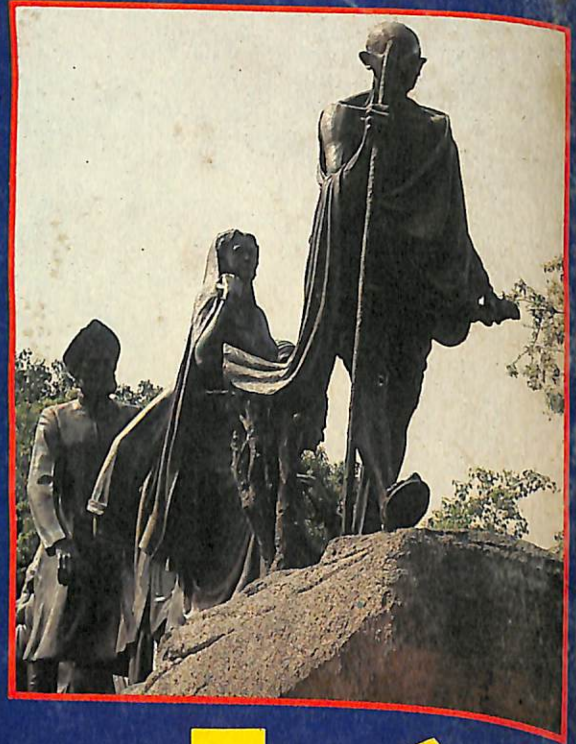
خصوصی شمارہ

راشٹریہ سہارا



ماہنامہ
نئی دہلی ۱۵ اگست تا ۱۴ ستمبر 1992



غلامی سے



آزادی تک



اسیلونا اولمپک آغاز سے انجام تک

Rs. 10/-



ماہنامہ

راشٹریہ سہارا

نئی دہلی

14 ستمبر 1992

جی ایف 4 ، اندر پرکاش بلڈنگ، بارہ کھمبا روڈ
نئی دہلی



صحافتی سفر کا ایک سال

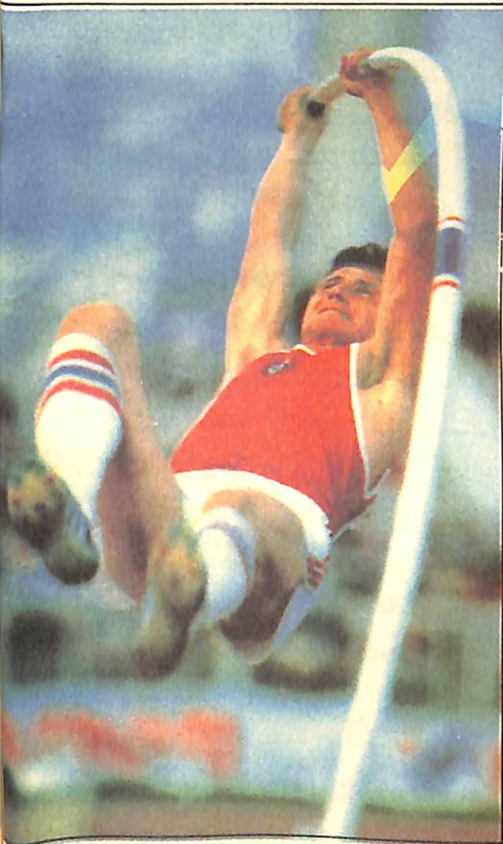
15 اگست کو سہارا انڈیا ماس کمیونیکیشن کی زیرِ سرپرستی شائع ہونے والے ہندی روزنامہ "راشٹریہ سہارا" نے اپنی کامیاب اشاعت کا ایک برس پورا کر لیا ہے. جس کے لیے ہم اپنے تمام قارئین اور خیر خواہوں کے شکر گزار ہیں جن کی رہنمائی ہر قدم پر ہماری حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے کم عرصے میں سہارا انڈیا ماس کمیونیکیشن ہندی روزنامہ (دلّی اور لکھنؤ) کے ساتھ ساتھ گزشتہ 2 اکتوبر سے اُردو ماہنامہ کی کامیاب اشاعت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے اور یہ بہت جلد ایک معیاری انگریزی ماہنامہ منظرِ عام پر لانے والا ہے۔

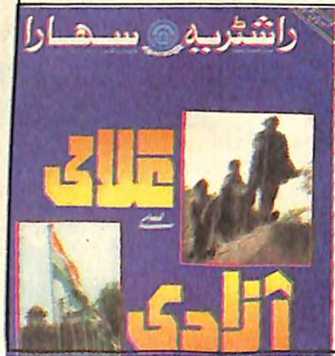
سہارا انڈیا ماس کمیونیکیشن کا میدانِ صحافت میں قدم رکھنے کے ساتھ روزِ اوّل سے ہی یہ مقصد رہا ہے کہ ایک ایسا قومی اسٹیج تیار کرے جس کے ذریعے سیاست، حکومت، انصاف تعلیم، صحافت، سائنس زراعت اور تجارت وغیرہ کے میدان میں رہنمائی کرنے والے حضرات تمام چھوٹے بڑے مسائل پر بحث و مباحثہ کر کے نتائج نکال سکیں اور عوام کی فلاح و بہبود میں نئی راہیں ایجاد کی جا سکیں۔

علاوہ ازیں سہارا انڈیا ماس کمیونیکیشن کا ایک اہم مقصد ملک کے عوام میں بجھتی ہوئی عزتِ نفس اور ذمہ داریوں کے احساس کو جگانا ہے اور عوام کی انسانی رواداری کے جذبہ کو تعمیری سمت میں بڑھانا ہے تاکہ ملک کی ترقی کی راہیں ہموار ہوں اور تمام ہندوستانی قوم اتحاد و اخوت کا دامن تھامے رہے۔

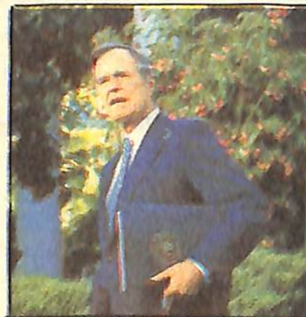
سلگتے مسائل جلتا کشمیر







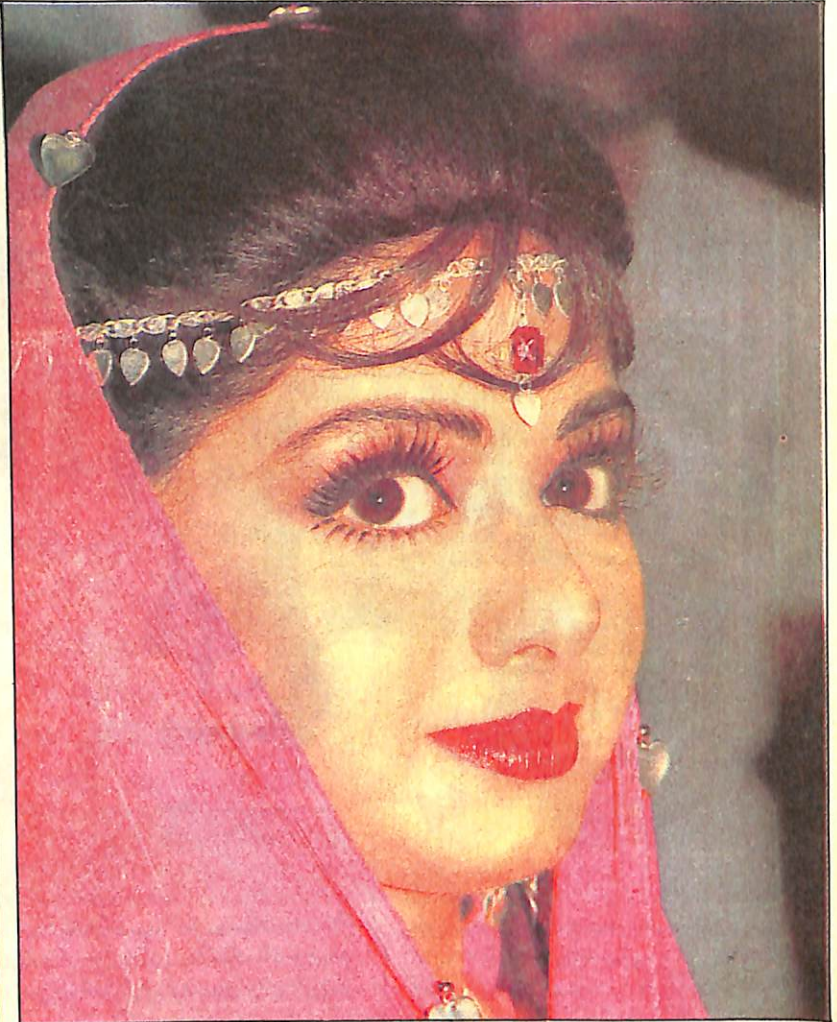
امریکی جال میں مغربی ایشیا



فلم نگری

ٹی وی اسکرین

کھیل کھلاڑی



راشٹریہ سہارا

جلد 1 شمارہ 3۔10۔15 اگست تا 14 ستمبر ۔ قیمت 10 روپے

مجلس ادارت : راشٹریہ سہارا پریوار   مینیجنگ ایڈیٹر : جے ۔ برت رائے

ٹیلیفون : دہلی آفس۔ 3322597 Fax : 3323949

ٹیلیفون : نوئیڈا آفس۔ 89-50744, 89-50747, 89-50737, 89-24779, 89-20692, Fax : 89-50750.

سہارا انڈیا ماس کمیونیکیشن کے لیے، یو۔ کے۔ بوس کے ذریعے نوئیڈا میں چھپا اور دنیش چند سریواستو نے جی۔ ایف 4، اندر پرکاش بلڈنگ، بارہ کھمبا روڈ، نئی دہلی سے شائع کیا۔

تصاویر : راشٹریہ سہارا فوٹو سیکشن

تزئین : راشٹریہ سہارا آرٹ سیکشن



علیحدگی

پسندی اور دہشت گردی کے رجحان میں شدت کی وبا تو تکلیف دہ بات ہے ہی مگر اس سے بھی زیادہ باعث فکر و پریشانی ہے ان خانماں بربادوں کی حالتِ زار جو اس لعنت سے متاثر ہو کر اپنے گھر بار، زمین جائداد، مال و اسباب، آرام و آسائش، چین و سکون اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر پھٹے پرانے ٹینٹوں میں کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ایسے ہی بد قسمت انسانوں کی ایک بڑی تعداد موسمِ سرما کی کشمیر کی راجدھانی جموں میں انتہائی مصیبت اور پریشانی میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

جموں کے نزدیک پرکھو جھڑی، مٹھی اور مشری والا کیمپوں میں ان کی حالت دیکھ کر آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ یہ بیچارے سرکاری انتظامیہ کی بے راہ روی کا شکار تو تھے ہی مگر گزشتہ دنوں ان پر یہ قیامت اور ٹوٹی کہ ان کے پھٹے پرانے ٹینٹ موسلا دھار بارش سے ڈھے گئے، گرد و غبار کے طوفان سے اُڑ گئے اور بہت سے پانی میں بہہ گئے جس کی وجہ سے نہ صرف ان کی پریشانیوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا بلکہ وہ اس تھوڑے بہت سامان سے بھی محروم ہو گئے جو غریب الوطنی میں ان کے لیے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتا تھا۔

مٹھی فیس 2 کے اصطبل نما کمروں میں رہنے والے سیکڑوں بے گھروں کی حالت بھی کچھ کم قابلِ رحم نہیں ہے وہاں کل کوارٹروں کی تعداد 492 ہے جن میں سے صرف 300 اب تک تقسیم کیے گئے ہیں یعنی ان مصیبت زدگان کو برائے نام پناہ مل گئی ہے مگر حال یہ ہے کہ ان کمروں کا ایک ایک کونا اس طرح ٹپک رہا ہے کہ گھریلو سازو سامان اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں خراب ہو گئی ہیں۔ مٹھی میں ایک کمرے کے یہ کوارٹر گزشتہ برس جنوری میں بنائے گئے تھے اور کہا یہ جا رہا تھا کہ ایک کمرے کی تعمیر پر 25 ہزار روپیہ خرچ ہوا ہے جبکہ عام اندازہ یہ ہے کہ اس



اصطبل نما کمرے کی تعمیر پر 9 ہزار روپے سے زیادہ صرف نہیں ہوئے ہوں گے۔ تعمیری کمیوں اور خامیوں کے نتیجے میں ان کے انہدام کا خطرہ برابر بڑھتا جا رہا ہے جن لوگوں کو ان کوارٹروں کی تعمیر کا کام سونپا گیا تھا انھوں نے خوب منافع کمایا۔ ایسی ہی حالت ان ٹینٹوں کی بھی ہے جن میں کشمیری پناہ گزیں رہ رہے ہیں۔ وہ ان میں نہ پانی سے محفوظ ہیں، نہ طوفانِ بادہ سے اور نہ سردی سے۔ یہ ٹینٹ اتنے کمزور و بوسیدہ ہیں کہ آندھی اور بارش کے مقابلے میں ٹھہرنے کی صلاحیت بھی ان میں نہیں ہے۔ کوارٹروں کی تعمیر کی طرح ٹینٹوں کی خریداری میں بھی کافی بے قاعدگی برتی گئی ہے۔ بیشتر ٹینٹوں میں سوراخ ہیں جن میں سے پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ دھول اور دھوپ بھی اندر آتی رہتی ہے جس کے نتیجے میں بیماریاں بھی پھیل رہی ہیں اور کئی لوگ لقمۂ اجل بھی بن چکے ہیں۔

لیڈروں کا کردار

یہ تمام حالات تو افسوسناک ہیں ہی مگر ان سے بھی زیادہ باعثِ تکلیف بات یہ ہے کہ کشمیری مہاجرین کے نام نہاد لیڈران کی پریشانیوں اور تکالیف کے ازالہ کے بجائے خود غرضی، سیاسی شعبدہ بازی اور فضول قسم کے سیاسی مطالبات میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ ان مصیبت زدگان کی پریشانیوں اور مسائل کا اندازہ اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود انتہائی بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سرکاری ذمہ داروں کا رویہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور افسوس کا باعث ہے۔ گزشتہ دنوں کی موسلا دھار بارش اور طوفانی ہواؤں نے پناہ گزینوں کے ٹینٹوں کو اکھاڑ پھینکا، سامان برباد کر دیا مگر کوئی بھی ذمہ دار افسر یہ پتہ لگانے کیمپوں میں نہیں آیا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ گزشتہ

دو برسوں سے انصاف کے لیے جاری جدوجہد میں پناہ گزینوں نے لاٹھیاں بھی کھائی ہیں جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی رہے ہیں مگر مایوسی، نامرادی اور بے اعتنائی کے علاوہ ان کے کچھ ہاتھ نہیں آیا ہے۔ ان کی مشکلات، پریشانیوں اور بدحالی میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ سیکڑوں لوگ سانپ کے کاٹنے، لو لگنے، وبائی بیماریوں کا شکار ہونے اور دوسری وجوہات کی بنا پر مرچکے ہیں۔ 15 جولائی کو بھی ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی سانپ کے کاٹنے سے مرگئے۔

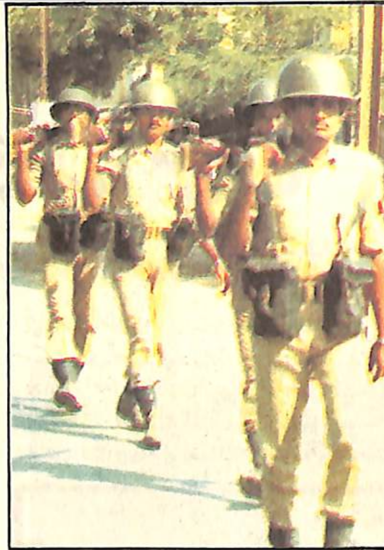
ابھی چند روز قبل راجدھانی دہلی میں کشمیری مصیبت زدگان نے حکومت کی توجہ اپنے مسائل، مصائب اور مشکلات کی طرف مبذول کرانے کی غرض سے جو مظاہرہ کیا اس میں سیکڑوں مرد، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا گیا کہ 1200 کشمیری پنڈت انتہاپسندی کا شکار ہوچکے ہیں اور 400 سے زیادہ کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہوئی۔

واپسی کے امکانات تاریک

مرکزی وزیر داخلہ کے ذریعے وادیٔ کشمیر کا دورہ کیے جانے کے بعد سے جنگجوؤں کی سرگرمیوں میں اضافہ کی وجہ سے کشمیری مہاجرین کے گھروں کو واپس جانے کے امکانات تاریک سے ہوگئے ہیں۔ بے گھروں کا الزام ہے کہ حکومت کشمیر کے بارے میں نہ تو کوئی پالیسی وضع کرپارہی ہے اور نہ ہی کسی پالیسی پر عمل کرپارہی ہے! ایک پروفیسر کا کہنا ہے کہ ہندوستانی ذرائع الابلاغ نے کشمیر کے بارے میں شکوک وشبہات کو دور کرنے کے سلسلے میں مناسب کردار ادا نہیں کیا جبکہ جنگجوؤں کے لیے بہت بڑی پروپیگنڈہ مشینری کام کررہی ہے، پاکستان بھی ان کی پشت پر ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ جان بوجھ کر خاموش رہے اس لیے زیادہ کچھ نہیں کرپائے۔

کشمیری علیحدگی پسندی کا پروپیگنڈہ کرنے والے اخبار "امپیکٹ انٹرنیشنل" میں بالکل سیدھے اور صاف الفاظ میں علیحدگی پسندی کی بات کی جاتی ہے۔ اس اخبار میں ہندوستانی لیڈروں اور ان کی پالیسیوں کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ یوروپ کے اہم اخبارات ورسائل میں جنگجوؤں کی حمایت میں تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں، ہمارے یہاں کیا ہورہا ہے اس کے خلاف؟ جموں میں یہ غلط پروپیگنڈہ کیا گیا کہ کشمیری اقلیت اپنی صلاحیت اور اثرات کی بدولت تعلیمی اداروں، کالجوں اور سرکاری ملازمتوں پر قبضہ کرلے گی جس کے نتیجے میں جموں میں علاقائیت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ علاقائی پارٹیوں نے اسے ہوا دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ ایک بے گھر کشمیری کا کہنا ہے کہ اس قسم کا پروپیگنڈہ جنگجوؤں کی پروپیگنڈہ مشینری ہی کررہی ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے وادی میں ہمارے خلاف اسی طرح کا پروپیگنڈہ ہورہا ہے... غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے جموں کے لوگ ہمارے خلاف ہوگئے۔

مہاجرین کا الزام ہے کہ حکومت ان کے مسائل حل کرنے کی خواہشمند نہیں ہے، وہ جان بوجھ کر ایسا کررہی ہے کیونکہ سیاسی آنکڑوں میں ہمارا ووٹ بنک نہیں ہے۔ ہماری فصلیں، باغات اور زمینیں فروخت کردی گئی



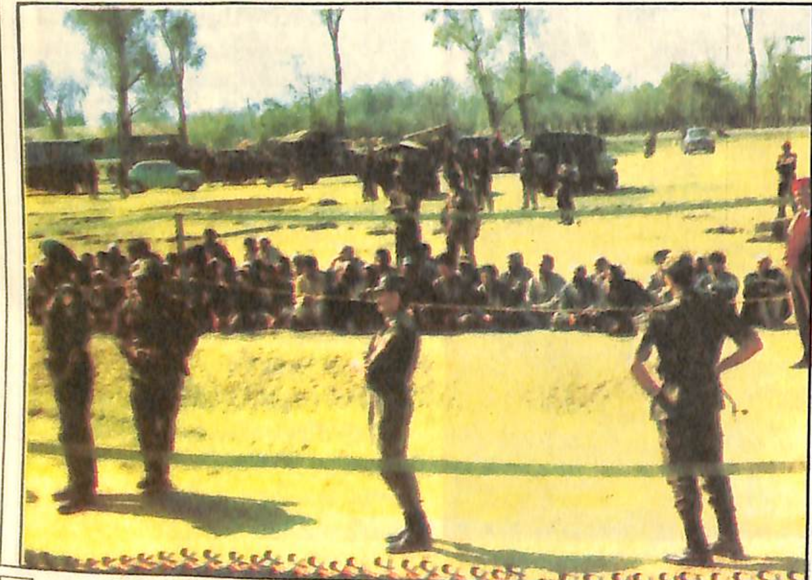
یہ الزام تو لگ ہی رہا تھا کہ وادی سے ہجرت کرکے جموں آنے والوں کی سرکاری امداد کے سلسلے میں کافی گھپلے بازیاں ہورہی ہیں

ہیں۔ جائدادیں تباہ ہوگئیں، مگر ان نقصانات کا معمولی معاوضہ بھی نہیں دیا گیا۔ بہت سے لوگ تو ماہانہ امداد سے بھی محروم ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے مستقبل کے ساتھ بھی مذاق ہورہا ہے۔ شدید گرمی اور بارش میں پھٹے ہوئے ٹینٹوں میں اسکول چل رہے ہیں۔ امتحانات کے نتائج میں تاخیر، داخلہ کی پریشانی اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان پریشانیوں کی وجہ سے نہ صرف لڑکیاں پڑھائی چھوڑ رہی ہیں بلکہ وہ خود کو والدین پر بوجھ سمجھنے لگی ہیں۔

25 اپریل کو بہت سے لوگ جن میں مسلمان بھی شامل ہیں بے گھر ہوکر وادی سے آگئے ہیں تو مسائل اور بھی پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ بے گھروں کو ابھی تک رہائش کی سہولت وغیرہ سے محروم رکھا گیا ہے۔ اپنے گھروں سے اکھڑے ہوئے ان بے قصور لوگوں کا مسئلہ دراصل انسانی مسئلہ ہے جسے انسانی بنیاد اور انسانی نظریے سے ہی حل کیا جانا چاہیے۔

سب ہی جانتے ہیں کہ مصیبت زدگان کے لیے حکومت نے کروڑوں کی رقم منظور کی ہے مگر اس کا بڑا حصہ بدعنوانیوں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے، پیٹیوں سے بچاکر اگر تھوڑی بہت رقم بھی خرچ کردی جاتی تو آج ان کی یہ حالت نہ ہوتی، وہ پھٹے پرانے ٹینٹوں میں شدید دھوپ بارش اور ٹھٹھرا دینے والی سردی کی اذیتیں برداشت کرنے پر مجبور نہ ہوتے۔ پیٹوں کی دوزخ پاٹنے کے لیے نام نہاد ریلیف کمشنر کے دفتر کے چکر نہ کاٹتے رہتے۔

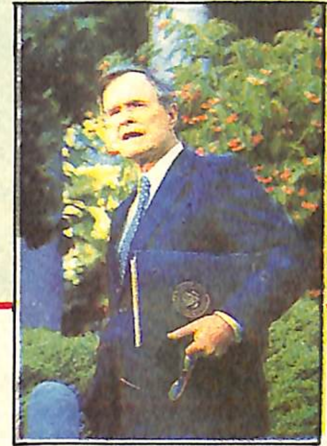
یہ الزام تو لگ ہی رہا تھا کہ وادی سے ہجرت کرکے جموں آنے والوں کی سرکاری امداد کے سلسلے میں کافی گھپلے بازیاں ہورہی ہیں مگر اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ جموں وکشمیر بنک، ریلیف ڈپارٹمنٹ اور باہر کے کچھ لوگوں نے مل کر کروڑوں روپے ہضم کرلیے ہیں۔ یہ گھپلا اس رقم میں ہوا ہے جو مصیبت زدوں کی آبادکاری اور فلاح وبہبود کے لیے منظور کی گئی تھی انسانیت دشمنی کے اس معاملے کی چھان بین کا کام کرائم برانچ کے سپرد کردیا گیا ہے۔ تحقیقات بھی ہورہی ہے، پوچھ گچھ کے لیے کئی لوگوں کو حراست میں لیا گیا ہے۔ جرم بے حد سنگین ہے۔ اس قدر لاچار و بے یار و مددگار لوگوں کی مصیبتوں کا سودا کرکے کروڑوں کا گھپلا انتہائی شرمناک بھی ہے اور سرکاری اداروں کے دامن پر بدنما داغوں میں اضافہ بھی۔



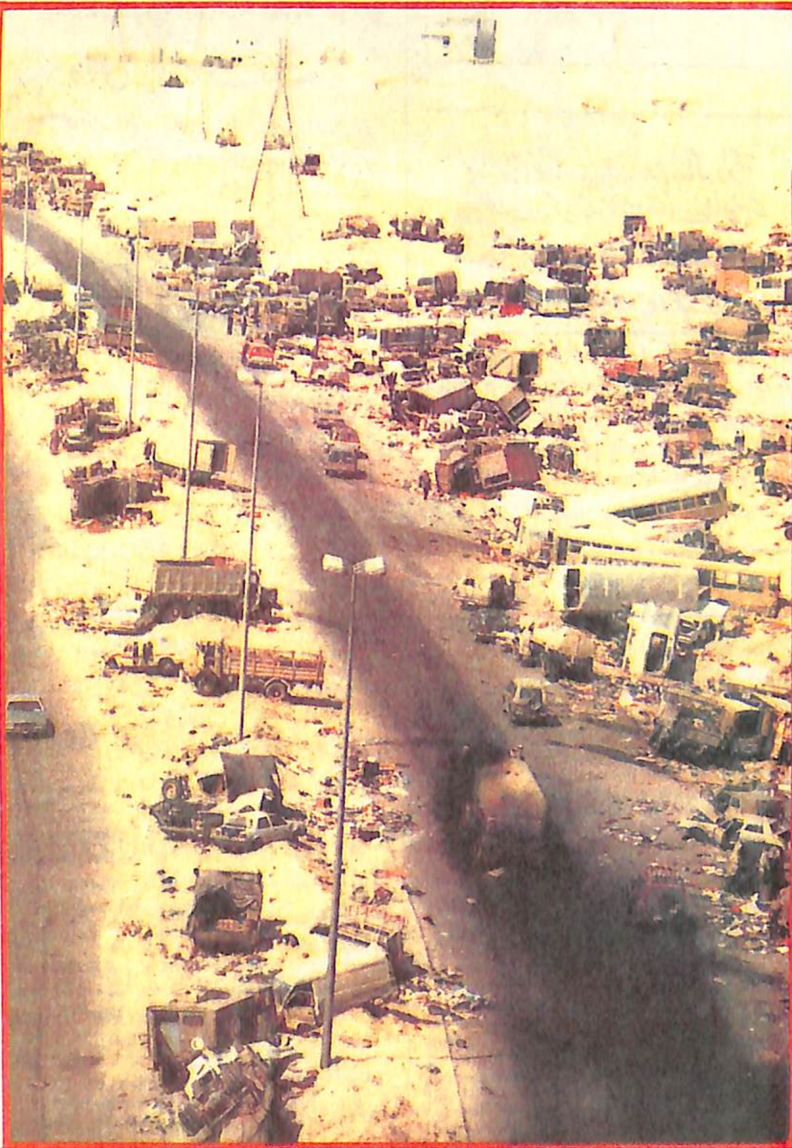
مغربی ایشیا

امریکی جال میں

اسد رضا



مغربی ایشیا امریکہ کے بچھائے ہوئے جال میں الجھتا جا رہا ہے۔ بظاہر صدر بش اگست کے اواخر میں عرب اسرائیل امن مذاکرات کو کامیاب بنانے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ اور ان کی انتظامیہ میں شامل رفقار کار اس وقت جو بھی حکمتِ عملی اختیار کر رہے ہیں اُس کے دو مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد امریکہ میں صدارتی انتخاب کے دوران موجودہ صدر جارج بش کی کامیابی کو یقینی بنانا ہے۔ گذشتہ ماہ امریکی وزیر خارجہ جیمس بیکر کا دورۂ مغربی ایشیا، عراق کو جنگ کی دھمکی اور صدام مخالف امریکی اقدام کا مقصد امریکی صدارت کے لئے ڈیموکریٹک پارٹی کے اُمیدوار ایل کلینٹن کے جارج بش کے خلاف انتخابی پروپیگنڈہ کو ناکام بنانا ہے۔ امریکی حکمت عملی کا دوسرا مقصد مستقبل قریب میں ایشیا میں امریکی مفادات کی تکمیل و حفاظت ہے۔ دراصل امریکہ، ایشیا میں اپنا سب سے بڑا حریف چین یا ہندوستان کو نہیں بلکہ جاپان کو سمجھتا ہے۔ جاپانی مصنوعات نے بین الاقوامی منڈی میں امریکی مصنوعات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ امریکی سرمایہ دار اور صنعت کار اس صورت حال سے پریشان ہیں یوں بھی مغربی اور امریکی حکمرانوں کو دوسری عالمی جنگ کے دوران جاپان کی فوجی اور معاشی قوت کا تلخ تجربہ ہے۔ آج کل جاپان نہ صرف دنیا کی ایک بڑی معاشی قوت بن گیا ہے بلکہ اس نے فوجی میدان میں بھی قدم بڑھانے شروع کر دیئے ہیں۔ صدر بش اور ان کے مشیروں کے مطابق جاپان کے معاشی گھوڑے کو قابو میں کرنے کے لئے مغربی ایشیا پر امریکی تسلط میں مزید اضافہ ضروری ہے۔ خلیجی جنگ کے دوران امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے عربوں اور تیسری دنیا کے ملکوں کو اپنی عسکری قوت دکھلا کر سراسیمہ کر دیا۔ بعد ازاں یہ سوچا گیا کہ عراق، کویت اور سعودی عرب سمیت بیشتر عرب ممالک اب اتنے کمزور ہو چکے ہیں کہ آئندہ دس برسوں میں وہ امریکہ کا مقابلہ کرنے کی بات خواب میں بھی نہیں سوچیں گے۔ اب مغربی ایشیا میں صرف دو طاقتور ملک رہ گئے ایک اسرائیل اور دوسرا ایران۔ اگرچہ اسرائیل امریکی اور مغربی سامراجیوں ہی کا پروردہ ہے جسے عرب ملکوں پر کمیونزم کے اثرات کو روکنے اور عربوں کو خوفزدہ کر کے ان کی تیل کی دولت پر بالواسطہ طور پر قبضہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا لیکن گذشتہ برس سوویت یونین میں کمیونزم کے خاتمہ اور اس عظیم ملک کے بکھراؤ کے بعد امریکہ کی نظروں میں اسرائیل کی پہلی جیسی اہمیت نہیں رہی اور صدر بش نے عربوں میں اپنی ساکھ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے گذشتہ



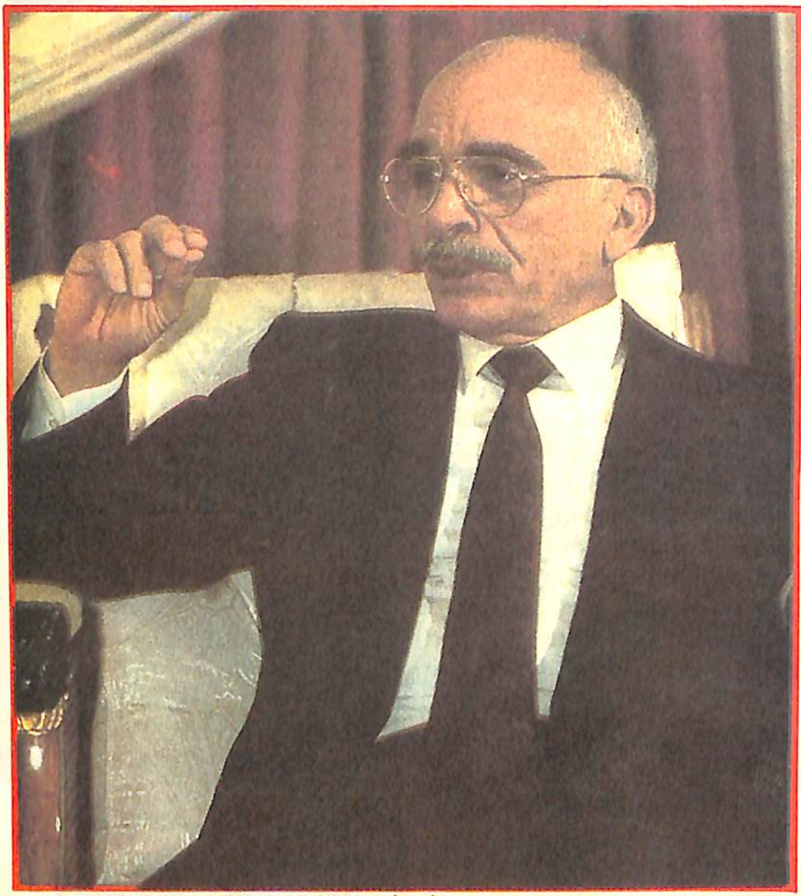
عراق کی تباہی کا ایک منظر

برس اکتوبر میں میڈرڈ میں عرب، اسرائیل امن مذاکرات شروع کرائے۔ لیکن اسرائیل میں قدامت پرست لیکڈ پارٹی کی حکومت نے ان مذاکرات کو ناکام بنادیا۔

اسرائیل کو سبق

امریکہ نے حکومتِ اسرائیل کو سبق سکھانے کے لئے دس ارب ڈالر کی امداد پر پابندی لگا دی اور یہ شرط رکھی کہ اسرائیل کو یہ امداد صرف اُسی صورت میں ملے گی جب شمیر حکومت مقبوضہ عرب علاقوں میں یہودی بستیوں کی آبادکاری کا عمل روک دے گی۔

یس اور وزیر خارجہ جیمس بیکر نے دی اور رابن کے کرسئی وزارت عظمیٰ سنبھالتے ہی بیکر نے اسرائیل کا دورہ کیا۔ ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ اسحٰق رابن نے امریکہ کے تمام مطالبات کو تو نہیں لیکن بیشتر مطالبات کو تسلیم کرلیا ہے۔ مثلاً صدر بش مقبوضہ عرب علاقوں میں یہودی بستیوں کی آبادکاری کو رکوانا چاہتے تھے، رابن نے سب سے پہلے آبادکاری کو ہی روکنے کا اعلان کیا۔ یہی نہیں اسرائیلی وزیراعظم مقبوضہ عرب علاقوں میں سے چند کو واپس کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ "اسرائیل کو اپنے


اردن کے شاہ حسین

فی الواقعی صدر بش اور رابن فلسطینیوں کو مکمل آزادی اور خود مختاری دیئے جانے کے حق میں نہیں ہیں۔ امریکی منصوبے کے مطابق ایسے مقبوضہ عرب علاقے عربوں کو واپس کردیئے جائیں گے جن کی اسرائیل کے لیے فوجی اہمیت نہیں ہے۔



دراصل صدر بش کو سابق وزیراعظم اسحٰق شمیر کے اس خفیہ منصوبے کا بھی علم ہوگیا تھا جس کے تحت وہ عرب اسرائیل امن مذاکرات کو اس لئے دس برسوں تک ٹالنا چاہتے تھے تاکہ مقبوضہ عرب علاقوں میں یہودی بستیوں کی آبادکاری کا کام مکمل ہوجائے اور یہ علاقے ہمیشہ کے لئے عظیم تر اسرائیل کا حصہ بن جائیں۔ شمیر نے امریکہ کا حکم نہیں مانا لہٰذا امریکی حکمرانوں نے گذشتہ دنوں اسرائیل میں ہوئے انتخابات کے دوران درپردہ لیبر پارٹی کی حمایت کی اور لیبر رہنما اسحٰق رابن اسرائیل کے نئے وزیراعظم بن گئے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ رابن کو سب سے پہلے مبارکباد امریکی صدر جارج

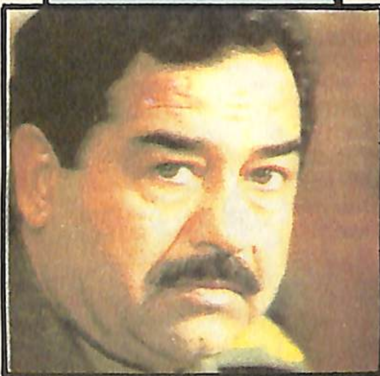
علاقوں کو انچوں میں نہیں کلومیٹروں میں چھوڑنا چاہیے۔ علاوہ ازیں انھوں نے عرب ملکوں کی راجدھانیوں کے دوروں کی تجویز رکھی ہے اور وہ مصر کے صدر حسنی مبارک سے قاہرہ میں ملاقات بھی کر چکے ہیں۔

امریکی منصوبہ

امریکہ کی مرضی سے ہی آئندہ عرب، اسرائیل مذاکرات کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ حالانکہ وزیراعظم رابن مذاکرات کے عمل کو تیز رفتار بنانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ وہ فلسطینیوں کو نو مہینے کے اندر خود مختاری دینا چاہتے ہیں، لیکن فی الواقعی صدر بش اور رابن فلسطینیوں کو مکمل آزادی اور خود مختاری دیئے جانے کے حق میں نہیں ہیں۔ امریکی منصوبے کے مطابق ایسے مقبوضہ عرب علاقے عربوں کو واپس کردیئے جائیں گے جن کی اسرائیل کے لئے فوجی اہمیت نہیں ہے مثلاً اسرائیل دریائے اردن



اسحاق شمیر



امریکہ اور اسرائیل دونوں کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی فلسطین میں لولی لنگڑی لیکن بظاہر خود مختار حکومت قائم کر کے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی جائے۔

کے مغربی علاقوں اور غزہ پٹی کو واپس کر سکتا ہے کیونکہ یہ علاقے فوجی لحاظ سے اہم نہیں ہیں تاہم اسرائیل گولان پہاڑیوں سے متصل علاقوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھے گا کیونکہ اسرائیل کی فوجی حکمت عملی میں انہیں نمایاں مقام حاصل ہے۔

لولی لنگڑی حکومت

امریکہ اور اسرائیل دونوں کی حکمت عملی یہ ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی فلسطین میں لولی لنگڑی لیکن بظاہر خود مختار حکومت قائم کر کے دنیا کے انصاف پسندوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جائے اور دنیا کے مسلمانوں بالخصوص عربوں میں امریکہ کی گرتی ہوئی ساکھ کو بچایا جائے۔ امریکی منصوبے کے مطابق فلسطینی ریاست اسرائیل کی زیر نگرانی ہوگی اور اس کی خارجہ پالیسی اور دفاعی پالیسی کی باگ ڈور اسرائیلی حکمرانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس مبینہ خود مختار حکومت کی مدت پانچ سال ہوگی اور اس دوران اسرائیل اور فلسطینی، اردنی کابینہ مقبوضہ علاقہ کے حتمی نظام کے لئے غور وخوض کریں گے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا کے انصاف پسند اور جمہوریت پرست باشندے اس صورت حال کو تسلیم کر لیں گے اور کیا عرب عوام (امریکی پٹھو عرب **افراد** نہیں) اور آزادیٔ وطن کیلئے جہد کنال فلسطینی جانباز اپنے لئے ایک اپاہج حکومت قبول کریں گے؟ ہرگز نہیں! فلسطینی رہنما یاسر عرفات کے مطابق فلسطینی عوام اور مجاہدین آزاد و خود مختار ریاست کا اپنا مطالبہ کسی صورت میں نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن وہ دفاع اور خارجہ پالیسی کے سلسلہ میں اردن کے ساتھ تعاون و اشتراک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ شام کے صدر حافظ الاسد بھی اسرائیل کی جزوی طور پر غلام فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ وہ آزاد فلسطینی ریاست کی حمایت کرتے ہیں اور گولان پہاڑیوں کو فوجی سرگرمیوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ اردن کے شاہ حسین عرب خود مختاری کے تحت دریائے اردن کے مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم (دارالاسلام) کا مطالبہ کرتے ہیں اور آزاد فلسطینی ریاست کا قیام پُرامن ماحول میں بات چیت کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ ایران کے صدر ہاشمی رفسنجانی بھی فلسطین میں لنگڑی لولی اور نام نہاد خود مختار حکومت کے حق میں نہیں ہیں اور پوری طرح آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن کویت پر عراق کے حملے کے بعد سعودی عرب، کویت اور امریکہ نواز دیگر عرب ممالک مذکورہ بالا امریکی، اسرائیلی منصوبے کی مخالفت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سوویت یونین اور تیسری دنیا کے بیشتر ممالک ماضی میں آزاد فلسطینی ریاست کی حمایت کرتے رہے ہیں لیکن سوویت یونین کے خاتمہ اور امریکی داداگیری میں شدت پیدا ہونے کے بعد بلاشبہ فلسطینیوں کی بین الاقوامی حمایت میں پہلی جیسی گرمجوشی نہیں رہی اور بعض عرب رہنماؤں کے سخت موقف میں لچک پیدا ہوئی ہے۔ روس، ہندوستان اور چین جیسے فلسطینیوں کے روایتی طرفداروں نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لئے ہیں۔

عراق کو جنگ کی دھمکیاں

امریکہ اور مغربی ممالک کی جانب سے عراق کو جنگ کی دھمکیاں محض صدر صدام حسین کو خوفزدہ کرنے کے لئے ہی نہیں ہیں بلکہ فلسطینیوں سمیت دیگر سامراج مخالف عرب قوتوں کو متنبہ کرنے کے لئے بھی ہیں۔

درحقیقت امریکہ عراق کو اتنا کمزور تو کرنا چاہتا ہے کہ وہ مستقبل میں اُسے یا اس کے حلیف عرب ممالک کو آنکھیں نہ دکھا سکے لیکن اس کے ساتھ ہی امریکی حکمراں یہ نہیں چاہتے کہ کُرد اور شیعہ باغی عراق کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور ایران جو صدر بش کے مطابق اسلامی بنیاد پرستی کی علامت ہے، علاقہ کی بڑی طاقت بن جائے اور سابق سوویت یونین سے علیحدہ ہوئی مسلم ریاستوں کے اشتراک و تعاون سے یہ کوئی نیا اسلامی بلاک بنانے میں کامیاب ہو جائے۔

امریکہ کی مغربی ایشیا سے متعلق پالیسی کا محور نہ تو کویت اور سعودی عرب سے عشق ہے اور نہ ہی عراق یا ایران سے نفرت بلکہ اُس کے اپنے سیاسی، معاشی، جغرافیائی اور عسکری مفادات ہیں جن کی تکمیل و تحفظ کے لئے وہ کبھی بھی کسی ملک پر حملہ کر کے اس کے فوجی و معاشی قوت کو تباہ کر سکتا ہے اور کسی بھی ملک پر اپنی نوازشات کی بارش کر سکتا ہے۔ صدر صدام حسین کو دھمکی اور کویت و سعودی عرب کے لئے فوجی امداد اس امریکی حکمتِ عملی کی واضح مثال ہے۔ امریکہ اپنی اس حکمتِ عملی پر صرف مغربی ایشیا ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں عمل کر رہا ہے اور افریقہ، ایشیا و لاطینی امریکہ کے ممالک اس کا خاص طور پر نشانہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ تیسری دنیا بالخصوص مغربی ایشیا آخر امریکہ کی اس خطرناک اور خود غرضانہ حکمتِ عملی کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

امریکہ کی اس **بڑھتی چودھراہٹ** اور بین الاقوامی برتری کو ختم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں اتحاد قائم کیا جائے، آپسی مسائل کو طاقت کی بجائے بات چیت کے ذریعے سلجھایا جائے اور ثقافتی و معاشی میدانوں میں باہمی اشتراک و تعاون کو فروغ دیا جائے۔ اس سلسلے میں کیوبا کے وزیر خارجہ ریکارڈو کلارکن کی اس رائے پر غور کیا جانا چاہیے کہ جکارتہ میں یکم ستمبر تا ۶ ستمبر کو ہونے والی ناوابستہ تحریک کی سربراہ کانفرنس میں امریکی داداگیری کے خلاف ناوابستہ تحریک ایک عام مورچہ قائم کرے۔ مغربی ایشیا کو امریکی جال سے نکالنے کے لئے مذکورہ بالا تجاویز پر تو عمل درآمد کیا ہی جانا چاہیے علاوہ ازیں کویت، سعودی عرب، شام، مصر، عراق، اردن، ایران اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کے رہنماؤں کو ماضی کی تلخیاں فراموش کر کے مغربی اور امریکی ریشہ دوانیوں کا متحد ہو کر مقابلہ کرنا ہوگا۔



پنجاب کے بعد ترائی میں

خون کی ہولی

ماجد رحمٰن

دہشت گردی اور علیحدگی پسندی کی لعنت نے ملکی سلامتی اور قومی اتحاد پر جو سُرخ سوالیہ نشان لگایا تھا وہ روز بروز گہرا ہوتا جارہا ہے انتہاپسندی کا جو بھوت ناگالینڈ، میزورم، منی پور، مغربی بنگال اور آسام سے رقص کرتا ہوا کشمیر اور پنجاب پہنچا تھا وہ اترپردیش کے ترائی علاقے کی جانب بڑھ گیا ہے اس لیے انتہاپسندی کی شکار ملک کی دوسری بدقسمت ریاستوں کی طرح وہاں بھی بے گناہ انسانوں کی ہلاکتوں لوٹ، مار، قتل اور غارتگری کا سلسلہ گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔

دہشت گردی کا جو بھیانک سایہ 1984 میں ترائی پہنچا تھا اس کی سیاہی روز بروز گہری ہوتی جارہی ہے سرکاری اعداد و شمار کے بموجب گزشتہ آٹھ برسوں میں یہاں کم از کم 300 لوگ مارے جا چکے ہیں جن میں انتہاپسند اور پولیس ملازمین بھی شامل ہیں۔ انتہاپسندی کی ان شرمناک وارداتوں میں سب سے زیادہ ہولناک تھا۔ 16 اکتوبر 1991 کو نینی تال ضلع کے رودر پور علاقہ کی رام لیلا میں طاقتور بم دھماکہ جس نے کم از کم 65 لوگوں کی جانیں لیں اور 150 سے زیادہ کو زخمی کیا اور دوسرا ضلع پیلی بھیت کے گھنے جنگلوں میں دو دیہاتوں کے ان 29 لوگوں جن میں چھوٹے بچے اور عورتیں بھی شامل تھے کا بے رحمانہ قتل۔

شروع شروع میں یہ سمجھا جارہا تھا کہ پنجاب میں حفاظتی فورسیز کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے گھبرا کر جو چند انتہا پسند ترائی علاقے میں آ چھپے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرکے یوپی انتظامیہ کے لیے مسئلہ پیدا کرنے اور حکومت کی توجہ پنجاب کے واقعات کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کررہے ہیں مگر وقت جیسے جیسے گزرتا گیا یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ دہشت گردی کی جڑیں اترپردیش میں روز بروز گہری ہوتی جارہی ہیں۔ اب 3 اگست کو 29 بے گناہ انسانوں کے بے رحمانہ قتل سے یہ بات قطعی واضح ہوگئی ہے کہ انتہاپسندوں کے ارادے کیا ہیں، اب انھوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ترائی کے جنگلوں میں ان کی حکومت چلتی ہے۔ گزشتہ دس ماہ کی دہشت گردی کی وارداتوں میں 133 لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور 175 افراد زخمی کیے گئے۔ ترائی میں انتہاپسندوں کی تعداد کتنی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 3 اگست

اس کے باوجود کہ پولیس کی زبردست کمک جنگلوں میں انتہاپسندوں کی چھان بین میں لگی ہوئی ہے اُسے اس وجہ سے کوئی کامیابی نہیں مل رہی ہے کہ لوگ بے حد خوفزدہ ہیں۔

کے قتلِ عام میں اسلحہ کا استعمال نہیں کیا گیا بلکہ تمام لوگوں کا گلا گھونٹ کر سکریہ ندی میں پھینک دیا گیا۔ تمام مرنے والوں کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس افسوسناک واردات سے پہلے انتہاپسندوں نے جنگل میں لکڑیاں چننے جانے والوں کو زدوکوب بھی کیا تھا اور یہ تنبیہہ بھی کی تھی کہ وہ جنگل میں نہ آیا کریں۔

اس کے باوجود کہ پولیس کی زبردست کمک جنگلوں میں انتہاپسندوں کی چھان بین میں لگی ہوئی ہے اُسے اس وجہ سے کوئی کامیابی نہیں مل رہی ہے کہ لوگ بے حد خوفزدہ ہیں وہ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی کہنے کو موت اور تباہی کو دعوت دینا تصور کرتے ہیں صرف عام لوگ ہی نہیں اکثر پولیس ملازمین بھی اس قدر ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں کہ وردی پہن کر نکلتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں۔ بارڈر سیکیورٹی فورس، مسلح پولیس اور مشین گنوں

سے لیس جیپوں کے گشت کے باوجود علاقے کے لوگ خوف کے سائے میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔

1984 میں مسز اندرا گاندھی کے قتل کے ردِ عمل کے طور پر ملک کے مختلف علاقوں میں ہونے والے سکھ مخالف فسادات کے بعد جب ترائی میں انتہا پسندی کا نام پہلی بار سننے کو ملا تھا تو اس وقت وہاں بہ مشکل دو ایک ہی چھوٹے انتہا پسند گروپ امن دشمنانہ کارروائیوں کی تیاریوں میں مصروف تھے مگر اس وقت حکومت گہری نیند سوتی رہی، نہ وہ خود جاگی نہ کسی نے اسے جگانے کی خاص ضرورت محسوس کی نتیجہ یہ ہوا کہ انتہا پسند گروپ مضبوط ہوتے گئے، ان کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں، انھیں اپنے عزائم میں کامیابی نصیب ہوتی گئی جس نے دوسری ریاستوں میں موجود دہشت گردوں کی ہمت افزائی بھی کی اور انھیں ترائی میں سمٹنے کے مواقع بھی عطا کیے اور اب ـــــــ سرکاری انتظامیہ بھی اس بات سے صاف انکار نہیں کر سکتی کہ انتہا پسندی کی وبا اتر پردیش میں پھیل چکی ہے، دہشت گرد وہاں اپنے پیر کافی مضبوط کر چکے ہیں۔

1987 سے 1989 تک کے پولیس اعداد و شمار سے ایسا لگتا تھا کہ انتہا پسندوں کو پوری طرح سے قابو میں کر لیا گیا ہے، یہ دعویٰ اس بنیاد پر کیا جا رہا تھا کہ اس دوران کل ملا کر آٹھ انتہا پسند پولیس کے ہاتھوں مارے گئے تھے مذکورہ برسوں میں پولیس اور انتہا پسندوں کی 300 سے زیادہ مڈبھیڑیں ہوئیں۔ پولیس کے بموجب اس نے دو گروہوں کا صفایا کر دیا لیکن ذرائع کے بموجب اس وقت ترائی میں انتہا پسندوں کے چھ مضبوط گروپ کام کر رہے ہیں۔ بھنڈراں والے ٹائیگرس فورس، خالصتان کمانڈو فورس، خالصتان لبریشن آرمی، بھنڈراں والے سیفرن ٹائیگرس آف خالصتان، خالصتان لبریشن فورس اور ببر خالصہ۔ نامی پانچ گروپوں میں 200 تا 500 سے زیادہ انتہا پسند ہیں مگر پھر بھی انھوں نے انتظامیہ کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔

آہستہ آہستہ انھوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں۔ 1991 میں انتہا پسندوں نے ترائی میں ایسے پیر پھیلائے کہ 12 اضلاع کو انتہا پسندی سے متاثر قرار دے دیا گیا۔ ان ہی دنوں "ٹاسک فورس" کے لیے پی۔ اے۔ سی کی آٹھ کمپنیوں کو تربیت دی گئی۔ فورس کے لیے 2000 کمانڈو منتخب کیے گئے اور انھیں جدید اسلحہ جن میں اے۔ کے 47 رائفلوں کے علاوہ ایس۔ ایل۔ آر بھی شامل تھے سے لیس کیا گیا۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ ٹاسک فورس کے جوانوں کی تربیت کے بعد دہشت گردی کا صفایا کر دیا جائے گا مگر نہ صرف یہ اعلان دیوانہ کی بڑ ثابت ہوا بلکہ حالات اور زیادہ خراب ہو گئے۔ اکتوبر کو رودر پور کی رام لیلا میں بم دھماکہ اور 3 اگست کو 29 بے گناہ انسانوں کی لرزہ خیز ہلاکتوں نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ سرکاری دعوؤں میں کتنی صداقت ہے۔

اتر پردیش کے جو اضلاع انتہا پسندی کی گرفت میں ہیں وہاں کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر حکومت اور انتظامیہ نے پنجاب سے اتر پردیش پہنچنے والے دہشت گردی کے بھوت پر قابو پا کر اسے ختم کرنے کے لیے عوام کو کھلونے دے کر بہلانے کی کوشش نہ کی ہوتی تو صورتحال وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔

1984 میں اتر پردیش میں انتہا پسندی کے صرف چھ واقعات رونما ہوئے تھے جو اگلے دو برسوں میں بڑھ کر 21 ہو گئے۔ اسی دوران ایک سابق پولیس ملازم سیوا سنگھ پنجاب سے اتر پردیش منتقل ہو گیا اور ٹہری گڑھوال ضلع کے کالا گڑھ شہر کے نزدیک انتہا پسندی کی تربیت کا مرکز قائم کر لیا۔ خود کو پولیس سے بچائے رکھنے کے لیے اس نے اپنا نام بدل کر گوربچن سنگھ رکھ لیا بعد میں سیوا سنگھ پنجاب واپس چلا گیا جہاں پولیس سے ایک مقابلے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

1989 تک انتہا پسندی کے کسی بڑے واقعہ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ لیکن گزشتہ برس لکھنؤ کے چار باغ ریلوے اسٹیشن پر طاقتور بم دھماکہ کر کے دہشت گردوں نے حکومت





اور سرکاری انتظامیہ کو اپنے مستقبل کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ اس حادثے میں 9 بے گناہ لوگ مارے گئے اور کتنے دوسرے زخمی ہوئے۔ اس کے بعد ہلدوانی اور کاشی پور کے دو سینما ہالوں میں دھماکے کیے گئے اور 19 ستمبر کو دن کی روشنی میں ایک بم دھماکہ کر کے دو افراد کی جان لے لی گئی۔ اس کے بعد 15 اکتوبر کو گورچرن لال شرما کے فارم پر ایک موٹر گاڑی پر حملہ کر کے دو لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کے صرف دو روز

یوپی سکھ پرتیندھی سبھا کے نائب صدر دلجیت سنگھ مان کا کہنا ہے کہ اتر پردیش میں انتہا پسندی کی وجہ پنجاب کا مسئلہ ہے جب تک اسے حل نہیں کیا جاتا ریاست اور خاص طور پر ترائی میں یہ وبا جاری رہے گی۔

بعد رودر پور کی رام لیلا میں دو بم دھماکے ہوئے جن میں 65 افراد ہلاک اور 150 سے زیادہ زخمی ہوئے۔

یو۔ پی سکھ پرتیندھی سبھا کے نائب صدر دلجیت سنگھ مان کا کہنا ہے کہ اتر پردیش میں انتہا پسندی کی وجہ پنجاب کا مسئلہ ہے جب تک اسے حل نہیں کیا جاتا ریاست اور خاص طور پر ترائی میں یہ وبا جاری رہے گی مگر مرکزی و ریاستی سرکاریں ابھی تک مسئلے کے حل کے لیے سنجیدہ نظر

نہیں آرہی ہیں، انتہاپسندی کا زہر یو۔ پی کے مختلف علاقوں میں پھیلتا جارہا ہے۔ پولیس اور انتظامیہ اس قدر پست ہمت ہوچکی ہے کہ اب لوگوں کو اس کی طرف سے یہ شکایت پیدا ہوگئی ہے کہ واقعات کی چھان بین نہیں کی جاتی، عدالتوں سے جاری سمن منقسم کرنے کے لیے جانے سے ڈرا جاتا ہے۔ محکمۂ جنگلات کے کئی ملازمین کی ہلاکت کے بعد اس محکمہ کے لوگ بھی انتہاپسندوں سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے نہ صرف جنگلوں میں جانے سے ڈرتے ہیں بلکہ اپنی زبانیں بھی بند کیے ہوئے ہیں اور پولیس کی مدد کرنے سے بھی گریزاں ہیں۔

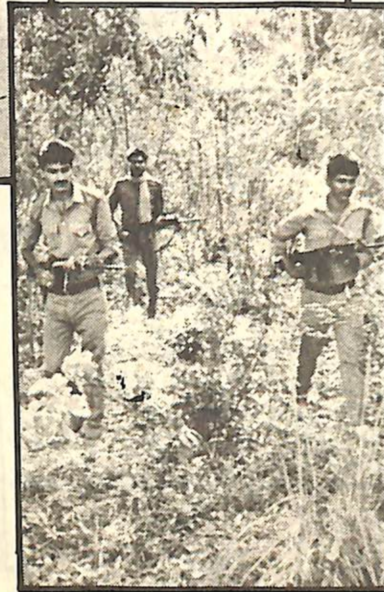
انتہائی افسوس اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے اکثر سیاستداں اور حکمراں دونوں ہی اس آئے دن کے خون خرابے پر بھی سیاسی مفادات کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ریاستی حکومت مرکز پر مطلوبہ امداد نہ دینے کا الزام لگانے پر اکتفا کو کافی سمجھ رہی ہے اور مرکز آج بھی اسے کوئی اہم سیاسی مسئلہ ماننے کے لیے تیار نظر نہیں آتا۔ یہ صحیح ہے کہ 1989 سے اب تک مرکز میں تین سرکاریں رہی ہیں اور 1989 سے پہلے کی راجیو حکومت کے علاوہ تمام سرکاریں کمزور تھیں اس لیے کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھا سکنے کا بہانہ کیا جارہا ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب کون دے کہ پولیس اور انتظامیہ نے کیا کارنامہ انجام دیا۔ ان کے وہ کون سے ایسے کارنامے ہیں جن کے لیے انھیں اعزازات عطا کیے جاتے رہے؟ کیا اس طرح کی بہانے بازیوں، الزام تراشیوں، خود غرضیوں، سیاسی شعبدہ بازیوں اور فرائض سے کوتاہیوں سے کسی ملک کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے، وہ آگے بڑھ سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا تو ہماری آزادی، اتحاد، سلامتی اور امن خطرے میں پڑ جائیں گے۔

بات صرف حکومتوں، سیاستدانوں، پولیس اور انتظامیہ پر ہی ختم نہیں ہوتی، ہماری سراغرساں ایجنسیاں حالات سے نمٹنے کے لیے کیا کررہی ہیں، یہ سوال بھی کافی ضروری اور اہم ہے۔ یہ سوچ کر کوئی بھی حیران ہوسکتا ہے کہ جن خفیہ تنظیموں کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کس علاقے میں کتنے انتہاپسند داخل ہوتے ہیں، کس قسم کے اسلحہ سے لیس ہیں، کیا کارروائی کرنے والے ہیں وہ یہ معلوم نہیں کر پاتیں کہ انتہاپسند کہاں گئے، کس کے یہاں یا کس جگہ

سال	پولیس ملازمین	انتہاپسند	مخبر	عام شہری	کل تعداد
1984	—	2	—	1	3
1985	—	—	—	21	21
1986	—	—	—	3	3
1987	4	1	2		7
1988	3	1	2	5	11
1989	4	4	3	3	14
1990	6	11	17	30	64
1991	21	2-	21	104	166
1992	—	—	—	30	30
	38	39	45	197	319

کل جس طرح پنجاب اور کشمیر کے واقعات کو معمولی سمجھا جارہا تھا اگر اسی طرح ترائی میں انتہاپسندوں کی سرگرمیوں کو سمجھا گیا تو آنے والا کل انتہائی بھیانک ہوگا۔





ٹھہرے۔

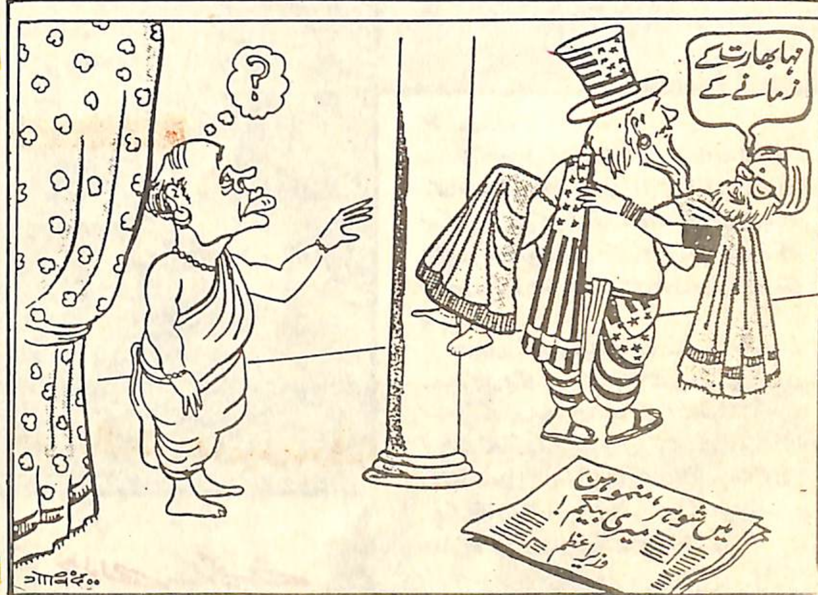
کل جس طرح پنجاب اور کشمیر کے واقعات کو معمولی سمجھا جارہا تھا اگر اسی طرح ترائی میں انتہاپسندوں کی سرگرمیوں کو بھی سمجھا گیا تو آنے والا کل انتہائی بھیانک ہوگا۔ دہشت گردی کی وبا ملک بھر میں پھیل جائے گی۔ مرکزی و ریاستی سرکاروں کو اس طرف فوری توجہ دینی چاہیے۔

چڑیوں کے کھیت چگ جانے کے بعد آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو مسئلہ جتنا سنگین ہو اُسے اتنی ہی سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے، نجی اور سیاسی خود غرضیوں کو بالائے طاق رکھ کر اسے حل کرنے کے ٹھوس اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ ابھی اتنا نہیں بگڑا ہے، ابھی وقت ہے کہ حالات پر قابو پالیا جائے۔ ملک کو مزید نقصان اور قوم کو مزید خون خرابے سے بچالیا جائے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اندرونی خلفشار، سرحدی علاقوں میں علیحدگی پسندی کا رجحان فرقہ وارانہ یا طبقاتی تعصب قومی اتحاد اور ملکی سلامتی کے لیے بیرونی خطرات سے کہیں بڑا خطرہ ہیں۔ ان مسائل کی طرف سے بے توجہی کی وجہ سے ملک اور قوم کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی ذمہ داری بہرحال ہماری مرکزی و ریاستی سرکاروں اور انتظامیہ پر ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ حکمراں سیاسی اغراض کو پس پشت ڈال کر درپیش مسائل کا حل تلاش کریں، سیاستداں ملکی آزادی کو سیاسی خود غرضی پر ترجیح دیں اور پولیس و انتظامیہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے جو اس پر عائد ہوتی ہیں۔

چڑیوں کے کھیت چگ جانے کے بعد آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو مسئلہ جتنا سنگین ہو اُسے اتنی ہی سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے، نجی اور سیاسی خود غرضیوں کو بالائے طاق رکھ کر اسے حل کرنے کیلئے ٹھوس اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

تقاضائے وقت اور تحفّظِ آزادی



آج جب ہم آزادی کی 45 ویں سالگرہ منا رہے ہیں تو جشنِ آزادی کی مسرتوں کے ساتھ ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم کتنے آزاد ہیں۔ کہیں ہماری یہ آزادی محض فریبِ نظر تو نہیں؟ جس طرح کسی نابینا کا نام نین سکھ رکھ دینے سے اُسے بینائی نہیں مل جاتی اور کسی مفلس کا نام کروڑی مل رکھ دینے سے اس کی غربت دُور نہیں ہو جاتی، اسی طرح کیا خود کو آزاد کہہ دینے سے ہم آزاد کہلانے کے حقدار ہوگئے ہیں۔ ہم آزاد ہیں لیکن ہماری سرکاریں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے غیر ملکی تعاون کی مرہونِ منت ہیں۔ ہمارے ملک کا بجٹ بنتا ہے تو ہم سے پہلے اس کی جانکاری دوسرے ممالک کو ہوتی ہے سکّے ہمارے ہوتے ہیں، فیصلے غیر ملکی ہوتے ہیں۔ کیا خریدنا ہے؟ کیا بیچنا ہے؟ اور کس کو بیچنا ہے؟ یہ سب کچھ آج ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ مگر ہم آزاد ہیں۔ سر کے بالوں سے لے کر پیر کے جوتوں تک کے لیے ہم بیرونی ممالک کے محتاج ہیں۔ اگر گنجے ہیں تو وِگ غیر ملکی خریدنا چاہتے ہیں۔ اور اگر سر پر بال ہیں تو اس کی حفاظت کے لیے شیمپو سے لے کر ہیر کریم تک غیر ملکی استعمال کرنا ہمارے وقار (STATUS SYMBOL) کی پہچان ہے۔ جسم پر کپڑا ہندوستان کا بنا ہو سکتا ہے لیکن فیشن کے لیے ہماری نگاہیں مغربی ممالک کی طرف لگی رہتی ہیں۔ جسم ہمارا ہے لیکن اسے کتنا ڈھکنا ہے اور کتنا کھُلا رکھنا ہے اس کی ترغیب ہمیں ترقی یافتہ کہے جانے والے ممالک سے ملتی ہے۔ غذائیں ہم اپنی کھاتے ہیں لیکن اسے غیر ملکی ناموں سے پکارنا ہمارے ترقی پسند ہونے کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف تو ہمارا یہ مزاج ہے اور دوسری طرف ہمارا ملک انھیں حالات کی طرف بڑھتا نظر آ رہا ہے جو کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے وجود سے قبل تھے۔ اس وقت بھی ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بنٹا ہوا تھا جن کے الگ الگ خود مختار راجا اور نواب تھے۔ اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ آج پھر ہمارا اندرونی خلفشار ہمیں ماضی کی طرف لے جا رہا ہے ہندوستان الگ الگ کئی ممالک کی شکل میں تو آج تقسیم ہو ہی چکا ہے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش جو کبھی ہندوستان کا ایک حصہ تھے آج الگ الگ ملکوں کی شکل میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ کشمیر، پنجاب اور آسام میں علاحدگی پسندی کی سرگرمیاں روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ بابری مسجد اور منڈل کمیشن کو لے کر ملک ہندو مسلمانوں اور اعلیٰ ادنیٰ ذاتوں کے دائرے میں بنٹا نظر آتا ہے لیکن ان سب سے بے پرواہ ہمارے سیاستداں اپنے اقتدار کی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانی عوام کی قومی یکجہتی پر سوالیہ نشان بنے ان مسئلوں کا سیاسی استعمال کرنے سے بھی نہیں چوُکتے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں بابری مسجد رام جنم بھومی کا مسئلہ کئی بار سیاسی ضرورتوں کے پیشِ نظر اٹھایا اور دبایا جاتا رہا ہے۔ کبھی اکثریتی فرقہ کے لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے متنازعہ عبادتگاہ کا تالا کھولا جاتا ہے تو کبھی اقلیتی فرقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کارسیوکوں پر گولیاں برسائی جاتی ہیں ہر پارٹی کی یہ کوشش رہتی ہے کہ الیکشن کا وقت نزدیک آنے پر کسی نہ کسی طرح عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے فائدہ اٹھایا جائے۔

ہمارا ملک تاریخ ساز گھوٹالوں اور دلالی کے کارناموں کے لیے بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شخص اربوں روپے کا گھوٹالہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ملتی جبکہ ہم کھربوں روپے کے غیر ملکی قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ اگر ہم 1980 سے رواں سال تک کے غیر ملکی قرضوں پر

> 1980-81 میں ہندوستان پر غیر ملکی قرض 1.3500 کروڑ روپے تھا جو کہ 91-1990 میں بڑھ کر 66000 کروڑ روپے ہو گیا اور آج یہی قرض 1.35 لاکھ کروڑ روپے تک پہنچ گیا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے قرضدار ملکوں میں ہندوستان تیسرے مقام پر ہے۔

نظر ڈالیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ کس تیزی سے ہم غیر ملکی قرضوں کی معرفت ان کے شکنجے میں پھنستے جا رہے ہیں۔ 81-1980 میں ہندوستان پر غیر مُلکی قرض 3500 1 کروڑ روپے تھا جو کہ 91-1990 میں بڑھ کر 66000 کروڑ روپے ہو گیا اور آج یہی قرض 35 1 لاکھ کروڑ روپے تک پہنچ گیا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے قرضدار ملکوں میں ہندوستان تیسرے مقام پر ہے۔ ہندوستان کے علاوہ برازیل اور میکسیکو دوسرے سب سے بڑے قرضدار ممالک ہیں۔ آج صورتحال یہ ہے کہ ہم جو قرض لیتے ہیں اس کا صرف 23 فیصد ہی ہندوستان اپنی ضرورتوں کے لیے خرچ کر پاتا ہے مقبیہ فیصد ان سابقہ قرضوں کے

سود کے طور پر واپس انھیں ممالک تک پہنچ جاتا ہے جن سے یہ قرض لیے گئے تھے۔ جہاں تک اس 23 فیصد رقم کا تعلق ہے اس کا بھی کتنا استعمال ملک اور عوام کی فلاح و بہبودگی کے لیے کیا جاتا ہوگا یہ سمجھنا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے جس ملک میں الیکشن پر ایک ایک امیدوار کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑ روپے سے بھی زیادہ رقم خرچ کر کے چناؤ جیتنا ضروری سمجھتا ہو اور جہاں ممبر پارلیمنٹ کی خرید و فروخت کے لیے 50-50 لاکھ روپے ادا کیے جانے کی خبریں عام ہو رہی ہوں وہاں اگر یہ قرض کم ہو بھی تو کس طرح۔ غالباً انھیں حالات کے پیشِ نظر عالمی بینک کا یہ دعویٰ ہے کہ محض آٹھ برسوں کے اندر ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا قرضدار ملک ہوگا اور بیرونی قرضوں میں اس بڑھتے ہوتے اضافے پر مخالف پارٹی کے ایک سیاستدان کے بیان کے مطابق صرف پانچ برس بعد ہندوستان جو رقم قرض کی شکل میں لےگا وہ پوری کی پوری سود کی شکل میں ادا کرنے پر مجبور ہوگا۔ اگر عالمی بینک کے مذکورہ اعداد و شمار اور دعوؤں میں ذرا بھی صداقت ہے تو آج جشنِ آزادی میں شمولیت کے ساتھ ہمیں اس سچائی پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ملک کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے اس ملک کے عوام اور رہنماؤں کو کیا کرنا چاہیے ورنہ ہم کب غیر ملکی شکنجہ میں پھنس کر اپنی آزادی گنوا بیٹھیں گے اس کا پتہ بھی نہ چلے گا۔



ملک میں پھیلی علیحدگی پسندی اور فرقہ وارانہ فضا پر جلد از جلد قابو پایا جائے محض بیان بازی اور مسئلوں کو ٹالتے ہی چلے جانا حل نہیں ہے۔



● اگر ان ممکنہ خطرات سے ملک کو بچانا ہے تو آج ایک بار پھر تمام ہندوستانی قوم کو یہ عزم کرنا ہوگا کہ وہ ہندوستان میں تیار شدہ اشیاء کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرے تاکہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے مسئلے پر قابو پایا جا سکے بیرونی ممالک سے اشیاءٔ کی خریداری بند کی جائے تاکہ ہندوستان ان کے عوض ادا کی جانے والی فارین ایکسچینج (زرِ مبادلہ) محفوظ رکھ سکے۔ حکومت کو چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنی صلاحیت دکھانے کے بہتر مواقع فراہم کرے تاکہ وہ روزگار کے سلسلے میں ہندوستان کے باہر جانے کے خواہش مند نہ رہیں۔

● ہندوستان میں تیار شدہ اشیاءً بالخصوص دستکاری کو فروغ دیا جائے۔ مراد آباد کی برتن سازی کی صنعت، سہارنپور میں لکڑی کی کاریگری، میرٹھ کی کھادی، قینچی کی صنعت، فیروز آباد کی چوڑیوں کی صنعت، خورجہ کی چینی کے برتنوں کی صنعت، آگرہ و کانپور کی چمڑا صنعت، لکھنؤ کی چکن صنعت اور ان جیسی ایسی بے شمار صنعتیں ہیں جن سے ہندوستان کے لاکھوں لوگ جڑے ہوئے ہیں، اگر حکومت انھیں پوری طرح سے فروغ دے تو نہ صرف بے روزگاری کے مسئلے پر بہت حد تک قابو پانے کا موقع ملے گا بلکہ بیرونی ممالک میں اِن اشیاءٔ کے مقبولِ عام ہونے پر ہندوستان کو بیرونی کرنسی بھی زیادہ حاصل ہوگی۔

● اسی طرح تعلیم اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے روزگار کے مسئلے پر بھی حکومت کو سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

آج صورتحال یہ ہے کہ لگاتار 12 تا 15 برس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمارے نوجوان ہزار پندرہ سو روپے مہینے کی نوکری کے لیے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اگر ان کی تعلیم پر آنے والے خرچ کا حساب لگایا جائے

تحریر: ڈاکٹر عزیز برنی

تو یہ تنخواہ تو دورانِ تعلیم ان پر ہونے والے خرچ سے بھی کم ہے۔ اگر ان حالات میں تبدیلی نہیں آئی تو نوجوانوں کی تعلیم کے تئیں دلچسپی کم ہوتی چلی جائے گی جس کا مخالف اثر ان کی طرزِ زندگی اور ہندوستانی معاشرہ پر یکساں ہوگا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تعلیم کو سستا بنایا جائے تاکہ اسکول کالج میں بچوں کو داخل کرانا اور ان کی تعلیم جاری رکھنا عام آدمی کی پہنچ کے اندر رہے ساتھ ہی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے ملازمت کے بہتر مواقع فراہم کرے۔

● غیر ضروری سرکاری اخراجات کو کم کیا جائے۔ آئے دن وزیروں کے دوروں اور حفاظتی انتظامات پر آنے والے خرچ پر غور کیا جائے۔ حفاظتی دستہ حفاظتی اغراض کو سامنے رکھ کے متعین کیا جائے۔ عہدہ اور شخصیت کی شان و شوکت کو سامنے رکھ کر نہیں۔

● تمام لیڈران چاہے وہ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں، عوامی نمائندے ہیں اور ان کی ہر نقل و حرکت کا عوام پر سیدھا اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی انا کی تسکین، انفرادیت کو برقرار رکھنے یا اقتدار کی چاہ میں آپسی کھینچ تان، توڑ پھوڑ اور ایک دوسرے پر بہتان لگاتے نظر آئیں گے تو یقیناً عوام کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی اور اگر خدانخواستہ سیاسی جماعتوں کا یہ آپسی خلفشار آگے بڑھا اور قبل از وقت الیکشن کی نوبت آگئی تو انتخابات کی شکل میں اربوں روپے کا خرچ ہندوستان کے معاشی حالات پر برا اثر ڈالے گا۔ پہلے سے ہی قرض کے بوجھ میں دبا ملک مزید قرضدار ہوتا چلا جائے گا۔ جس کا سیدھا اثر مہنگائی کی شکل میں عام آدمی پڑے گا۔

● ملک میں پھیلی علیحدگی پسندی اور فرقہ وارانہ فضا پر جلد از جلد قابو پایا جائے۔ محض بیان بازی اور مسئلوں کو ٹالتے چلے جانا ہی حل نہیں ہے۔ ہندوستانی عوام کو اتحاد، اخوت اور بھائی چارے کی جانب مائل کرنا ہوگا اور یہ تبھی ممکن ہے جب کہ تمام نمائندے خود اتحادو اخوت کا مثالی کردار پیش کریں۔

یہ چند باتیں ہیں جن پر سنجیدہ اور دانشمندانہ اقدام تحفظِ آزادی کی ضمانت بن سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر غیر ملکی قرض کی شکل میں ہمارے سروں پر لٹکتی ننگی تلوار کب ہمیں اپنی زد میں لے لے کہنا مشکل ہے۔

مجاہدۂ آزادی

ارونا آصف علی

فرحت رضوی



حال ہی میں ارونا جی کو 1991 کا "جواہر لال نہرو ایوارڈ" دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ارونا جی اس اعزاز کے لئے صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی صدارت میں ایک سات رکنی کمیٹی نے بڑے غور و فکر کے بعد منتخب کیا۔ توصیفی سند کے ساتھ 15 لاکھ روپے کا ایوارڈ انھیں باقاعدہ عزّو احتشام کے ساتھ ایک پُروقار تقریب میں عطا کیا جائے گا۔

ہندوستان کی سیاست میں عورتوں کا تعاون اور ان کے کارنامے ــــــ یہ موضوع آج نیا نہیں ہے، بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا۔ جنگِ آزادی کی تحریک میں بھی ہندوستان کی عورتیں پیچھے نہیں رہیں۔ حالات کے مطابق ضرورت پڑنے پر عورتوں نے ہمیشہ بہادری کے ساتھ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ مختلف سطحوں پر کیا ہے۔ سیاست میں عورتوں کی شمولیت کو لے کر ایک پہلو کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے مگر اس کمزوری کی ذمہ دار کسی حد تک خود عورتیں ہی ہیں . . . عورتوں کے انفرادی سیاسی نقطۂ نظر پر آج بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔ برصغیر کا یہ المیہ رہا ہے کہ سیاسی اُفق پر جب بھی کسی خاتون کا نام اُبھرا (ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش کے تعلق سے ایک طویل فہرست ہے) اس کی پشت پر کسی مرد یعنی باپ، شوہر یا بھائی کے سیاسی پس منظر کا سایہ نظر آیا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی رکنیت سے لے کر عورتوں کی سیاسی فکر نیز آئڈیولوجی ہمیشہ کسی مرد کا سہارا تلاش کرتی ہے۔ اگر کسی لیڈر نے سیاسی مصلحت کی بنا پر پارٹی تبدیل کی تو کسی معجزے کی طرح راتوں رات بہو بیٹیوں کی سیاسی رکنیت ور رجحان بدلنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ اب تو قومی اور علاقائی سطح پر یہ مرض سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ سیاست کی بساط پر اس فکر اور نظریاتی بحران میں دو ایک عورتوں کے نام ہی ملیں گے۔ جنھوں نے ذاتی تجربات اور گہری سیاسی پرکھ کی بنا پر نظریاتی سطح پر بحیثیت عورت ایک انفرادی مقام اپنے لیے خود بنایا ہو۔ ان میں ایک بہت نمایاں نام ہے ارونا آصف علی کا۔ جنھیں حال میں 1992 پدم وبھوشن ایوارڈ سے حکومت نے سرفراز کیا ہے۔

حالانکہ سیاسی میدان میں ارونا جی کی آمد بھی اپنے شوہر آصف علی صاحب کے زیرِ اثر ہوئی جو اس وقت انڈین نیشنل کانگریس میں ایک مستعد اور معتبر لیڈر تھے۔ یہ آصف علی کی فکری پختگی، قومی میلان اور سیاسی قد اور شخصیت کا سحر یا اعجاز ہی تھا کہ وہ محض اٹھارہ اُنیس سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کو چھوڑ کر دلوں کے رشتوں میں حائل مذہبی دیواروں کی پرواہ کیے بغیر نہ صرف آصف علی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئیں بلکہ آزادی کی لگن میں یہ شعلہ یا سیماب صفت دوشیزہ گھریلو زندگی کی خوشیوں اور ذاتی خواہشوں کو پسِ پُشت ڈال کر سیاسی جدّوجہد میں مبتلا ہو گئیں۔ اس زمانے میں آصف علی کی شخصیت اور خیالات کا ان پر بہت اثر رہا۔ دونوں کی عمر میں کافی فاصلہ تھا۔ پختہ شعور، تجربہ کار، زمانہ شناس آصف علی ایک طرف اور کم عمر، نڈر، حوصلہ مند، بہت کچھ جاننے اور کرنے کی خواہش مند ارونا جی ایک طرف۔ یہ آصف علی کی شخصیت کا اثر ہی تھا کہ مغربی انداز کی تعلیم و تربیت یافتہ ارونا جی ہندوستانی کلچر، تاریخ اور موجودہ سیاسی و سماجی مسائل کے قریب تر ہوتی گئیں یہاں تک کہ فکری انداز کے ساتھ ساتھ ان کے طرزِ زندگی میں بھی زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ شادی کے دو سال بعد ہی 1930 میں جب پہلی بار حکومت برطانیہ کے خلاف بغاوت کے جرم میں ایک سال کے لیے جیل گئیں تو وہیں سے ان کی جدّوجہد کا سلسلہ شروع ہوا جو آج چھ دہائیوں کے بعد بھی مختلف محاذوں اور سطحوں پر جاری ہے۔ 83 سال کی عمر میں بھی وہ ذہنی اعتبار سے مکمل صحت مند ہیں۔ وہ آج بھی اتنی ہی حوصلہ مند ہیں جتنا کہ لوگوں نے ساٹھ باسٹھ برس پہلے دیکھا ہوگا۔ اس بیچ انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا زندگی ان کے پیچھے اور مقاصد ہمیشہ آگے رہے۔

قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اس طویل سفر میں وہ ہر پل قومی مفادات کی غرض سے کسی نہ کسی طرح کبھی سیاست، کبھی صحافت اور کبھی سماجی بہبود کے محاذ پر سرگرم اور مستعد رہیں لیکن نہ صرف کبھی حکومت، اقتدار یا کرسی کے قریب جانے کی کوشش کی بلکہ وہ مفاد پرست اور مصلحت پسند لوگوں کی مداخلت اپنی زندگی اور کام میں بھی گوارا نہیں کرتیں اسی خوبی کی بنا پر بڑی بڑی سیاسی شخصیتیں ان کے سامنے بونی نظر آتی ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کی روایت میں آپ نے تین الگ الگ ادوار میں تاریخی ترتیب سے نمائندگی کی ہے۔ پہلا دور زبردست جدّوجہد اور قربانیوں کا دور تھا۔ ذاتی خواہشات کی نفی کر کے اندرونی، سیاسی نیز سماجی مسائل کو پسِ پشت ڈال کر تمام ہندوستانیوں کا مقصد ایک تھا۔ یعنی ملک کو آزاد کرانا۔ آزاد ملک و قوم کے لیے بہتر مستقبل کا تانا بانا بُننا۔ ابتدائی دور میں شوہر آصف علی کی رفاقت اور قربت میں گاندھی جی و نہرو جی کے زیرِ اثر آپ کا سیاسی میلان انڈین نیشنل کانگریس کی طرف رہا۔ 1932 میں گاندھی جی کی قیادت میں ستیہ گرہ آندولن میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور جیل گئیں۔ 1942 میں بھارت چھوڑو تحریک کے دوران جب تمام بڑے بڑے کانگریسی لیڈر 9 اگست کو بمبئی میں گرفتار کر لیے گئے تو

حکومتِ برطانیہ کی نظروں سے چھپ کر انڈر گراؤنڈ اس تحریک کی باگ ڈور ارونا جی کے نازک مگر مضبوط ہاتھوں میں آگئی اور بے شک تحریک کو مضبوط اور رفتار کو تیز کرنے میں آپ نے بڑے منظم ڈھنگ سے کام کیا۔ ارونا جی اپنے حوصلے بے باک سیاسی رویے کی بدولت نوجوانوں کی توجہ ہندوستان چھوڑو تحریک کی طرف مبذول کرانے میں بہت کامیاب رہیں دلی سے کبھی کلکتہ تو کبھی بمبئی تحریک کے ابتدائی دور سے آخر تک مرکزی رول آپ کا رہا جس نے بلاشبہ انھیں ایک سیاسی ہیروئن کا روپ دے دیا۔ ہزاروں ہندوستانی نوجوانوں کے لیے وہ حرکت و عمل کی علامت بن گئیں اور اس طرح نوجوان دلوں میں آزادی کی لگن پیدا کرنے کے لیے چراغ سے چراغ جلاتے ہوئے جس طرح آزادی کی مشعل کو روشن کیا وہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ثمر ہی سمجھنا چاہیے۔ بے پناہ تگ و دو اور محنت کی وجہ سے ان کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑا۔ اسی لیے گاندھی جی نے ارونا جی کو ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا جو ان کے لیے ناممکن تھا۔ (نِس 1946 میں حکومت نے ان کے خلاف وارنٹ (اسی وقت ان کی گرفتاری پر حکومت نے انعام بھی رکھا تھا) واپس لیا تو ارونا جی باہر آئیں۔

ہندوستان چھوڑو تحریک کے زمانے میں آپ بائیں بازو اور سوشلسٹ نظریات کے حامل کئی مشہور شخصیتوں کے قریب آئیں اسی دوران آپ کی سیاسی فکر اور قومی نظریے میں اہم تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہوئیں دراصل یہی شخصی تعمیر کا دور تھا۔ 1947 میں ملک آزاد ہو گیا تو اہلِ ہندوستان اور آزاد ملک کے معماروں کے سامنے نئے چیلنج تھے۔ یہ دور قومی ریاست کی تعمیر کا دور تھا جو بے شک ایک سخت امتحان تھا۔ ملک کے تعمیری عمل میں نئے منصوبوں نئی پالیسیوں سے متعلق اہم فیصلوں کا دور تھا جو کل تک یکجا تھے ان کے نظریاتی اختلاف اور ذاتی مفاد کھل کر ایسے سامنے آئے کہ اہم شخصیتوں کی قلعی کھل گئی، کتنے بارعب سیاسی چہرے بے نقاب ہونے لگے۔ اس وقت کچھ لوگ ہی ایسے تھے جو برسرِ اقتدار اور کرسی کی دوڑ میں سیاسی بساط کے مہرے نہیں بنے ان میں سے ایک ارونا آصف علی بھی تھیں۔ ارونا جی کا مقصد بالکل واضح تھا۔ 47 سے قبل آزادی اور آزادی کے بعد مذہب، رنگ و نسل، زبان اور علاقائی تفریق کے بغیر ایک مساوی سماج کی تشکیل و تعمیر —— جہاں عورت مرد کے حقوق بلا جنسی تعصب کے مساوی ہوں اپنے مقاصد کی پاداش میں آپ نے کسی سیاسی پارٹی سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا، اگر کبھی سیاست کا دامن تنگ معلوم ہوا تو صحافت یا دوسری سماجی تنظیموں کو آلۂ کار بنانے میں گریز نہیں کیا۔ آزادی کے فوراً بعد آصف علی صاحب سے آپ کے سیاسی نظریات میں اختلاف پیدا ہونے لگے۔ آصف علی صاحب کو بحیثیت سفیر امریکہ بھی بھیجا گیا اور پھر اڑیسہ کے گورنر مقرر ہوئے ان حالات میں آپ نے ایک بڑے عہدہ دار کی بیوی کا فرض انجام دینے کے بجائے ملک اور قوم کی بے غرض خدمت کی خاطر ایک صحافی اور سوشل ورکر بنے رہنا گوارا کیا یہ ایک اہم

اور پختہ فیصلہ تھا جس پر وہ ہمیشہ قائم رہیں انھیں پیدا شدہ حالات کے سبب دونوں کو اپنی ازدواجی زندگی کی قربانی بھی دینی پڑی۔ ملک اور قوم کے آگے ذاتی خوشیاں ثانوی رہ گئیں جو ایک مثال ہے۔ یہی مثال ارونا آصف علی یعنی برصغیر کی ایک عورت کی منفرد سوچ، سیاسی میلان، سماجی نظریے اور مثبت رویوں کی نشاندہی کرتی ہے یہاں ان کا قد اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ ہر کس و ناکس چھونے کا بوتا نہیں رکھتا۔ ازدواجی زندگی کا یہ ٹکراؤ کسی منفی رویے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک عورت کی فکری اساس، مضبوط ارادوں اور قومی مفاد پر ذات کی نفی کا اعلان تھا۔ ایک ہوش مند فیصلہ تھا، ذاتی تجربوں کا نچوڑ تھا جس نے سفر کی نئی سمت کا تعین کیا اور 1948 میں سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئیں پھر جلد ہی دو سال بعد سوشلسٹ پارٹی سے کنارہ کر کے بائیں بازو کے ایک سوشلسٹ گروپ کی تشکیل کی جس میں تین سال تک سرگرمِ عمل رہیں۔

درمیان میں کئی برس ایسے گزرے کہ آپ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں رہیں بلکہ مختلف ٹریڈ یونینوں اور سماجی تنظیموں میں بحیثیت سوشل ورکر مستعدِ عمل رہیں۔

1964 میں پنڈت نہرو کی وفات کے بعد کانگریس میں بائیں بازو کے نظریات کو تقویت پہنچانے کی غرض سے ایک بار پھر انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئیں۔ نہرو جی بمقابل دوسرے سیاسی لیڈروں کے اتنے رجعت پرست نہیں تھے اور ایک بین الاقوامی سیاسی شعور کی بنا پر سوشلسٹ نظریۂ فکر کی طرف بھی سیاسی میلان تھا۔ ان کے بعد کانگریس میں نظریاتی توازن برقرار رکھنے کی خاطر ہی شاید آپ نے یہ قدم اٹھایا۔ اس دوران ارونا جی جہاں مختلف محاذ پر ملک کے اندر مصروفِ کار رہیں وہیں کئی مرتبہ ملک سے باہر بحیثیت ہندوستانی رکن کے ملک کی نمائندگی کے فریضے بھی انجام دیے۔ 1958 میں پہلی بار دلی کی میئر منتخب ہوئیں۔



ارونا جی کے تاریخی سفر کا تیسرا دور یعنی 'آج' بھی مسائل سے گھرا ہوا ہے۔ پوری دنیا میں سیاسی اُفق پر پیدا شدہ سیاسی بحران کے پس منظر میں ملک کے بین الاقوامی رشتوں کا شیرازہ سا بکھر گیا ہے۔ 'ہندوستان چھوڑو تحریک'، جس کی شروعات 1930 کے قریب ہوئی۔ آج پچاس برس گزر جانے کے بعد دوبارہ ہندوستان کے سامنے بیرونی طاقت کے بڑھتے ہوئے خطرات درپیش ہیں۔ اقتصادی آزادی خُرد بُرد ہو رہی ہے ان ناسازگار حالات میں بھی ارونا جی نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سرگرم ہیں ان کے خیالات 'طرزِ عمل اور تجربوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ گاندھی اِزم 'نہرو اِزم اور سائنٹفک سوشلسٹ نظریہ کا اختلاط وہاں موجود ہے۔ جو موجودہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔ جس طرح پچاس سال قبل وہ ملک کو بیرونی طاقت کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے میدان میں اُتر گئیں تھیں۔ آج وہی خطرات دوبارہ ہندوستان کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ بیرونی طاقتیں ملک کے اتحاد اور اقتصادی نظام کے لیے خطرہ بن چکی ہیں۔ روسی انقلاب کا محل چکنا چور ہو گیا تو ہندوستان میں حالات دن بدن بگڑتے جا رہے ہیں ایسے بحران کے دور میں بھی ارونا جی کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ وہ نئے مسائل کے حل کی تلاش میں ہیں۔

سیاسی منظرنامے سے قطع نظر انھوں نے ہمیشہ کمزور طبقوں کی بہبود کے لیے کوششیں کی ہیں جن میں سے ایک طبقہ ہے 'عورت'، برِصغیر کے پدری سماجی نظام میں عورت کی حیثیت بمقابل مرد کے ہمیشہ ثانوی رہی ہے۔ ارونا جی نیشنل فیڈریشن آف انڈین ومین کی عرصے تک صدر رہیں اور آجکل بحیثیت چیف پیٹرن کے اس تنظیم کی رہنمائی کر رہی ہیں، حال ہی میں ان کی ایک کتاب عورتوں کے متعلق شائع ہوئی۔ ارونا جی کا یقین ہے کہ وہی قوم اور سماج ہمہ جہت ترقی کر سکتا ہے جہاں عورتوں کی فکری اور ذہنی آزادی کا بند و بست ہو۔ انھیں مردوں کی طرح تعلیم کے مواقع دیے جائیں۔ کیرلا جہاں سو فیصد تعلیم کا سرکاری اعلان ہوا ہے۔ واضح ہو کہ وہاں پوری سماجی نظام کے اثرات بہت کم تھے بلکہ خاندانی ملکیت کی وارث بیٹی ہوتی تھی۔ سماجی اور اقتصادی مساوات ان کے لیے نہ صرف ایک نعرہ ہے بلکہ زندگی کا نصب العین ہے۔ جنس، مذہب، نسل، زبان، ۔۔۔ کی تفریق کے بغیر ایک سماجی نظام کی تعمیر و تشکیل ان کی نہ صرف آئیڈیولوجی ہے بلکہ ایک یقین ہے۔



سیاسی منظرنامے سے قطع نظر انھوں نے ہمیشہ کمزور طبقوں کی بہبود کے لیے کوشش کی ہے جن میں سے ایک طبقہ ہے 'عورت'

مختصر حالاتِ زندگی

1909 ــــــ تاریخ پیدائش

1928 ــــــ کانگریس کے لیڈر آصف علی (مرحوم) سے شادی۔

1930 ــــــ حکومتِ برطانیہ سے بغاوت کے جرم میں ایک سال کے لیے جیل گئیں۔

1932 ــــــ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں 'ستیہ گرہ آندولن' میں شریک ہونے کے جرم میں چھ ماہ کے لیے جیل گئیں۔

1941 ــــــ دوبارہ ایک سال کے لیے جیل۔

1942 ــــــ 'بھارت چھوڑو' تحریک کے دوران انڈر گراؤنڈ ہو گئیں۔

1946 ــــــ حکومتِ برطانیہ نے ان کے خلاف وارنٹ واپس لیا۔

1947-1948 دلی پردیش کانگریس کمیٹی کی صدر منتخب ہوئیں۔

1948 ــــــ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی قیادت میں ہندوستانی وفد کے ساتھ یونیسکو سیشن میں شرکت کے لیے میکسیکو گئیں۔

1948 ــــــ سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوئیں۔

1950 ــــــ سوشلسٹ پارٹی سے کنارہ کشی اختیار کر کے بائیں بازو کے سوشلسٹ گروپ کی تشکیل جس میں 1953 تک سرگرم رہیں۔

1953-64 ــ اس دوران کسی مخصوص سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں رہیں بلکہ مختلف ٹریڈ یونینوں اور سماجی تنظیموں میں بحیثیت سوشل ورکر کام کرتی رہیں۔

1964 ــــــ پنڈت نہرو کی وفات کے بعد رجعت پرستی کے خلاف ترقی پسند خیالات کو تقویت پہنچانے کی غرض سے ایک بار پھر انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوئیں۔

1958 ــــــ بحیثیت میئر دلّی منتخب ہوئیں۔

1959 ــــــ بحیثیت میئر ایک سال میں توسیع۔

1964 ــــــ آل انڈیا پیس کونسل 'ایفرو ایشین' سولڈ لبرٹی تحریک اور انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی میں اہم فرائض انجام دیے۔

1964 ــــــ نیشنل فیڈریشن آف انڈین ومین کی عرصے تک صدر رہیں۔ آج کل بحیثیت چیف پیٹرن رہنمائی کر رہی ہیں۔

1964 ــــــ لنک نیوز میگزین اور انگریزی روزنامہ پیٹریاٹ کے معماروں میں سے ایک ہیں۔ اور آج بھی اسی مشن سے وابستہ ہیں۔

1965 ــــــ لینن پیس ایوارڈ حاصل کیا۔

1987 ــــــ قومی یکجہتی کے لیے اندرا گاندھی ایوارڈ حاصل کیا۔

1992 ــــــ پدم وبھوشن ایوارڈ حاصل کیا۔

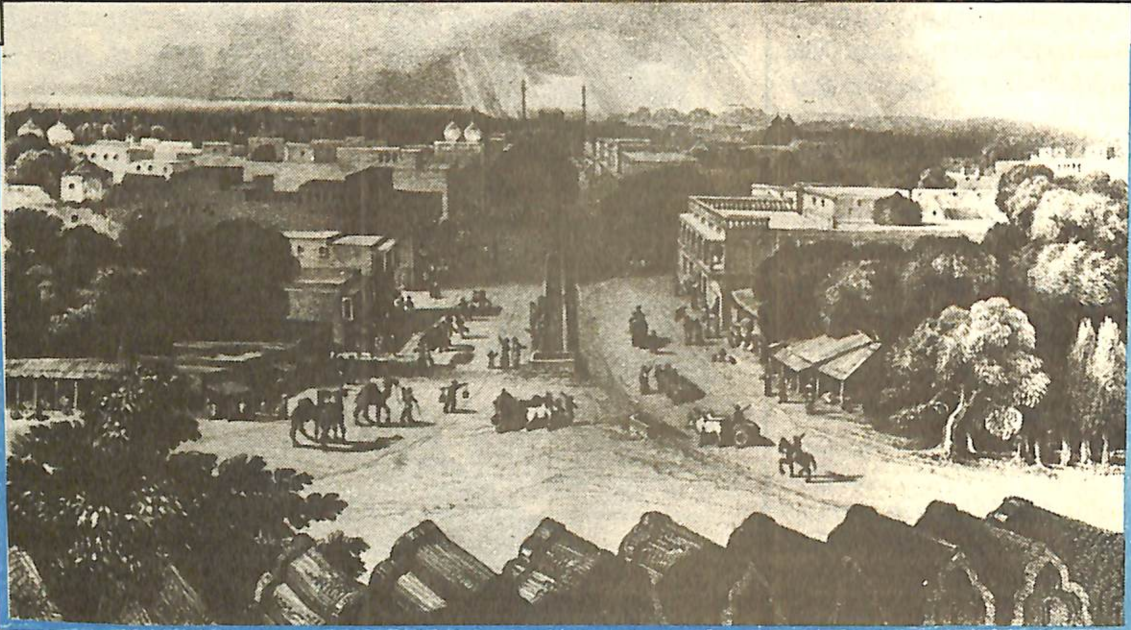


ہندوستان تاریخ کے آئینے میں

سید ظفر حسن کاکوی

رام، کرشن، گوتم بدھ، مہاویر اور نانک جیسے صوفیوں اور سنتوں کا ملک، ہندوستان جس کی ثقافت اور تاریخ انتہائی قدیم اور جداگانہ ہے، نشیب و فراز کے جتنے مراحل سے گزرا ہے اس کی نظیر پوری دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ مختلف بادشاہوں اور راجاؤں نے اسی ملک پر حکومت کی۔ حکومت کی باگ ڈور کبھی ہرش وردھن اور موریہ کے ہاتھوں میں رہی تو کبھی مسلمان بادشاہوں اور مغلوں نے اس پر اپنا تسلط جمالیا۔ مغل حکمرانوں کے زوال کے ساتھ ہی ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑتا چلا گیا۔ انگریزوں نے اپنی عیاری اور ہمارے باہمی انتشار کے باعث ہمیں اپنا غلام بنالیا اور تقریباً 200 برسوں تک ہمیں ان کی اسی غلامی میں زندگی گزارنی پڑی۔ انگریز جو تاجروں کی شکل میں یہاں آئے تھے دھیرے دھیرے ہمارے حکمراں بن گئے۔ ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کا قیام ہندوستانی تاریخ اور ہمارے زوال کا ایک اہم لیکن کربناک واقعہ ہے۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے تھوڑے سے تاجروں نے ہندوستان جیسے مہذب اور خوشحال ملک کو شکست دے کر اپنی حکمرانی قائم کرلی، یہ ایک بہت بڑا تاریخی المیہ ہے جس سے ہندوستان کے لوگوں کو دوچار ہونا پڑا ہے۔

1498 میں پرتگال کے ایک ملاح واسکوڈی گاما نے بھارت کا سمندری راستہ دریافت کیا تھا جس کے



چاندنی چوک دہلی کا آزادی سے پہلے کا ایک منظر

بعد سے ملک میں پرتگال کے لوگوں کی آمد و رفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پرتگالیوں نے یہاں سے اتنی دولت کمائی کہ ان کو دیکھ کر دوسرے یوروپی باشندے بھی بغرضِ تجارت ہندوستان آنے لگے۔ 31 دسمبر 1600 کو کوئن ایلزابیتھ نے ہندوستان جیسے ممالک سے تجارت کرنے کے لیے لندن کے تاجروں کی ایک کمیٹی بنائی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام دیا گیا۔ 1615 میں سر تھامس رو برطانوی حکومت کا ایلچی بنکر ہندوستان آیا اور اس نے انتہائی سرعت سے کمپنی کی تجارت کو فروغ دیا۔ 1691 تک ہی سورت، آگرہ، احمد آباد، بڑوچ میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوچکی تھیں۔ 1631 میں مچھلی پٹنم اور 1640 میں چندر گری کے راجہ سے مدراس کو لیز پر حاصل کرلیا گیا۔ 1668 میں کمپنی نے بمبئی کو بھی حاصل کرلیا۔ 18ویں صدی کے وسط تک یہ کمپنی ہندوستان میں اپنی جڑیں پورے طور پر جما چکی تھی۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس اور ہگلی کمپنی کے اہم مراکز تھے۔

1757 میں پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کی جیت ہوئی۔ 1764 میں بکسر کی جنگ ہوئی جس میں انگریزوں نے نہ صرف اودھ اور بنگال کے نوابوں کو زیر کیا بلکہ دلّی کے بادشاہ شاہ عالم ثانی کو بھی شکست دی۔ اِس جنگ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ایک زبردست سیاسی طاقت بن گئی۔ شاہ عالم نے ایک معاہدہ کے تحت بنگال، بہار اور اُڑیسہ سے محصول اراضی اکٹھا کرنے کا حق کمپنی کو دیدیا۔ کچھ عدالتی اختیارات بھی کمپنی کو حاصل ہو گئے اور اس طرح کمپنی پورے ہندوستان میں اپنا اثر مرتب کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جنوبی ہندوستان کی فتح کے بعد انگریزوں نے شمالی ہندوستان بالخصوص سندھ اور پنجاب کی طرف رُخ کیا۔ 1843 میں سندھ انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد 1845 اور 1849 میں سکھوں کو دو جنگوں میں شکست دے کر انگریزوں نے پنجاب کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ 1855 میں برطانوی سلطنت ہمالیہ سے لے کر بحرِ ہند تک اور عرب سے لے کر برما تک پھیل چکی تھی۔

جنوبی ہندوستان کی فتح کے بعد انگریزوں نے شمالی ہندوستان بالخصوص سندھ اور پنجاب کی طرف رُخ کیا۔ 1843 میں سندھ انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔

برطانوی حکومت کا ہندوستانیوں کی عام زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ کمپنی کے قیام کے وقت ہندوستان کی معاشی حالت کافی مستحکم تھی، یہاں کی صنعتیں عروج کے منازل طے کر رہی تھیں۔ ڈھاکہ کی ململ اپنی باریکی کی وجہ سے دُنیا بھر میں مشہور تھی۔ برطانوی اقتدار کے پاؤں ہندوستان میں جیسے جیسے جمتے گئے، ملک کی اقتصادی حالت بگڑتی گئی۔ انگریزوں نے ہندوستان کا زبردست استحصال کیا، کمپنی کے ملازمین نے ہندوستانیوں پر بڑے بڑے مظالم ڈھائے، ہندوستانی کسانوں اور مزدوروں کو جی بھر کر لُوٹا اور انسانیت کا خون بہایا۔ برطانوی حکومت کا ہندوستان کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی زندگی پر اتنا بُرا اثر پڑا کہ بالآخر عوام و خواص میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے غلامی کا طوق اتار پھینکنے کا عزمِ صمیم کیا اور برطانوی حکومت سے نجات پانے کے لیے تحریک شروع کردی۔ 1857 میں بغاوت ہوئی۔ یہ ہماری پہلی جنگِ آزادی تھی جو 1947 تک جاری رہی اور ہم نے انگریزوں کو ملک سے نکال کر ہی دم لیا۔ 1857 کے انقلاب کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں حکمرانی کی ذمہ داری براہِ راست برطانوی سلطنت کے سُپرد کردی۔
انیسویں صدی کے اوائل کے انتہائی غیر معمولی اور سماجی ناصح راجہ رام موہن رائے کے ترقی پسند نظریات کو اگر تحریکِ قومی آزادی کی جڑوں سے تعبیر کیا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ اپنی عمر بھر کی کوششوں سے ہندوستان کے فرسودہ رسوم و رواج کو جدیدیت کے سانچہ میں ڈھال کر انھوں نے ہندوستان میں ایک نئے دانشورانہ ماحول کی شروعات کی جس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد ہوا۔

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستانی رائے عامہ کے اظہار کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی جس کی پہلی میٹنگ 1885 میں بمبئی میں ہوئی جس میں صرف 40 نمائندوں نے شرکت کی۔ 1916 تک یہ جماعت قناعت پسند لیڈران کے زیرِ کنٹرول رہی جو برطانوی قوانین کو بجائے مسترد کرنے اور ہٹانے کے اس میں ترمیم کے لیے دباؤ ڈالتے رہے۔ لیڈروں کی ان نرم پالیسیوں سے بیزار ہوکر کانگریس کے باہر اور کسی حد تک اس کے اندر بھی ایک انتہاپسندانہ تحریک کا رجحان پنپتا رہا۔ ایسے انتہاپسند مجاہدینِ آزادی ایک سلسلہ وار تحریک اور حسبِ ضرورت جسمانی طاقت کے استعمال اور دہشت گردی پر بھی زور دیتے رہے۔ انتہاپسندوں کے پہلے بڑے لیڈر بال گنگادھر تلک تھے جو گاندھی جی کی طرح برطانوی حکومت کے ساتھ عدم تعاون میں تو یقین رکھتے تھے لیکن عدم تشدد کے حامی نہیں تھے۔ انھوں نے اخبارات اور رسائل کے ذریعے مجاہدین آزادی کو برطانوی حکومت کے خلاف براہِ راست کارروائی کی صلاح دی۔ کچھ برطانوی افسروں کے قتل کی ترغیب دینے کے الزام میں یہ 1908 سے 1914 تک جیل میں ڈال دیئے گئے۔ اس عرصہ کے دوران اعتدال پسندوں کے لیڈر گوپال کرشن گوکھلے تھے جن کو گاندھی جی اپنا گرو تسلیم کرتے تھے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں انتہاپسندوں کی تحریک، جس کی شروعات ملک نے مغربی ہندوستان سے کی تھی، کے شعلے بنگال تک پہنچ گئے۔ لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم کرکے بنگالیوں سے دشمنی مول لے لی تھی۔ بنگال کی تقسیم کا حقیقی مقصد بنگالیوں میں پھوٹ ڈالنا، ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنا اور اس دانشورانہ نشاۃِ ثانیہ کا گلا گھوٹنا تھا جو انیسویں صدی میں اوّل سے آخر تک قائم رہا تھا۔ 1905 میں جاپان کی جنگ نے ہندوستانیوں کی اس سوچ کو ایک نیا طوفانی موڑ دے دیا کہ ایشیائی باشندوں کو یورپ کی کہتری میں رہنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے 1904 سے 1909 کے درمیان تحریک میں زبردست تیزی آئی۔ تشدد اور دہشت گردی کی وارداتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا جس کے نتیجے میں حکومت نے مورلی منٹو (MORLEY-MINTO) اصلاحات کا نفاذ کیا اور پھر 1911 میں بنگال کی دوسری بار تقسیم ہوئی۔ حکومت کی اس کارروائی سے ہندوستانیوں کی یہ سوچ اور گہری ہوئی کہ سیاسی دہشت گردی کی حکمت عملی ہی برطانیہ کو پسپائی پر مجبور کرسکتی ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد تلک ایک بار پھر سرگرم عمل ہوگئے۔ 1916-17 میں تلک اور مسز اینی بیسینٹ نے انتہائی شد و مد سے ہوم رول (HOME RULE) آندولن، چلایا۔

1919 میں برطانوی حکومت نے ایک بار پھر قوم پرستوں کے جوش فرو کرنے کی غرض سے مانٹاگو چیمز فورڈ (MONTAGU_CHELMSFORD) اصلاحات نافذ کیں لیکن مارچ 1919 میں ہی ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ہندوستان اور برطانیہ کے باہمی تعلقات کی چولیں ہلا دیں۔ ایک انگریز جنرل ڈائر نے امرتسر کے جلیانوالا باغ میں نہتے لوگوں کے ایک ہجوم پر بغیر کسی وارننگ کے اپنے آدمیوں سے گولیاں چلوائیں جسکے نتیجے میں 379 قوم پرستوں کی جانیں تلف ہوئیں اور کم از کم 1200 افراد زخمی ہوئے۔ اس قتلِ عام نے ہندوستانیوں کے دلوں کو گہرا صدمہ پہنچایا اور ان اعتدال پسند قائدین کو بھی اپنے نظریات پر نظرِ ثانی کے لیے مجبور ہونا پڑا جو اب انگریزوں سے مایوس ہوچکے تھے۔ قتل عام کا یہ اندوہناک واقعہ ہی ایک نئے قائد موہن داس کرم چند گاندھی کو سامنے لایا جو بعد میں مہاتما گاندھی کہلائے۔ گاندھی جی نے قومی تحریکوں میں مکمل تبدیلی کرکے اسے تین نئی جہتیں دیں۔

1۔ انھوں نے عدم تشدد، عدم تعاون اور حکم عدولی کی کامیاب تکنیکوں کو متعارف کرایا۔

2۔ مغرب میں تعلیم یافتہ چند مخصوص افراد کی قیادت والی ایک چھوٹی سی قومی تحریک کو ایک ایسی عظیم تحریک میں تبدیل کردیا جس کو کروڑوں غیر تعلیم یافتہ افراد کی حمایت بھی حاصل تھی۔

3۔ قومی تحریک میں حصولِ آزادی اور دوسرے آدرشوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے سماجی انصاف کے تصور کو بھی شامل کرلیا۔

یکم اگست 1920 کو بال گنگادھر تلک کی موت



کے بعد کانگریس کی باگ ڈور گاندھی جی نے سنبھال لی۔ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک میں سبھی طبقوں نے حصہ لیا۔ حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے ہزاروں لوگوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا۔ 1922 میں چورا چوری کے مقام پر تشدد بھڑک اُٹھنے کے باعث یہ تحریک ملتوی کردی گئی۔ 1927 میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا جس کا مقصد ہندوستانی آئین میں کچھ مزید تبدیلیوں پر غور کرنا تھا۔ چونکہ حکومت برطانیہ نے اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا تھا اس لیے انڈین نیشنل کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سائمن کمیشن کی مخالفت کرنے والے ایک جلوس پر جس کی قیادت لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے، پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ لالہ جی بھی زخمی ہوئے اور 17 نومبر 1928 کو ان کی موت ہو گئی۔

31 دسمبر 1929 کو لاہور میں راوی کے کنارے پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگریس نے مکمل طور پر آزادی حاصل کرنے کا عہد کیا اور تجویز پاس کی۔ 1930 میں گاندھی جی نے سول نافرمانی کی مہم شروع کی۔ سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے ایک انگریز افسر کو گولی مار کر لالہ جی کے قتل کا انتقام لے لیا۔ بعد میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھدیو کو 23 مارچ 1931 کو پھانسی دیدی گئی۔ کانگریس نے 1935 کے ایکٹ کے تحت انتخابات میں حصہ لیا اور آٹھ صوبوں میں اپنی حکومتیں بنائیں۔ 1939 میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ کانگریس کی ریاستی حکومتوں نے ہندوستان کو جنگ میں شامل کرنے کی تجویز کی مخالفت میں استعفے دے دیئے۔ کانگریس نے تجویز پاس کرکے کہا کہ ہندوستان جنگ میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ 1942 میں کانگریس نے بھارت چھوڑو تحریک چلائی۔ یہ تحریک کانگریس کی آخری اور سب سے بڑی تحریک تھی جس نے فوج اور عوام میں بیداری پیدا کی۔ 1946 میں بحری اور فضائی افواج نے بھی بغاوت کردی اور بالآخر انگریزوں کو بھارت چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ محبانِ وطن کی عظیم قربانیاں ثمر آور ہوئیں... 15 اگست 1947 کو انگریز بھارت کو آزاد کرکے چلے گئے اور اس طرح غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور ہم آزاد ممالک کے درمیان فخر اور سربلندی کے لائق بنے۔ جاتے جاتے بھی انگریزوں نے اپنی گندی ذہنیت اور غلط پالیسیوں کو بروئے کار لاکر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرادیا اور ایک نئے ملک پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ شاطر سامراجی جاتے جاتے بھی ہندوستان کے ٹکڑے کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اہم واقعات

1498 ـــــ پرتگال کے ملاح واسکوڈی گاما نے بھارت کا سمندری راستہ دریافت کیا۔

31 دسمبر 1600 کوئین ایلزبتھ نے بھارت سے تجارت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔

1615 ـــــ برطانوی حکومت کے ایلچی سرتھامس رو کی بھارت آمد۔

1631 ـــــ کمپنی نے مچھلی پٹم لیز پر حاصل کیا۔

1640 ـــــ مدراس ـــــ

1757 ـــــ پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کی جیت ہوئی۔

1764 ـــــ بکسر کی جنگ ہوئی۔ انگریزوں نے اودھ اور بنگال کے نوابوں اور دلی



کے بادشاہ شاہ عالم ثانی کو شکست دی۔

1843 ـــــ سندھ انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔

1845 ـــــ انگریزوں کے ہاتھوں سکھوں کی شکست۔

1849 ـــــ انگریزوں کے ہاتھوں سکھوں کی دوسری شکست کے بعد پنجاب انگریزی حکومت میں شامل کرلیا گیا۔

1857 ـــــ مادرِ وطن کی آزادی کے لیے بھارت کے سپوتوں نے پہلی جنگ لڑی۔

1885 ـــــ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام۔

1905 ـــــ جاپان کی جنگ نے مجاہدین کو نیا جوش وولولہ بخشا۔

1906 تا 1909 تحریکِ آزادی نے شدت اختیار کی۔

1917 تا 1918 ہوم رول آندولن شدومد سے چلا گیا۔

1919 ـــــ مانٹاگو چیمز فورڈ اصلاحات کا نفاذ

مارچ 1919 المیہ جلیانوالہ باغ

اگست 1920 بال گنگادھر کی وفات، کانگریس کی باگ ڈور گاندھی جی نے سنبھال لی۔

1927 ـــــ سائمن کمیشن بھارت آیا۔

17 نومبر 1928 لالہ لاجپت رائے کی وفات۔

31 دسمبر 1929 پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگریس نے مکمل آزادی کے حصول کا عہد کیا۔

1930 ـــــ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی مہم شروع کی۔

23 مارچ 1931 ایک انگریز افسر کو گولی مارنے کے الزام میں بھگت سنگھ، راج گرو، اور سکھدیو کو پھانسی دے دی گئی۔

1935 ـــــ بھارت کے آٹھ صوبوں میں کانگریس نے حکومتیں بنائیں

1942 ـــــ بھارت چھوڑو تحریک

1947 ـــــ بحری وفضائی افواج کی بغاوت

15 اگست 1947 تحریکِ آزادی کامیاب ہوئی اور بھارت انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔

آہنی عزم ، تاریخ ساز نعرہ

"بھارت چھوڑو"

ایچ ۔ کے ۔ پرواز

ہندوستان کی جنگِ آزادی 1857 جسے غدر بھی کہا جاتا ہے فی الحقیقت ایسی تحریکِ آزادی تھی جو غیر منضبط ہونے کی وجہ سے ناکام ہوئی ۔ لیکن عوام کے دلوں میں آزادیٔ وطن کی شرر بار خواہشات کو جنم دے گئی ۔ ہندوستان 15 اگست 1947 کو آخرکار آزادی کا پرچم لہرانے میں سرخ رو ہوا لیکن اس سرخ روئی میں لاکھوں بے گناہ اور معصوم ہندوستانیوں کا خون بھی شامل تھا جو ملک کی تقسیم کے باعث ندیوں، نالوں، شاہراہوں اور ویرانوں میں سال بھر بہتا رہا۔

اس جنگِ آزادی کی تاریخ میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے تا حشر نہ مٹنے والے گہرے نشانات مرتسم ہیں۔ اس تحریک میں مسلم لیگ نے تو کوئی حصہ نہیں لیا لیکن اُس زمانے کی کمیونسٹ پارٹی نے نہ صرف اس میں شمولیت نہیں کی بلکہ اُسے بین الاقوامی مفادات کے خلاف بھی قرار دیا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ روس بھی برطانوی فوج کے حلیفوں میں محوری طاقتوں سے نبرد آزما تھا۔ بظاہر یہ تحریک خون، خرابوں اور شورشرابوں کی نذر ہوگئی لیکن اپنے پیچھے ایسے دوررس نتائج چھوڑ گئی جنھوں نے 1842 میں برطانوی ایوانِ پارلیمانی کی بنیادوں کو ہلاکر رکھ دیا اور مابعد اُسے ہندوستان کو اپنی غلامی کے شکنجوں سے رہائی دینا پڑی۔

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور آہستہ آہستہ کانگریس نے ایک مکمل سیاسی پارٹی کا روپ اختیار کرلیا۔ عوام گروہ درگروہ کانگریس میں شریک ہوتے گئے اور لاکھوں غیر ملکی ہندوؤں اور مسلمانوں نے بھی آزادی کے لئے موقع ومحل کے اعتبار سے اپنے پسینے اور خون کی قربانیاں پیش کرنے کو مذہبی فریضہ قرار دیا۔ 1942 تک کانگریس کے ساتھ دوسری اور پارٹیوں کی سرگرمیاں تیز رفتاری سے جاری رہیں۔ ان تمام سیاسی تحریکوں، ان کے عمل اور ردّعمل سے ملک کا دانشور طبقہ ہی نہیں تقریباً ہر ذی علم آشنا ہے۔

اس تحریک کے اصل واقعات کی عکس آرائی سے قبل اُس کے پسِ منظر کی ہلکی سی جھلک دکھا دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔

> "1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور آہستہ آہستہ کانگریس نے ایک مکمل سیاسی پارٹی کا روپ اختیار کرلیا۔ عوام گروہ درگروہ کانگریس میں شریک ہوتے گئے اور لاکھوں غیر ملکی ہندو اور مسلمانوں نے بھی آزادی کے لیے موقع ومحل کے اعتبار سے اپنے پسینے اور خون کی قربانیاں پیش کرنے کو مذہبی فریضہ قرار دیا۔"

بھارتی سیاسی تاریخ کی اہم ترین کڑیوں کا سلسلہ کانگریس کے 1919 کے سیشن سے شروع ہوتا ہے جب مانٹیگو۔چیمسفورڈ اصلاحات کو مذکورہ اجلاس میں منظور کرنے سے انکار کردیا گیا۔ 20 جون میں خلافت کمیٹی نے برطانوی سامراج کو عدم تعاون کا نوٹس دے دیا۔ جسے ستمبر کے کلکتہ سیشن میں گاندھی جی کے عدم تعاون فارمولے پر غور وفکر کے بعد ناگپور کے سالانہ اجلاس میں تسلیم کرلیا گیا۔ اس پروگرام میں برطانوی سرکار کے عطا شدہ خطابات کی واپسی، لیجسلیچر مقامی اداروں کا بائیکاٹ، اسکولوں، کالجوں اور عدالتوں سے انحراف کے علاوہ جملہ غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ اور ملک میں بنے ہوئے کپڑوں کا استعمال شامل تھا۔ ساتھ ہی پُرامن ذرائع سے سوراج کی مانگ بھی ہندوستان کی فضاؤں میں گونج اُٹھی۔ لاکھوں طلبہ نے تعلیمی اداروں کو چھوڑ دیا۔ وکیلوں نے برطانوی عدالتوں میں حاضری دینا بند کردی۔ نتیجے میں لاکھوں آدمیوں نے خود کو جیل میں بھرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ 1922 میں گاندھی جی نے وائسرائے ہند کو الٹی میٹم دیا کہ وہ سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کرنے والے ہیں۔ اسی سال چوری چورا میں عوام نے مشتعل ہوکر بائیس پولیس افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار کر پُرامن اور قانونی تحریک میں تشدد کے شعلے بھڑکا دیے جس کے نتیجے میں گاندھی جی کو اسی سال چھ برس کی سزا ہوئی لیکن 1924 میں انھیں رہا کردیا گیا۔

عدم تعاون کی تحریک کی واپسی کے بعد موتی لعل نہرو کی رہنمائی میں 'سوراج پارٹی' اُبھر کر سامنے آئی۔ 1923 میں کانگریس کے دہلی سیشن میں صوبائی کونسلوں کے انتخابات میں حصہ لینے کی تجویز پاس ہوئی۔ ہندوستانی ریاستوں کے رؤسا کے برطانیہ نواز کردار میں تبدیلی آئی جو 1921 میں 'ایوان رؤسائے ہند' کے قیام کے وقت وائسرائے ہند کی صدارت میں طے کی گئی تھی۔ 1929 میں ایک شاہی کمیشن، سائمن کمیشن کے نام سے قائم کیا گیا جس کے جملہ ممبران برطانیہ نژاد تھے۔ اس کمیشن کا بائیکاٹ کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ سب نے ہی کیا۔ اسی سال لاہور کے کانگریسی اجلاس میں مکمل آزادی کی قرارداد پاس کی گئی۔ مارچ 1930 میں ہوئی لندن کی گول میز کانفرنس میں کانگریس نے حصہ نہ لے کر برطانوی حکومت پر عدم اعتماد کا بھرپور مظاہرہ کیا جس کے باعث گاندھی جی کو گرفتار کرلیا گیا اور انڈین نیشنل کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا گیا۔ حالات مابعد میں افہام وتفہیم کے مراحل طے کرنے کے بعد

دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی نے شرکت کی لیکن 1932 کی مذکورہ تیسری کانفرنس میں بھی کانگریس نے شرکت سے انکار کر دیا۔ اگلے سال برطانوی حکومت نے ایک قرطاس ابیض شائع کیا جس میں 1935 کا حکومت ہند ایکٹ نافذ کیا گیا جس کی رُو سے ہندوستان میں فیڈرل دستور کے قیام کی تجویز پیش ہوئی لیکن ایوانِ رؤسا اور مسلم لیگ کی مخالفت نے اس وفاقی دستور کو جنم لینے سے قبل ہی دفنا دیا۔ 1936-42 میں وفاقی دستور کی دفعات کو رد کرتے ہوئے کانگریس نے صوبہ جاتی انتخابات میں حصّہ لے کر ہندوستان کے چھ صوبوں اور بعد میں کل آٹھ صوبوں میں بھاری ووٹوں سے اپنی حکومتیں بنالیں۔ 1937-1939 تک کانگریس ان صوبوں میں برسر اقتدار رہی لیکن اِسی اثنا میں دوسری عالمی جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ مسٹر محمد علی جناح کے دو قومی نظریے نے مسلم لیگ اور کانگریس ہی میں اختلافات پیدا نہیں کئے بلکہ ملک میں ہندو مسلم کشیدگی کے معمولی سلسلے بھی شروع ہو گئے۔ 1941 میں جاپان بھی اس عالمی جنگ کے میدان میں کود پڑا۔ اور کانگریس نے ہندوستان کو شرکائے جنگ میں شامل کر لینے پر برطانوی حکومت سے پرزور احتجاج کیا۔ اس وقت برطانیہ کے مقبوضات آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ سے نکلتے جارہے تھے۔ تقریباً پورے جنوب مشرقی علاقہ کو فتح کرنے کے بعد محوری طاقتیں (اٹلی، جرمنی، جاپان) ہندوستان کا رُخ کر رہی تھیں۔ برطانوی سلطنت کا سنگھاسن ڈانواڈول نظر آیا تو برطانیہ نے مارچ 1942 میں کرپس مشن کو ہندوستانی سیاسی رہبروں سے مذاکرات کے لئے تعینات کیا۔ لیکن کرپس مشن کی سفارشات مسلم لیگ نے بھی قبول نہیں کیں چونکہ 1940 کے لاہور لیگ سیشن میں پاکستان کے حصول کو اپنا مطمحِ نظر بنا چکی تھی۔

حالات مذکورہ کے تحت 1942 میں بمبئی 7-8 اگست کو کانگریس کا وہ مشہور اجلاس منعقد ہوا جس نے "ہندوستان چھوڑو" تجویز کو بھاری اکثریت سے پاس کرا دیا۔ یہ ریزولیوشن آزادی کی سنگلاخ شاہراہوں پر ایک سنگِ میل ہی نہ تھا بلکہ اِسے آزادیٔ ہند کا بنیادی ستون کہنا حق بجانب ہوگا۔

نویں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما 25 جولائی کو صدارتی عہدہ سنبھالنے کے بعد جو مختصر تقریر کی اس میں بھی 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کی پچاسویں گولڈن جُبلی منائے جانے کی جانب واضح اشارہ کیا۔

بہر نوع کرپس مشن جو 12 مارچ 1942 میں آزادی کی جانب اپنی تجاویز لے کر آیا لیکن ناکام واپس لوٹا تو وردھا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی طلب کی گئی جس میں برطانیہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ہندوستان کو فوراً آزاد کر دے۔ اس فیصلے پر مزید غور و فکر کے لئے بمبئی میں 7 اور 8 اگست 1942 کو کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا جس نے وردھا تجویز کی توثیق کی۔

وردھا میں ہوئے مذاکرات کی بھنک جب ہندوستان کے فدائیوں اور آزادی کے شیدائیوں کے کانوں تک پہنچی تو وہ جوق در جوق بمبئی کے اجلاس میں شرکت کے لئے دوڑ پڑے اور آزادی کے متوالوں کا جم غفیر بمبئی پہنچ گیا

اس دو روزہ اجلاس میں کانگریس نے ہندوستان چھوڑو کا تاریخ ساز ریزولیوشن بھاری اکثریت سے پاس کیا۔ اجلاس میں کل تیرہ ممبران نے اِس تجویز کی مخالفت کی اور تین ترامیم بھی پیش کیں جنھیں طاقِ نسیاں میں رکھ دیا گیا۔ گاندھی جی نے تقریباً ستر منٹ تقریر کی جس نے لاکھوں کے مجمع میں جوش و خروش پیدا کیا۔ انھوں نے "کرو یا مرو" کا نعرہ لگایا جو سارے ہندوستان کی فضاؤں میں گونج اُٹھا۔ برطانوی سرکار نے

> نیتاجی سبھاش چندر بوس اپنے ضمیر کی آواز اور چند بے لوث مجاہدینِ آزادی کے مشورے سے ہندوستان چھوڑ کر دیگر ممالک میں ہندوستانی آزادی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے افغانستان، برما، روس، جرمنی، جاپان وغیرہ کے دورے پر نکل پڑے۔ دریں اثنا انھوں نے انگریزی افواج سے لوہا لینے کے لیے آزاد ہند فوج بنائی جس نے برطانوی ایوانِ سیاست میں ہلچل مچادی۔ وزیر اعظم چرچل اور ان کے ساتھیوں کی نیندیں حرام کر دیں۔

عوام کے دم خم کا اندازہ لگا کر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تقریباً سب ہی ممبران کو 9 اگست کو علی الصبح گرفتار کرا لیا۔ گاندھی جی کو آغا خاں کے محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ نہرو اور مولانا آزاد وغیرہ کو احمد نگر جیل میں مقید کر دیا گیا۔ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کے اشاروں پر چند پرجوش اور جواں سال ممبران روپوش ہو گئے۔ وہ ارونا آصف علی، جے پرکاش نرائن، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، راما نند مسرا، مدھو لمئے وغیرہ تھے جنھوں نے روپوش ہو کر آزادی کی تحریک کو ہوا دی، جگہ جگہ مظاہرے کرائے ریلوں کی پٹریاں اور پل توڑے اور دیگر ایسی کارروائیاں کیں جنھوں نے انگریز انتظامیہ میں رکاوٹیں اور شدید دراڑیں پیدا کر دیں۔ ان گرفتاریوں نے 9 اگست 1942 سے ملک بھر میں ہنگامے برپا کر دیے۔ کانگریس کو غیر قانونی پارٹی قرار دیا گیا۔ برطانوی سرکار کے اعداد و شمار کے مطابق 1028 ہندوستانی شہید ہوئے اور 3214 زخمی، حکومت برطانیہ اصل اعداد و شمار چھپاتے میں بدنام ہو چکی تھی۔ غیر سرکاری اور چشم دید شہادتوں کے مطابق کئی ہزار ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی مارے گئے تھے۔ لاکھوں کو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ مشہور انقلابی لیڈر رام پرشاد بسمل کا یہ شعر

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

عوام کی زبانوں سے اُچھل کر فضاؤں میں گونجنے لگا۔ ہندوستانی عوام کی قربانیوں سے چین کے چیانگ کائی شیک، اُن کی رفیقۂ حیات مادام چیانگ کائی شیک اور صدر امریکہ روزویلٹ نے انگلستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھارت کو آزاد کر دیں۔ علاوہ ازیں بہت سے روپوش لیڈر جب گرفتار کر لئے گئے اور انگلستان سے کئی مشن آزادی کی بابت مذاکرات کے لئے پے در پے ہندوستان آئے تو یہ تحریک تو دو ماہ کے بعد ختم ہو گئی۔ لیکن ہندوستان کی مکمل آزادی کی بنیادیں استوار کر گئی۔

نیتاجی سبھاش چندر بوس اپنے ضمیر کی آواز اور چند بے لوث مجاہدینِ آزادی کے مشورے سے ہندوستان چھوڑ کر دیگر ممالک میں ہندوستانی آزادی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے افغانستان، برما، روس، جرمنی، جاپان وغیرہ کے دورے پر نکل پڑے۔ دریں اثنا انھوں نے انگریزی افواج سے لوہا لینے کے لئے آزاد ہند فوج بنائی جس نے برطانوی ایوانِ سیاست میں ہلچل مچا دی، وزیر اعظم انگلستان ونسٹن چرچل، ان کے ساتھیوں اور حلیفوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ ساری دنیا (بشمول چین، امریکہ، روس) کی ہمدردیاں غلام ہندوستان اور اس کی آزادی کے متوالوں کے ساتھ ہو گئیں

8 اگست کو برطانوی تسلّط کے خلاف جو ریزولیوشن پاس کیا گیا اس کا متن اور لہجہ انگریز سامراج مخالف تھا لیکن اُس میں یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ تحریک اہنساکی بنیادوں پر چلائی جاتے اور ہر ہندوستانی مقدور بھر کوشش کرے کہ ہندوستان غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ ریزولیوشن برطانیہ کے مشہور میگنا کارٹا سے بھی زیادہ اہم تھا اور اس میں بیان کئے گئے طریقۂ کار پر سارا ملک ہی عمل پیرا ہو گیا۔

فی الحقیقت 1942 کی اس "ہندوستان چھوڑو" تحریک نے ہی ہندوستانی عوام کے دلوں میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کیا جس کے باعث پانچ سال بعد 15 اگست 1947 کو دہلی کے لال قلعہ پر آزادی کا پرچم لہرا دیا گیا اور آزاد ہندوستان دنیا کے نقشے پر ایسی روشن تحریروں سے اُبھرا جن میں لاکھوں ہندوستانیوں کی قربانیاں اور خونِ جگر شامل ہیں۔

غلامی سے آزادی تک

پروفیسر ظفر احمد نظامی

عالمی تاریخ میں حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی قومی تحریک کی داستان ایک نئے اور شاندار باب کا اضافہ کرتی ہے جو دوسرے ملکوں کی تحریکوں سے قطعی مختلف ہے ہندوستان کی خوشحالی اور اس کی بے پناہ دولت کے چرچے جب سمندر پار ہونے لگے تو سترہویں صدی کے اوائل میں انگلستان اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھے جانے کے بعد ہندوستان کے ساتھ تجارت کے منصوبے بھی بنائے جانے لگے جنھیں مغل بادشاہ جہاں گیر نے عملی جامہ پہنانے کی اجازت دے کر انگریز تاجروں کے حوصلے بڑھا دیئے۔ ہندوستانیوں کی فراخدلی نے برطانوی گورنر جنرل کلائیو کو جلد ہی محسوس کرا دیا کہ انگریز نہ صرف ہندوستان کی دولت کو اپنے وطن میں منتقل کر سکتے ہیں بلکہ وہ یہاں کے علاقوں پر بھی قابض ہو سکتے ہیں ——— اسی لیے انھوں نے جنگ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا اور 1757 میں پلاسی کی جنگ میں فتح نے تو ان کو باقاعدہ ہندوستان کے بعض حصوں کا حکمراں بنا دیا مگر بقول رمیزے مور "پلاسی کی جنگ کے بعد بھی نہ تو انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں اور نہ ہی ہندوستان میں ان کے نمائندوں کو ذرا بھی گمان گزرا کہ انھوں نے یہاں ایک عظیم سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھ دیا تھا۔" درحقیقت انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ہندوستانیوں کی معصومیت سے فائدہ اٹھایا جن میں اتحاد کا فقدان تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے حکمرانوں سے رعایتیں حاصل کیں، اپنے لیے سہولیات فراہم کیں، مقامی حکمرانوں کو آپس میں لڑوایا، نئے نئے قوانین وضع کر کے ان کی جاگیروں کو ضبط کیا، ان کا اقتصادی اور سماجی استحصال کیا اور اپنی سیاسی قوت کو مجتمع کر کے اس کا استحکام کیا۔

اگرچہ انگریز اپنی پالیسیوں سے ہندوستان پر قابض ہوتے گئے مگر 1757 سے 1857 تک کہیں نہ کہیں ان کے خلاف شورشوں کا سلسلہ ضرور جاری رہا۔ دراصل بنگال میں سنیاسیوں اور فقیروں کی بغاوت (1763 سے 1800)، چھوٹا ناگپور میں چواروں کی شورش (1767 - 1809)، ترنول ویلی میں کتابومن کی بغاوت (1792 - 1799)، اڑیسہ میں پائیکوں کی شورش (1804 - 1817)، ٹراونکور میں دیوان ولیو تھمبی کی بغاوت (1808 - 1809)، علی گڑھ میں تعلقداروں کی بغاوت (1814 - 1817)، ہریانہ میں جاٹوں کا ہنگامہ (1809 - 1824)، خاندیش میں بھیلوں کی شورش (1818 - 1831)، بیلگام میں کتور کی بغاوت (1824 - 1829)، ساگر اور دموہ میں بندیلوں کے ہنگامے (1842) کولہاپور میں گڈکری کی بغاوت (1844) راج محل کی پہاڑیوں میں سنتالوں کی بغاوتیں انھیں سلسلوں کی مختلف کڑیاں تھیں۔ تاہم ان میں سے کسی کو بھی قومی جنگِ آزادی کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کا دائرہ بہت محدود تھا اور ان میں تسلسل بھی نہیں تھا مگر انیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے اختتام سے تین سال پہلے ہی یہ تمام چنگاریاں ملک گیر شعلوں میں ڈھل گئیں۔

دس مئی 1857 کو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جب میرٹھ چھاؤنی فوج کے سپاہیوں نے گائے اور سور کی چربی سے بنے ہوئے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور انگریز افسروں کے خلاف بغاوت کر کے دوسرے دن دلی پہنچ کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اس کی خلوتوں سے نکال کر جلوت میں لا کھڑا کیا اور اسے شہنشاہِ ہندوستان بنا دیا۔ بغاوت کی اس چنگاری نے پورے ملک میں آگ لگا دی اور شمال میں پنجاب سے لے کر جنوب میں نربدا تک اور مشرق میں بہار سے لے کر مغرب میں گجرات تک سبھی علاقے اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ دلی کے واقعات کو نصیر آباد، بریلی، کان پور، جھانسی، لکھنؤ اور آرہ میں دہرایا گیا جہاں خان بہادر خان، مولوی فیض آبادی، نانا صاحب، تاتیا ٹوپے، بیگم حضرت محل، لکشمی بائی اور کنور سنگھ جیسی شخصیتوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے ——— مگر جدید اسلحہ جات کے استعمال، باضابطہ فوج، باقاعدہ منصوبہ بندی نے انگریزوں کو فتحیاب کر کے ہندوستانیوں کو پسپا کر دیا ——— اور ہندوستان کو کمپنی کی عملداری میں سے نکال کر براہِ راست ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت کا حصہ بنا دیا۔

اگرچہ ہندوستانیوں کی پہلی جنگ آزادی ناکام ہو گئی،



مگر اس کے نتائج دوررس ثابت ہوئے۔ اس نے ہندوستانی عوام کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کردی۔ اور ان کے اندر قوم پروری کا وہ جذبہ بیدار کردیا جس نے ان کی آنے والی نسلوں کو بھی آزادی کا سپاہی بنا دیا۔ اس جنگ کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد رقمطراز ہیں کہ "اس دور کے دو اہم حقائق واضح طور پر ابھر کر سامنے آئے ہیں اول یہ کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندر اتحاد کا شدید احساس بیدار ہوا اور دوم یہ کہ مغل بادشاہ کے تئیں ہندوستان کے لوگوں میں سچی وفاداری کا جذبہ جاگا ــــــ" یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دونوں فرقوں نے ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کیا اور مغل بادشاہ پر جان نثار کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مسلمانوں نے گائے کی قربانی ترک کردی اور ہندوؤں نے ان کے تحفظ کی ضمانت لی۔ اسی طرح دونوں فرقوں کے افراد نے ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کے تحفظ کا ذمہ لیا۔ بقول سرسید احمد خاں "چودھری بدھ سنگھ نے ہلدور کی مسجد کا تحفظ کیا تو احمد اللہ خاں نے گڑھی کے مندر کو نقصان پہنچانے والوں کا سامنا کیا"۔ ــــــ تاہم تاریخ کا یہ افسوسناک پہلو ہے کہ ہندوستانیوں کی یہ جنگ روپیہ کی کمی، ناقص منصوبہ بندی، بدانتظامی اور مختلف جگہوں پر قیادت کے فقدان کے سبب ناکام ہوگئی۔

سن ستاون کی ناکامی نے انگریزوں کے خلاف عوام کی قیادت کو روایتی جاگیردارانہ طبقات سے نکال کر انگریزی داں ہندوستانیوں میں منتقل کردیا۔ مغربی تعلیم سے آراستہ یہ ہندوستانی طبقہ آزادی، مساوات، قوم پروری اور آئینی خود مختاری کے مفہوم سے واقف تھا۔ اس نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے اثرات کے تحت لوگوں کو نئے طریقے سے منظم کرنے کی کوشش کی کیونکہ اس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ سامراجی طاقت کے خلاف تشدد پر مبنی جدوجہد میں کامیابی کا حصول ممکن نہ تھا اس لیے ضرورت تھی کہ رائے عامہ کو ہندوستانیوں کے حق میں ہموار کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مختلف مقامات پر مختلف انجمنوں کا قیام عمل میں لایا گیا اور لندن میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن، پونا میں سارو جنک سبھا، کلکتہ میں انڈین ایسوسی ایشن، مدراس میں مہاجن سبھا اور بمبئی میں پریسیڈنسی ایسوسی ایشن جیسی تنظیمیں وجود میں آگئیں۔ ان انجمنوں کے ذریعے قوم پروری کے خیالات کو فروغ دیا گیا، لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرکے مسائل پر غور کیا گیا اور عوام میں حب الوطنی کے جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی تاہم یہ انجمنیں محض مقامی تھیں اور ان کا دائرۂ کار بھی محدود تھا۔ اس لیے ان میں سے کسی تنظیم کو قومی انجمن کے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے نئے قائدوں نے ایک برطانوی پنشن یافتہ آفیسر اے. او. ہیوم کی مدد سے ایک قومی تنظیم کی بنیاد رکھی جسے انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے پکارا گیا۔ اس انجمن کا پہلا اجلاس 28 دسمبر 1885ء کو بمبئی میں منعقد ہوا جس میں ملک کے مختلف گوشوں سے نمائندوں نے شرکت کی اور اسے ایک قومی انجمن بنادیا ــــــ اس انجمن کو برطانوی حکومت کی حمایت بھی حاصل تھی جو اسے حزب مخالف کے طور پر استعمال کرکے ہندوستانیوں کے مسائل سے واقف ہونا چاہتی تھی تاکہ وہ ان کا سدباب کرسکے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزوں نے ہمیشہ ہندوستان میں "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے اصول پر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ انگلستان اور ہندوستان، دونوں ہی ملکوں میں انگریز استاد اور رہنما اس امر کی تبلیغ اور تشہیر کرتے رہتے تھے کہ



تانتیا ٹوپے

ہندوستانیوں کو ایک قوم کے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ قومیتوں کا مجموعہ تھے مگر جب کانگریس کا اولین اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا تو انگلستان کے اخبارات



ناناصاحب

نے بھی اس خبر کو شائع کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ہندوستانی عوام نے ایک قوم کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

1880 میں کانگریس کے آغاز سے 1947 میں حصولِ آزادی تک کے زمانے کو کانگریس یا آزادی کی تحریک کے دور سے تعبیر کرتے ہوئے اس پورے عہد کو تین حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے اس میں پہلا دور 1880 سے 1905 پر محیط ہے جسے اعتدال پسندوں کے دور سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا دور 1905 سے 1918 تک جاری رہا جسے انتہاپسندوں کے عہد کے نام سے پکارا جاتا ہے اور تیسرے دور کو مہاتما گاندھی کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کانگریس کا پہلا دور اس کے اولین اکیس برسوں پر مشتمل ہے جب اس کی قیادت اعتدال پسندوں کے ہاتھوں میں رہی جن میں دادا بھائی نوروجی، بدرالدین طیب جی، ومیش چندر بنیرجی، فیروز شاہ مہتہ، رحمت اللہ سیانی، دنشا ایدل جی واچا، سریندر ناتھ بنیرجی، مدن موہن مالویہ اور گوپال کرشن گوکھلے کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تمام رہنما آزاد خیال سیاستداں تھے۔ جو نہ صرف مغربی تعلیم سے آراستہ تھے بلکہ مغربی آدرشوں میں بھی یقین رکھتے تھے اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے آئینی احتجاج کے حامی تھے۔ وہ ہر سال کانگریس کے اجلاس منعقد کرتے تھے اور سیاسی، اقتصادی اور انتظامی مسائل پر بحث کرنے کے بعد ان سے عوام کو روشناس کراتے تھے۔ وہ قانون ساز کونسلوں کی وسعت، عاملہ سے عدلیہ کی علاحدگی، ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی شمولیت، پولیس اور انتظامی امور میں اصلاحات، اخراجات میں کمی کے خواہاں تھے اور ہندوستان کی دولت کو انگلستان میں منتقل کیے جانے کے مخالف تھے۔ وہ ہر سال کانگریس کی جانب سے تجاویز پاس کرتے انھیں انگریز حکمرانوں تک پہنچا دیتے تھے اور بعض اوقات وفد کی شکل میں ان کی خدمت میں حاضری بھی دیا کرتے تھے۔ انھوں نے انگلستان میں بھی اپنے ہمنوا پیدا کرلیے تھے جو وہاں اُن کے کاز کی حمایت کرتے رہتے تھے۔ دراصل اعتدال پسند رہنما انگریزوں کے جذبۂ عدل اور برطانوی سیاسی نظریات میں یقین رکھتے تھے۔ اُنھیں کی کوششوں سے 1892 کا ایکٹ پاس ہوا اور مالیات سے متعلق اصلاحات کے لیے ویلبی کمیشن کا قیام عمل میں آیا ــــــ مگر انگی پالیسیوں سے کانگریس ہی کے ایک دوسرے گروہ کو اختلاف تھا جسے انتہاپسندوں کے نام سے پکارا گیا۔

اعتدال پسندوں کے خلاف کانگریس انتہاپسندوں نے جو محاذ بنایا وہ کافی موثر ثابت ہوا۔ اگرچہ ان دونوں گروہوں کے اختلافات 1905 تک کانگریس کا داخلی معاملہ بناکر پیش کیے جاتے رہے مگر اُنھیں زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہیں رکھا جاسکا۔ اگرچہ اعتدال پسند آئینی احتجاج کے حامی تھے اور اپنے مطالبات کو پُرامن طریقے سے منوانا چاہتے تھے مگر جب وہ چند اصلاحات سے آگے نہ جاسکے تو انتہاپسندوں نے ان کے ہاتھوں سے قیادت چھین لینے کی کوشش کی۔ دراصل انتہاپسندوں کی مقبولیت اور ان کے عروج کا سہرا خود انگریز حکمرانوں کے سر ہے جنھوں نے ہندوستان کا سیاسی، معاشی، سماجی اور تعلیمی استحصال کیا اور ایسی پالیسیاں وضع کیں جن کے سبب

ہندوستان کے عوام برگشتہ ہو گئے۔ پچھلی صدی کے اواخر میں لارڈ کرزن نے وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان میں قدم رکھا تو کانگریس کی مقبولیت میں خاصہ اضافہ ہو چکا تھا جو یقیناً برطانوی حکمرانوں کے لیے کسی چیلنج سے کم نہ تھا۔ لہٰذا کرزن نے کانگریس دشمن رویہ اختیار کیا اور انتظامی سہولت کے نام پر 1905 میں بنگال کو دو حصوں میں منقسم کر دیا اس کے نتیجے میں مشرقی بنگال میں مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا اور ہندو مسلم اتحاد مجروح ہو گیا۔ کرزن کی اس پالیسی کے خلاف ایک مؤثر تحریک نے جنم لیا جس کی قیادت انتہا پسندوں نے کی۔ لیکن اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیاں اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی یہاں تک کہ 1906 میں جب کلکتہ میں منعقد ہونے والے کانگریس کے اجلاس کی صدارت کے سلسلے میں دونوں گروہوں میں اتفاق نہ ہو سکا۔ تو لندن سے دادا بھائی نوروجی کو مدعو کر کے ان کی صدارت میں اجلاس کا انعقاد کرنا پڑا مگر ان اختلافات کو زیادہ عرصہ تک ٹالا نہیں جا سکا یہی وجہ ہے کہ اگلے برس جب سورت میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو اس میں اس قدر ہنگامہ ہوا کہ اعتدال پسندوں نے اپنے آئین میں تبدیلی کر کے انتہا پسندوں کو کانگریس کی رکنیت سے محروم کر دیا تاہم 1916 میں انھیں دوبارہ کانگریس میں شامل کر لیا گیا۔

انتہا پسند ابتدا ہی سے برطانوی سامراجی حکومت کے مخالف تھے۔ وہ اعتدال پسندوں کی "بھیک مانگنے" کی پالیسی سے متفق نہیں تھے ملک میں سوراج کے قیام کو وہ اپنا حق تصور کرتے تھے اور اصلاحات سے قطعی مطمئن نہ تھے۔ وہ ملک میں قومی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے غیر ملکی اشیا کا بائیکاٹ کرنے اور سودیشی کے استعمال کی وکالت کی۔ انھیں اپنے وطن کے ماضی پر ناز تھا اور وہ اس کے مستقبل میں مکمل یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریک کے لیے درمیانی طبقے، طلبا، نوجوان اور خواتین کی حمایت حاصل کی ——— لالہ لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک اور بپن چندر پال ان کے رہنماؤں میں بڑی اہمیت کے حامل رہے۔ انگریزی حکومت ان سے خائف رہا کرتی تھی اسی لیے اس نے انھیں قید و بند کی صعوبتوں کے لیے اپنا ہدف بنایا۔ اگرچہ 1916 میں لکھنؤ کے کانگریس اجلاس میں دونوں گروہوں کا اتحاد عمل میں آگیا تھا۔ تاہم جلد ہی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے سلسلے میں دونوں کے درمیان پھر اختلافات ابھر آئے اور اعتدال پسندوں نے ہمیشہ کے لیے کانگریس کو خیرباد کہتے ہوئے انڈین نیشنل لبرل فیڈریشن کے نام سے اپنی علاحدہ انجمن قائم کر لی۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں اپنے استحکام کے لیے جن پالیسیوں کا سہارا لیا اِن میں مختلف فرقوں کے درمیان خلیج پیدا کر کے منافرت کو ہوا دینے کی کوشش بھی شامل تھی۔ اسی پالیسی کے تحت اس نے بنگال کو تقسیم کیا اور کرزن نے کانگریس کو ختم کرنے کی کوشش کی اگرچہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم اس کا جانشین یعنی لارڈ منٹو اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامران رہا۔ اس نے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے کچھ مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد 1906 میں شملہ میں طلب کر کے ان سے فرقہ وارانہ انتخابات کا مطالبہ کروایا جس نے 1909 میں قانون کی شکل اختیار کر لی۔ اسی کے ساتھ 1906 میں جبکہ کلکتہ میں کانگریس کا بائیسواں اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ حکومت کے ایما پر ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مسلمانوں کو کانگریس کی سیاست سے الگ کرنا تھا تاکہ انھیں ایک متوازی تحریک کے لیے تیار کیا جا سکے۔ اسی لیے کچھ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہندوستان میں دو متوازی تحریکیں وجود میں آگئیں جو ایک دوسرے کی مخالف تھیں ——— لیگ کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی جبکہ کانگریس ایک باغی جماعت کی حیثیت سے شہرت یافتہ ہوئی۔ لیگ نے فرقہ وارانہ سیاست کو فروغ دیا جبکہ کانگریس نے متحدہ قومیت کی بنیاد پر



چندر شیکھر آزاد

آزادی کے نقیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی۔ اگرچہ مسلم لیگ کو حکومت کے حلیف کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا اور اس نے 1909 میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر انتخابات کا مطالبہ منوالیا تھا تاہم حکومت کے ساتھ اس کی یہ رفاقت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ اس کی داخلی اور خارجی دو وجوہات تھیں۔

اس کا داخلی سبب تو بنگال کی تقسیم و تنسیخ تھی جس کا اعلان 1911 میں خود شاہِ انگلستان کو ہندوستان آکر کرنا پڑا۔ جس کا مطالبہ 1905 سے کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ کی قیادت حکومت سے بدظن ہو گئی۔ اس کی خارجی وجہ یہ تھی کہ دولتِ عثمانیہ کے تئیں برطانوی حکومت کا رویہ سخت ہو گیا تھا اور ترکی کو جو مرکزِ خلافت تھا اسے 1912 میں ہونے والی جنگ بلقان میں خاصہ نقصان اٹھانا پڑا۔ کیونکہ لیبیا پر اٹلی کے حملے کے بعد برطانوی حکومت نے ترکی کی افواج کو مصر کی راہ سے گزرنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ انجام کار ہندوستان کے مسلمان حکومت کے مخالف ہو گئے۔ دراصل ان پر مولانا آزاد کے "الہلال" مولانا محمد علی کے "کامریڈ" ظفر علی خاں کے "زمیندار" میں چھپنے والے مضامین کا گہرا اثر تھا جس نے مسلم لیگ کو کانگریس سے قریب تر کر دیا۔ دونوں جماعتوں میں باہمی مفاہمت کے لیے فضا ہموار ہو گئی اور دونوں کے اجلاس ایک ہی مقام پر منعقد کیے جانے لگے جن میں دونوں ہی جماعتوں کے نمائندے شریک ہونے لگے۔ اس مفاہمت نے 1916 میں مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین ایک میثاق کی شکل اختیار کر لی۔

1914 میں پہلی عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تو اس میں ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا اس لیے

جب جرمنی اور ترکی کو شکست ہو گئی اور اتحادی طاقتوں نے ترکی کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہندوستان کے مسلمان لرز اُٹھے۔ کیونکہ ترکی کا سلطان عالمِ اسلام کا خلیفہ تھا لہٰذا اتحادیوں کے اس منصوبے کے خلاف ہندوستان میں تحریکِ خلافت کا آغاز کیا گیا جس کی رہنمائی کے لیے موہن داس کرم چند گاندھی نے پہل کی اور اسے ایک قومی تحریک کی شکل دے دی۔ گاندھی جی کچھ سال پیشتر ہی جنوبی افریقہ سے واپس ہوئے تھے جہاں انھوں نے سفید حکمرانوں کے خلاف سیاہ فام افریقیوں کی تحریک کی قیادت کی تھی... ہندوستان واپس ہونے پر انھوں نے برطانوی حکومت کی حمایت میں ہندوستانیوں کو تیار کیا تاکہ اتحادی طاقتیں جنگ میں سرخرو ہوں تاکہ جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو آزادی کی منزل سے قریب کر سکے۔ لیکن گاندھی جی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کیونکہ برطانوی حکومت نے رولٹ ایکٹ پاس کر کے ان



ویمن چندر پاٹل

کی امیدوں پر پانی پھیر دیا جس کے تحت کسی بھی ہندوستانی کو گرفتار کر کے غیر معینہ مدت کے لیے جیل میں ڈالا جا سکتا تھا۔ گاندھی جی نے اس قانون کے خلاف ایک ملک گیر تحریک کا آغاز کیا اس سے قبل گاندھی جی چمپارن (بہار) میں ستیہ گرہ کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں لوگوں کو پولیس کی گولیوں کا شکار ہونا پڑا۔ اِس سلسلے میں سب سے اہم واقعہ امرت سر میں اس وقت گزرا جب حکومت نے پنجاب کے دو نامور رہنماؤں یعنی ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا اور اس گرفتاری کے خلاف آواز بلند کرنے والے نہتے ہندوستانیوں کو جلیان والا باغ کے احاطہ میں گولیوں سے بھون ڈالا۔

ہندوستان کے سیاسی اُفق پر گاندھی جی کے نمودار ہوتے

ہی کانگریس اپنے تیسرے دور میں داخل ہو گئی جسے مہاتما گاندھی کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے دورِ قیادت میں گاندھی جی نے ملک کو آزادی سے ہمکنار کرنے کی غرض سے کئی تحریکیں چلائیں۔ 1920 میں انھوں نے خلافت اور عدم تعاون کی تحریکات کا آغاز کیا۔ ان تحریکوں میں حصہ لینے والوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ حکومت کے عطا کردہ خطابات کو واپس کر دیں، حکومت کی جانب سے منعقدہ کسی جلسے میں شرکت نہ کریں، وکیل سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ کریں، طلبا حکومت کی سرپرستی میں چلنے والے تعلیمی اداروں سے باہر نکل آئیں۔ سپاہی فوج کی ملازمت ترک کر دیں، ووٹر کونسلوں کے انتخابات میں حصہ نہ لیں سودیشی کا استعمال کریں اور بدیسی اشیا کا بائیکاٹ کریں۔ یہ پورا پروگرام کانگریس نے منظور کر کے قوم کے سامنے پیش کیا تو عدالتوں کی جگہ پنچایتیں قائم ہو گئیں، سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی جگہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، کاشی ودیاپیٹھ، گجرات ودیاپیٹھ جیسے قومی تعلیمی اداروں نے لے لی، انگریزی خطابات کے بدلے قوم نے اپنے رہنماؤں کو قومی خطابات کے بدلے قوم نے اپنے رہنماؤں کو قومی خطابات سے نوازا ــــ یہ پوری تحریک عدم تشدد پر مبنی تھی اسی لیے جب 1922 میں چوری چورا کے مقام پر تشدد کا ایک واقعہ رونما ہوا تو گاندھی جی نے تحریک کو واپس لے لیا۔

اس کے بعد گاندھی جی کی قیادت میں کئی تحریکوں نے جنم لیا جن میں 1930 میں نمک ستیہ گرہ، 1932 میں تحریک سول نافرمانی، 1940 میں انفرادی ستیہ گرہ اور 1942 میں 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان میں سے سبھی تحریکوں کے نتیجے میں لاکھوں ہندوستانیوں نے جیل کی ہوا کھائی اور تمام رہنماؤں کو قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑی۔ 1920 سے 1947 تک کا پورا دور بڑے ہنگاموں، حادثوں اور واقعات کا دور رہا ہے۔ اسی دور میں گاندھی جی نے سماجی تحریکیں چلائیں جن کا مقصد شراب بندی، خواتین کی حیثیت میں اضافہ، دیہی صنعتوں کا

گوپال کرشن گوکھلے

ارتقا، چھوت چھات کا خاتمہ تھا۔ 1912 میں احمد آباد کانگریس کے اجلاس میں حکیم اجمل خاں کی صدارت میں مولانا حسرت موہانی نے آزادیٔ کامل کی تجویز پیش کی۔ جسے بعد ازاں 1929 کے لاہور کانگریس کے اجلاس میں جواہر لال نہرو کی صدارت میں منظور کیا گیا۔ 1927 میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ 1930 میں چھبیس جنوری کو یومِ آزادی منایا گیا۔ جس نے سالانہ تقریب کی حیثیت حاصل کر لی۔ مہاتما گاندھی نے وائسرائے لارڈ اروِن سے مذاکرات کیے اور لندن میں منعقدہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی اسی طرح 1935 کے ایکٹ کے تحت کانگریس نے سات صوبوں میں انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے کے بعد حکومت سازی کی مگر برطانوی سامراجی حکومت نے ہندوستان کو اس کے رہنماؤں سے مشورہ کیے بغیر جب دوسری عالمگیر جنگ میں جھونکنے کا اعلان کر دیا تو کانگریسی حکومتیں احتجاجاً مستعفی ہو گئیں۔

یہ دور تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی زمانے میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں خلافت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جس سے مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علما کو شدید صدمہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلافات ابھرنے لگے۔ نہرو رپورٹ کے کچھ حصوں سے مسلم لیگ کو اختلاف تھا جو محمد علی جناح کے زیرِ اثر تھی۔ محمد علی جناح دادا بھائی نوروجی کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ انھوں نے بال گنگا تلک کے مقدمے کی پیروی کی تھی۔ مسلم لیگ کو کانگریس سے قریب تر کرنے میں ان کا بھی ہاتھ تھا مگر 1920 میں انھوں نے کانگریس کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے ہمیشہ کے لیے اسے خیرباد کہہ دیا اور خود کو مسلم لیگ کے حصار میں محصور کر لیا۔ بعد ازاں وہ انگلستان چلے گئے اور وہیں وکالت کرنے لگے مگر موجودہ صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں لیاقت علی خاں اور فضل المتین چودھری کے اصرار پر ہندوستان واپس آکر وہ مسلم لیگ کے رہنما کی حیثیت سے فرقہ وارانہ سیاست سے وابستہ ہو گئے اور جب مارچ 1940 میں مولانا ابوالکلام آزاد رام گڑھ کانگریس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے متحدہ قومیت کی وکالت کر رہے تھے تو اسی دوران لیگ نے اپنے لاہور اجلاس میں دو قومی نظریے کے تحت 'تقسیمِ ہند' کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اس طرح ایک طرف جہاں کانگریسی رہنما آزادیٔ کامل کا مطالبہ کر رہے تھے وہیں دوسری طرف لیگ تقسیمِ وطن کے درپے تھی۔ جہاں ایک طرف کانگریس برطانوی وزیر کرپس سے ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مذاکرات کر رہی تھی وہیں مسلم لیگ پاکستان کے قیام پر اصرار کرنے لگی۔

9 اگست 1942 کو بمبئی میں مولانا آزاد کی صدارت میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑو" کا نعرہ بلند کیا تو اس کے سبھی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مہاتما گاندھی کو پونا کے آغا پیلیس میں نظربند کر دیا گیا جہاں ان کی شریکِ حیات کستوربا گاندھی اور ان کے رفیق کار مہادیو دیسائی نے دم توڑ دیا۔ مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، آصف علی سید محمود اور کانگریس کی مجلسِ عاملہ کے دوسرے اراکین کو احمد نگر کے تاریخی قلعہ میں محبوس کر دیا گیا ــــ ان رہنماؤں کی عدم موجودگی میں ہندوستان کے تمام حصوں میں

یہ دور تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی زمانے میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں خلافت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جس سے مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علما کو شدید صدمہ ہوا اس کے نتیجے میں مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلافات ابھرنے لگے۔ نہرو رپورٹ کے کچھ حصوں سے مسلم لیگ کو اختلاف تھا جو محمد علی جناح کے زیر اثر تھی۔

9 اگست 1942 کو بمبئی میں مولانا آزاد کی صدارت میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑو" کا نعرہ بلند کیا تو اس کے سبھی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔

لالہ لاجپت رائے

محمد علی جناح دادا بھائی نوروجی کے سکریٹری رہ چکے تھے۔

لوگوں نے غم و غصّے کا اظہار کرتے ہوئے تشدد کا مظاہرہ کیا ـــــــ انجام کار 1940 میں تمام رہنماؤں کو رہا کردیا گیا تاکہ وہ جنگ کے اختتامی دور میں ہندوستان کی آزادی سے متعلق مسئلہ کانفرنس میں حصہ لے سکیں مگر یہ کانفرنس ناکام ہوگئی کیونکہ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرانے پر اصرار کیا۔



ومیش چندر بنرجی

انگلستان میں لیبر پارٹی کے برسرِاقتدار آتے ہی وزیراعظم ایٹلی نے ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے برطانوی وزراء کا ایک سہ رکنی وفد ہندوستان بھیجا۔ اس کی سفارشات کے تحت 1946 کے ستمبر میں جواہر لال نہرو کی قیادت میں ایک عبوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

جبکہ کانگریس کی سربراہی پچھلے چھ برسوں سے مولانا آزاد کرتے آئے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے کانگریس مخالف رویہ اپنانے کے سلسلے میں مسلم لیگ کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

انگلستان میں لیبر پارٹی کے برسرِاقتدار آتے ہی وزیراعظم ایمیٹلی نے ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے برطانوی وزراء کا ایک سہ رکنی وفد ہندوستان بھیجا۔ اس کی سفارشات کے تحت 1946 کے ستمبر میں جواہر لال نہرو کی قیادت میں ایک عبوری حکومت کا قیام عمل میں آیا مگر مسلم لیگ نے اس میں شمولیت سے انکار کردیا تاہم کچھ ہی دن بعد وہ اس میں شامل ہوگئی۔ اس کی شمولیت نے عبوری حکومت کی کارکردگی کو بُری طرح مجروح کیا کیونکہ اس کے نمائندے روزمرہ کاموں میں مزاحمت کرتے تھے ـــــــ اسی طرح جب 9 دسمبر 1946 کو ہندوستان کے آئین کی تشکیل کی غرض سے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو مسلم لیگ کے اراکین نے اس کا بائیکاٹ کیا کیونکہ وہ اپنے لیے ایک علاحدہ مجلس آئین ساز کے قیام کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔

اسی دوران ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ لیگ اور کانگریس کے اختلافات میں اضافہ ہوتا گیا۔ آزاد ہند فوج کے ہندوستانی باغی افسروں پر مقدموں کا سلسلہ شروع ہوگیا بحری افواج میں انتشار پیدا ہوگیا، فرقہ وارانہ فساد نے خطرناک شکل اختیار کرلی۔ ایسے حالات میں برطانوی حکومت نے ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر ہندوستان



حکیم اجمل خان

بھیجا اور ویول کو واپس بلا لیا۔ اعلان کیا کہ 1948 تک اقتدار کو ہندوستانیوں کے حوالے کردیا جائے گا۔

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچ کر یہاں کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، حالات کا جائزہ لیا اور تقسیم ہند ہی کو اس کے لیے نسخہ کیمیا کے طور پر تجویز کیا۔ انجام کار 14 اگست 1947 کو مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کی آزاد ریاست کا قیام عمل میں آگیا اور 15 اگست کو ہندوستان آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوا۔ جس کے لیے ہندوستانی عوام نے قربانیاں دی تھیں، گاندھی جی نے برت رکھے تھے، رہنماؤں نے زبردست ایثار کا مظاہرہ کیا تھا۔ انقلابیوں نے جن میں بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، سکھدیو جیسے جیالوں نے ہنستے ہنستے پھانسی کے پھندے کو گلے سے لگا لیا تھا، اینی بیسنٹ اور سروجنی نائیڈو نے سختیاں سہی تھیں اور لوگوں نے جان کی بازی لگا دی تھی ـــــــ محمد علی جناح پاکستان کے اولین گورنر جنرل بنائے گئے اور ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ماؤنٹ بیٹن ہی نے ذمہ داری قبول کی ـــــــ

اس طرح دیوانوں کا جو کارواں آزادی کی تلاش میں چل پڑا تھا وہ بالآخر اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب میں آزادی کا استقبال کرتے

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچ کر یہاں کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، حالات کا جائزہ لیا، اور تقسیم ہند ہی کو اس کے لئے نسخہ کیمیا کے طور پر تجویز کیا۔ انجام کار 14 اگست 1947 کو مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کی آزاد ریاست کا قیام عمل میں آگیا اور 15 اگست کو ہندوستان آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوا۔



آصف علی

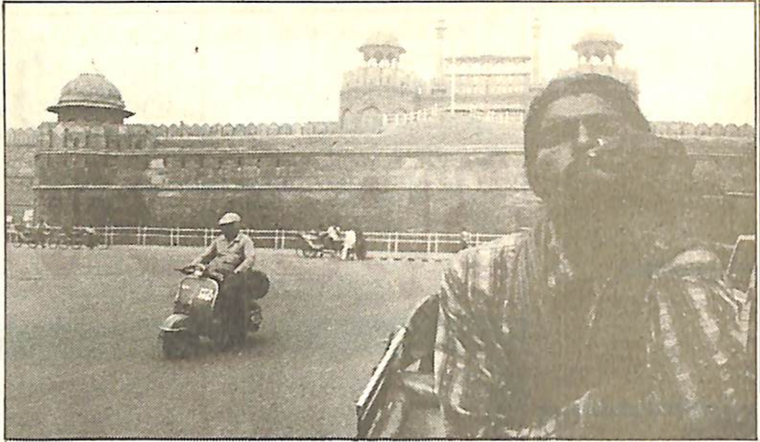
ہوئے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ:

"برسوں پہلے ہم نے تقدیر کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا اور اب وہ وقت آپہنچا ہے جب ہم اپنے عہد کی تکمیل کا نظارہ کرسکیں گے۔ نصف شب کا گجر بجتے ہی جبکہ ساری دنیا محوِ خواب ہوگی ہندوستان حیات و حریت کے ساتھ بیدار ہوگا ـــــــ"

اور ٹھیک نصف شب میں ہندوستان آزادی کی فضاؤں میں بیدار ہوگیا ـــــــ!!

فوٹو فیچر

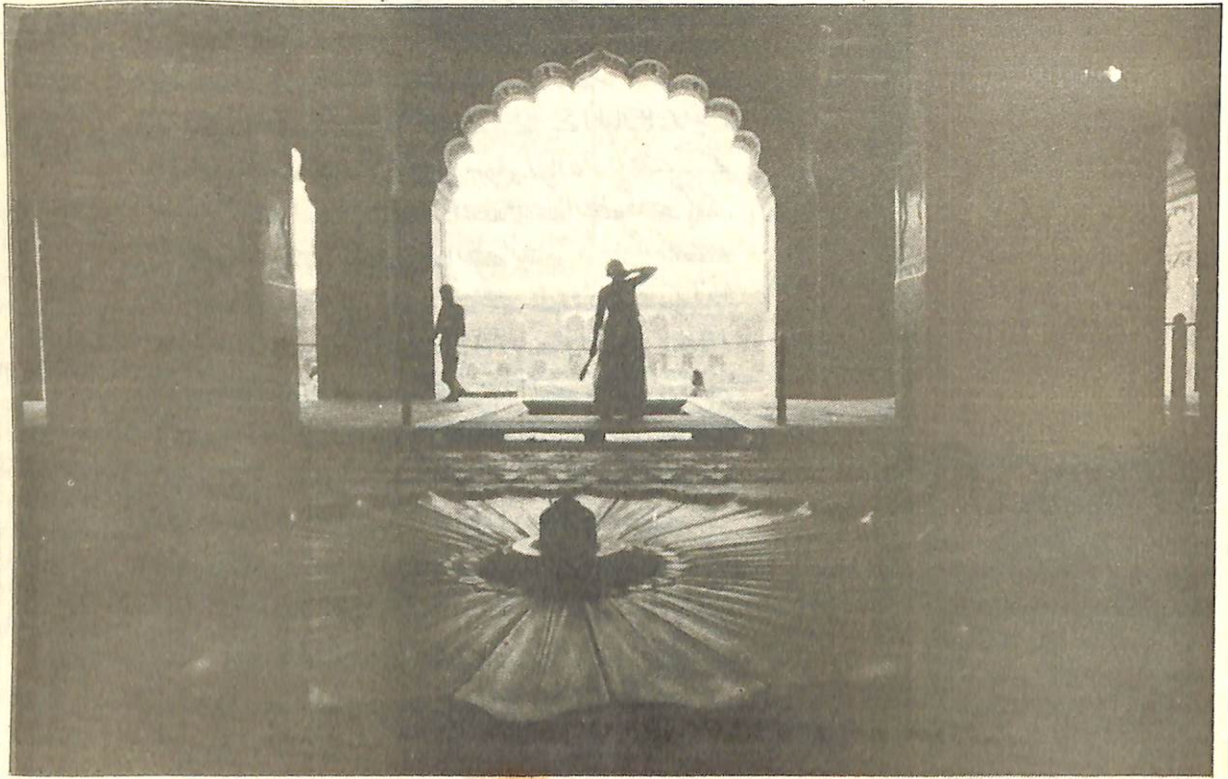
روپندر داس







شاہی شان وشوکت
غلامی کی اذیت
اور پھر
آزادی کی نعمت
کا گواہ
لال قلعہ



پہلی جنگ آزادی کی کہانی

مرزا غالبؔ کی زبانی

مخمور سعیدی



مرزا غالبؔ کی ہمہ جہت شخصیت اپنی مثال آپ تھی۔ ایک ٹوٹتے بکھرتے لیکن اپنے کچھ تحفظات اور تعصبات کی حفاظت پر کمربستہ معاشرے میں رہتے ہوئے وہ انفرادی کردار کے اثبات پر جس طرح مُصِر رہے، اس کی کوئی دوسری نظیر ان کے دور میں ڈھونڈنے سے بھی شاید ہی مل سکے۔ ان کی شاعری اور ان کی نثر دونوں اس جرأت مندی کی مُنہ بولتی تصویریں ہیں۔ مرزا غالبؔ کو اپنے ایرانی ہونے پر ناز تھا اس لیے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو بھی انھوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اُردو میں ان کا نثری سرمایہ زیادہ تر ان کے خطوط پر مشتمل ہے لیکن فارسی میں ان کی کچھ مستقل تصانیف بھی ہیں ان میں "دستنبو" کی خاص اہمیت ہے۔ اسے انھوں نے روزنامچے کے انداز میں قلمبند کیا ہے اور مئی 1857 سے جولائی 1857 تک دارالحکومت دہلی میں جو اُتھل پُتھل ہوئی، باغی ہندوستانی سپاہیوں اور انگریزوں کے درمیان جو معرکے ہوتے اور اس خونی معرکہ آرائی میں دلّی اور دلّی والوں پر اور خود مرزا صاحب پر بھی جو مصائب گزرے، ان کی روداد بیان کی ہے۔

یہ کتاب قضا و قدر کے فلسفے پر رائے زنی سے شروع ہوتی ہے جو تین چار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے بعد بیان واقعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے:

"اپنے گھر میں تھا جب میں نے شور و غوغا سُنا، کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، پلک جھپکتے اطراف و جوانب سے صاحب رجمنٹ بہادر اور قلعہ دار کے اندرونِ قلعہ قتل کوچہ و بازار میں سواروں کی دوڑ بھاگ اور شہر میں پیادوں کے پے بہ پے پہنچنے کا شور بلند ہوا۔ مٹھی بھر خاک بھی نہ رہی جو گُل بدنوں کے خون سے سرخ نہ ہوئی ہو اور کسی باغ کا ایک کونا بھی نہ تھا جو بے

برگ و باری کے سبب بہاروں کا قبرستان نہ معلوم ہوتا ہو۔"

انگریز مخالف سپاہیوں کا جو لشکر شہر میں وارد ہوا تھا، غالب اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور اسے بے جا قتل و غارت کا مرتکب ٹھہراتے ہیں۔ شہر کی صورتِ حال ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

"جو بے رتبہ لوگ مٹی بیچنے کے لئے سارا دن زمین کھودتے تھے، انھوں نے مٹی میں سونے کی اینٹیں پالیں اور جو ذی رتبہ لوگ راتوں کو اپنی بزمِ ناؤ نوش میں آتش گل سے چراغ کیف و نشاط روشن کرتے تھے انھیں تاریک حجروں کے اندر ناکامی و ناخوشی کے شعلوں نے پھونک ڈالا۔ شہر کی خوب رو عورتوں کا زیور، بجز اس کے جتنا کچھ کوتوالِ شہر کی بیوی اور بیٹی کے گوش و گردن میں رہ گیا ہو، سارا کا سارا دوں ہمت سیاہ کار اچکوں کی تھیلی میں پہنچ گیا۔ ان نازنینوں کا رہا سہا سرمایۂ ناز و انداز نو دولت گدازادوں نے لوٹ لیا تاکہ اسے اپنے چھچھورے پن کی متاع بنائیں۔"

مرزا غالب انگریزی نظام کی لائی ہوئی برکتوں کے لاکھ مداح سہی، ان کے ذاتی مفادات بھی انگریزی حکام سے وابستہ سہی، لیکن ان کا خمیر ہندوستانی مٹی سے اٹھا تھا۔

مرزا غالب کے کئی خطوط میں "دستنبو" کا ذکر آیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب قلم بند کرتے ہوئے انھوں نے انگریزی حکام کی خوشنودی کو مدنظر رکھا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ان کی وابستگی کی بنا پر بعض انگریز حاکم ان کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ اس بدگمانی کو دور کرنا چاہتے تھے اور یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ انگریزوں کے دوست ہیں۔ "دستنبو" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ بیانِ واقعات میں انھوں نے دروغِ مصلحت آمیز سے کام لیا ہو۔ اس کی داخلی شہادتیں خود کتاب کے متن میں بھی موجود ہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال زیرِ بحث نہیں، صرف کتاب کا تعارف اور اس کے حوالے سے مرزا صاحب کی انوکھی شخصیت سے ایک اور ملاقات مقصود ہے۔



خط کتابت مرزا غالب کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کا زیادہ وقت دوستوں کو خط لکھنے یا ان کے خط پڑھنے ہی میں گزرتا تھا۔ اس ہنگامے کے نتیجے میں ڈاک کا نظام بھی ابتر ہو کر رہ گیا۔ غالب اس پر اپنا تاسف ظاہر کئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے:

"ڈاک کے نظام کی ابتری نے سیکڑوں کام روک دیے۔ جہاں بھی جو ہرکارہ تھا، اس نے آنا جانا اور خطوں کا پہنچانا چھوڑ دیا۔ ڈاک میں زبانی پیغام کی گنجائش نہیں، خطوں کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے لیکن اس محکمے کی ایک اور شاخ ہوتی ہے، جہاں مضراب کی جنبش کی بجائے، جنبش کی مضراب سے جو خود بخود پیدا ہوتی ہے، ہزاروں پیغامات بر آمد ہوتے ہیں۔ اس سارے نظام کی ابتری اور خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی بربادی، کیا نالہ و بکا کی مستحق نہیں؟ کیا خطوں کی آمد و رفت کا رک جانا اور دوستوں کا احوال معلوم نہ ہو سکنا درخورِ ماتم نہیں؟"

مرزا صاحب کے احباب کا حلقہ دلی سے باہر بھی اور دلی کے اندر بھی، خاصا وسیع تھا۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی ان کے مہربان دوستوں میں تھے۔ باغی انھیں انگریزوں کا ہمدرد اور بہی خواہ خیال کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے حکیم صاحب کو ٹھکانے لگا دینے کی کوشش کی۔ اس کا ذکر مرزا غالب نے اس طرح کیا ہے:

"ایک دن وہ بدنیت حکیم صاحب جیسے مردِ فرزانہ کے قتل کی نیت سے ان کی حویلی پر چڑھ آئے۔ عزت مآب حکیم صاحب چونکہ اس وقت قلعے میں بادشاہ کی خدمت میں تھے، اس گروہ کے چند شوریدہ سر قلعے میں پہنچے اور ان کو گھیر لیا۔ خداوندِ بندہ نگہدار نے بہ کمالِ مرحمت و کرم، خود کو ان پر ڈال دیا تب اس نازک وقت میں ان کی جان بچی۔"

"خداوندِ بندہ نگہدار" سے مراد آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر ہیں، جنھوں نے حکیم احسن اللہ خاں پر خود کو ڈال کر مشتعل سپاہیوں سے ان کی جان بچائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ باغیوں کے دل میں بادشاہ کا بہت احترام تھا۔ دور دراز کے سرداروں اور رئیسوں نے بھی بادشاہ کی برتری کو قبول کرتے ہوئے، اس کے تئیں اپنی نیاز مندی ظاہر کرنی شروع کر دی تھی۔ اس ذیل میں غالب نے فرخ آباد کے تفضل حسین خاں، بریلی کے خان بہادر خاں، رامپور کے نواب یوسف علی خاں اور لکھنؤ کے شرف الدولہ کے نام گنوائے ہیں۔ شرف الدولہ نے غالباً سب کے بعد اپنا نذرانۂ نیاز بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور اس کے بعد ہی دلی کی صورتِ حال بدل گئی۔ باغی پسپا ہونے لگے اور انگریز فوج دلی پر دوبارہ قابض ہو گئی۔

غالب لکھتے ہیں:

"موقع شناس و معاملہ فہم شرف الدولہ نے جو نوابانِ اودھ کے عہد میں وزیر کہلاتا تھا۔۔۔۔ واجد علی شاہ کی اولاد میں سے ایک دس سال کے لڑکے کو سرداری کے لئے منتخب کیا اور تخت پر بٹھا دیا۔ ہما پر جال پھینکنے والے اس نامور کو آفریں کہ جب تمام کام درست کر لئے تو منتخب لوگوں میں سے ایک کو شایانِ شان نذرانے کے ساتھ دلی رخصت کیا۔ ایلچی آیا۔ دو دن آرام کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دو سبک رفتار گھوڑے، دو کوہ پیکر ہاتھی، ایک سو اکیس اشرفیاں اور ایک زریں تاج، انواع و اقسام کے نایاب موتیوں سے مرصع نذر گزرانا اور ایک جوڑ بازو بند، ہیرے جڑے، ملکہ کے لئے محل میں بھجواتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شان و شوکت اندھیرے گھر میں دیا روشن کرنے کے مترادف تھی اور زمانہ اس رونق کو آنکھ کا ناسور بنا دینے کا منتظر تھا۔ بادشاہ نے اودھ کی پیش کش قبول ہی کی تھی کہ آئینہ و سکندر کی روایت شکست انجام ہوئی اور جام و جمشید کا ہنگامہ اختتام پذیر۔ مقدر جو فوجوں کے شور و غوغا میں گہری نیند سے چونک پڑا تھا، ادھ کھلی آنکھوں کے ساتھ پھر سو گیا۔ نہیں نہیں۔ بادشاہ کے مقدر کا ستارہ اس بلندی پر جا پہنچا کہ ہم خاکیوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ جس روز اس سبز قدم نے ایلچی گری کی خدمت انجام دی اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی، اس کے دوسرے روز کہ پیر کا دن، قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ تھی، پہاڑی کے سایہ نشینوں نے اس دبدبے کے ساتھ کشمیری دروازے پر یلغار کی کہ کالوں کی فوج کیلئے بھاگے بغیر چارہ نہ رہا۔"

مرزا غالب انگریزی نظام کی لائی ہوئی برکتوں کے لاکھ مداح سہی، ان کے ذاتی مفادات بھی انگریزی حکام سے وابستہ سہی لیکن ان کا خمیر ہندوستانی مٹی سے اٹھا تھا۔ مندرجہ بالا سطور سے چھلکا پڑ رہا ہے کہ اس تمام تر غم و غصہ کے باوجود جو باغی ہندوستانی سپاہیوں اور فوجی سرداروں کے خلاف وہ ظاہر کر رہے تھے، ان کی اچانک پسپائی اور انگریز فوجوں کی پیش قدمی کو انھوں نے ایک اندرونی صدمے کے ساتھ ہی قبول کیا ورنہ یہ الفاظ ان کے قلم سے نہ نکلتے: "یہ سب شان و شوکت اندھیرے گھر میں دیا روشن کرنے کے مترادف تھی اور زمانہ اس رونق کو آنکھ کا ناسور بنا دینے کا منتظر تھا۔"

دلی پر انگریز فوجوں کے دوبارہ قابض ہو جانے کے بعد یہاں کے شہریوں پر جو بیتی اس کا حال مرزا غالب نے اس

طرح بیان کیا ہے:

"دشمن کو مار بھگانے والے فتحیاب جدھر منہ اُٹھا، دوڑ پڑے اور جس کسی کو راہ چلتے پایا، قتل کر دیا۔ شہر کے بلند مرتبت دانش مند لوگوں میں کوئی نہ تھا جو اپنے ننگ و ناموس کی خاطر گھر دروازے بند کرکے نہ بیٹھ گیا ہو..... غضب ناک شیروں نے جب سے شہر میں قدم رکھا ہے، بے نواؤں کے قتل اور آتش زنی کو اپنے لئے روا کر لیا ہے۔ ہاں جو علاقہ بزورِ جنگ لیا جائے، وہاں کے لوگوں پر اسی طرح زندگی تنگ کر دی جاتی ہے۔"

مرزا صاحب کی اخلاقی جرأت داد طلب ہے۔ اس امر کے باوجود کہ کتاب انھوں نے انگریزوں کی خوشنودی کو مدِ نظر رکھ کر لکھی، انگریز فوجیوں کے ظلم و تعدی پر پردہ نہیں ڈالا اور کچھ تاویلات کے ساتھ ہی سہی، جو کچھ دیکھا اسے حوالہ قلم کر دیا۔

مرزا غالب جس گلی میں مقیم تھے، وہاں کچھ اور معززین بھی اپنی حویلیوں میں رہتے تھے۔ اس گلی کی حفاظت کے لئے مہاراجہ پٹیالہ نے جو انگریزوں کے وفادار تھے، اپنے سپاہی تعینات کر دیے۔ غالب کہتے ہیں:

"نریندر سنگھ بہادر فرماں روائے پٹیالہ اس لڑائی میں فاتحین کے ساتھ اور انکی فوج ابتدا سے انگریزی فوج کی ہمراہی میں ہے۔ راجہ کے چند ملازمین خاص، جو اُن کی سرکار میں بلند رتبہ اور شہر کے ممتاز رئیس ہیں، امثال حکیم محمود خاں، حکیم مرتضٰی خاں، حکیم غلام اللہ خاں کہ خلد آشیانی حکیم شریف خاں کی اولاد میں ہیں، اس گلی میں رہتے ہیں۔ راقم الحروف دس سال سے ان صاحبانِ ثروت میں سے ایک کا ہمسایہ ہے.... چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجہ نے ازراہِ بندہ پروری، نبرد آزما زور آزماؤں سے یہ عہد لے لیا تھا کہ جب مساعدتِ وقت سے ظفریاب ہوں، اس گلی کے دروازے پر پہریدار بٹھا دیے جائیں تاکہ انگریزی فوجیں جنھیں گورا کہا جاتا ہے، گلی کو نقصان نہ پہنچائیں۔"

محافظ بٹھا دیے جانے سے گلی والوں کے جان و مال کی حفاظت تو ہو گئی لیکن اُن کی حالت کیا تھی؟ مرزا غالب کی زبانی سنیے:

"ان دنوں ہم خود کو قیدی سمجھتے ہیں اور حقیقت میں قیدیوں ہی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ کوئی آتا ہے جس سے کچھ سن سکیں نہ خود باہر جاتے ہیں کہ آنکھوں سے جو کچھ دیکھنے کا ہے، دیکھ سکیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں اندھی اور اس گومگو اور کشمکش کے علاوہ ہمارے لئے روٹی پانی کا قحط۔"

اس ابتلا میں مرزا صاحب کو اپنے اکلوتے بھائی مرزا یوسف کا دھیان آتا ہے:

"بھائی نے جو مجھ سے دو سال چھوٹا ہے، تیس سال کی عمر میں عقل و ہوش تج کر دیوانگی اور پاگل پن اختیار کیا۔ تیس سال ہوتے ہیں کہ وہ دیوانہ جو کسی کو نہیں ستاتا، نہ شور و غوغا کرتا ہے، بے سدھ زندگی گزار رہا ہے اس کا گھر میرے گھر سے الگ، اندازاً دو ہزار قدم کی دوری پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکی نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ، عافیت بھاگ جانے میں سمجھی اور گھر کے دیوانے مالک کو مع گھر اور اثاث البیت اور ایک عمر رسیدہ دربان اور بوڑھی کنیز کے، اپنے حال پر چھوڑ گئیں۔ اگر میں جادو جانتا ہوتا تو بھی یہ نہ کر سکتا کہ کسی کو بھیجوں اور ان تینوں کو بلوالوں اور سامان یہاں منگوالوں.... میں ہمہ وقت اس فکر میں ہوں کہ بھائی رات کو کس طرح سویا اور دن کو اس نے کیا کھایا؟ اور بے خبری کا یہ عالم ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا وہ زندہ ہے یا سختی اٹھاتے اٹھاتے مرگیا۔"

مرزا صاحب کے شب و روز کا حال یہ تھا کہ ایک دن انگریز سپاہی آئے اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ انھیں گرفتار کر کے لے گئے۔ تفصیل مرزا صاحب ہی سے سنیے:

"5 اکتوبر کو پیر کے اندوہ فزا دن میں دوپہر کے وقت ناگاہ چند گورے، اس دیوار کے راستے سے جو گلی کے سنگ بستہ دروازے سے ملحق ہے، ایک چھت پر چڑھ آئے اور چھت سے کود کر گلی میں آگئے۔ راجہ نریندر سنگھ بہادر کے سپاہیوں کا روکنا بے سود رہا۔ گورے دوسرے چھوٹے مکانوں کو نظر انداز کرکے، جہاں راقم الحروف تھا، پہنچے۔

گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر، درشتی یا سخت گیری کے ساتھ نہیں، معاملہ فہم اور دانش مند کرنیل براؤن کے روبرو، جو چوک کے اس طرف قطب الدین سوداگر کے مکان میں ٹھہرا ہوا ہے، مجھے لے گئے۔ کرنیل نے میرے ساتھ نرمی اور انسانیت سے بات کی اور مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا اور خوش وقتی کے ساتھ اسی وقت گھر کو رخصت کر دیا۔"

مرزا غالب اپنی انا کی پاسداری سے کبھی غافل نہ رہتے تھے۔ یہاں بھی انھوں نے یہ جتانا ضروری سمجھا ہے کہ اگرچہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ پکڑے اور کرنیل براؤن کی پیشی میں لے جائے گئے لیکن کرنیل کا رویہ اُن کے ساتھ اچھا رہا، اس نے مرزا صاحب کے ساتھ نرمی اور انسانیت سے بات کی اور ان کا صرف نام پوچھا جب کہ دوسروں سے پیشہ بھی دریافت کیا۔

جیسا کہ مرزا صاحب کا بیان ہے باغی پیر کے دن دارالحکومت دہلی میں داخل ہوئے تھے، پھر پیر کے ہی روز ان کی پسپائی کا آغاز ہوا۔ جب گورے سپاہی مرزا غالب کو پکڑ لے گئے وہ بھی پیر ہی کا دن تھا اور پھر ایک اور پیر کا دن آیا جس نے مرزا صاحب کو بھائی کی دائمی جدائی کا پیغام سنایا۔ مرزا صاحب رقم طراز ہیں:

"19 اکتوبر کو وہی پیر کا دن، جس کا نام ہفتے کے دنوں کی فہرست سے کاٹ دینا چاہیے، ایک سانس میں آتش نفس اژدہے کی طرح دنیا کو نگل گیا۔ اس کے پہلے پہر میں وہ افسردہ رو اژولیدہ مو دربان بھائی کے مرنے کی خبر لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتارِ راہِ فنا پانچ دن تک تیز بخار میں جلتا رہا اور رات کے وقت آدھی نبجے توسن عمر کو اس تنگنائے سے کود لے گیا۔ اب سے ہرگز غسّال اور گورکن کو نہ ڈھونڈ، سنگ و خشت کا نہ پوچھ، چونے گارے کی بات نہ کر اور مجھے بتا کہ میں کیونکر گھر سے نکلوں، میت کو کہاں لے جاؤں اور کس قبرستان میں سپرد خاک کروں؛ پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور سرانجام کار پر کمربستہ ہوئے۔ پٹیالے کے سپاہیوں میں سے ایک کو آگے رکھا، میرے نوکروں میں سے دو کو ساتھ لے گئے۔ مُردے کو نہلایا، دو تین سفید چادروں میں لپیٹا، ایک مسجد میں جو گھر کے پہلو ہی میں تھی، زمین کھود دی، مرنے والے کو وہاں رکھا اور گڑھے کو مٹی سے پاٹ کر چلے آئے۔"

مرزا غالب نے بھائی کا ہجری سال وفات اس مصرعے سے نکالا ہے:

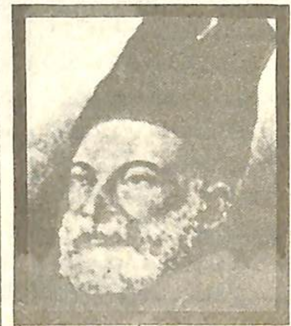
کشیدم آہی وگفتم دریغ دیوانہ

وضاحتاً کہتے ہیں:

"قاری کا ذہن اس مفہوم تک پہنچ جانا چاہیے کہ حسب قاعدہ 'دریغ دیوانہ' کے 1290 عدد شمار ہوں گے۔ ان سے "آہی" کے عدد گھٹانے کے بعد، جو 16 ہوں گے، وہی 1274 باقی رہ جاتے ہیں جو اس وقت مطلوب ہیں۔"

مرزا صاحب نے یہاں دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے برادرِ خورد مرزا یوسف بخار میں مبتلا ہو کر فوت نہیں ہوئے تھے بلکہ گوروں کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔ دلّی اور اس

جیساکہ مرزا صاحب کا بیان ہے، باغی پیر کے دن دہلی میں داخل ہوتے تھے، پھر پیر کے ہی روز ان کی پسپائی کا آغاز ہوا جب گورے سپاہی مرزا غالب کو پکڑ لے گئے وہ بھی پیر تھا۔



کے قرب وجوار میں دیگر شہریوں کے خلاف انگریز حاکموں اور فوجیوں نے جو خوں ریز انتقامی کارروائیاں کیں، مرزا صاحب نے ان کی پردہ پوشی نہیں کی ہے، صاف صاف لکھ گئے ہیں:

شاہزادوں سے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ بندوق کی گولی کا زخم کھا کر موت کے منہ میں چلے گئے اور کچھ کی روح پھانسی کی رسّی کے پھندے میں گھٹ کر رہ گئی۔ کچھ قید خانوں میں ہیں اور کچھ آوارۂ روئے زمین۔ ضعیف و ناتواں بادشاہ پر، جو قلعے میں نظر بند ہے، مقدمہ چل رہا ہے۔ جھجر اور بلبھ گڑھ کے زمین داروں کو اور فرخ آباد کے مسند آرا کو الگ الگ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ گویا اس طرح ہلاک کیا گیا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا خون بہایا گیا۔"

آخری فقرے کی نشتریت محسوس کرنے کی چیز ہے۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات شہر کے اندر ان دونوں جگہوں میں اس قدر آدمیوں کو جمع کر دیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے میں سمائے ہوئے ہیں۔ ان دونوں قید خانوں کے ان قیدیوں کی تعداد جنھیں مختلف اوقات میں پھانسی دے دی گئی، ملک الموت ہی جانتا ہے۔ مسلمان شہر میں ایک ہزار سے زیادہ نہیں ملیں گے اور راقم الحروف بھی ان ہی ہزار میں سے ایک ہے۔"

"دستنبو" میں یہ ذکر متعدد بار آیا ہے کہ انگریز حاکموں کا غم و غصّہ مسلمانوں پر زیادہ تھا کیونکہ باغیوں کا ہراول دستہ انہی کو سمجھا جا رہا تھا۔ شہر کی ہندو آبادی انگریزوں کے غیظ و غضب سے بڑی حد تک محفوظ تھی۔ اس کے پیچھے انگریزوں کی یہ حکمتِ عملی بھی کارفرما رہی ہوگی کہ مقامی لوگوں میں نفاق ڈالا جائے اور انھیں ایک دوسرے کی طرف سے بدگمان کر دیا جائے۔ لیکن مرزا غالب کے بعض بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ انگریزوں کی یہ حکمتِ عملی کچھ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ ہندو مسلمانوں کے صدیوں پرانے تعلقات نے انھیں ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا اور جو بہتر پوزیشن میں تھے، وہ ان کی مدد کرنا چاہتے تھے جنھیں تقدیر نے بے دست و پا کر دیا تھا۔

مرزا غالب عادی شرابی تھے اور ان حالات میں جب نان و آب کا انتظام بھی مشکل تھا، شراب کیونکر فراہم ہوتی؟ لیکن یہ فراہم ہوئی۔ مرزا غالب رقمطراز ہیں:

"سچائی کے ساتھ، کہ سچائی کو چھپانا، آزادہ مزاجوں کا شیوہ نہیں، میں نیم مسلمان کہ رواج اور مذہب کی پابندیوں سے کبھی آزاد اور اپنی رسوائی کے غم سے بھی رہا۔ سدا میری یہ عادت رہی کہ رات کو ولایتی شراب کے سوا کچھ نہیں پیتا تھا اور اگر نہیں پیتا تھا تو مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جب انگریزی شراب بہت مہنگی ہے اور میں سخت قلّاش، اگر خدا دوست اور خدا شناس، فیاض اور دریا دل مہیش داس، گنّے کی دیسی شراب بھیج کر جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور مہک میں اس سے بڑھ کر ہے، دل کی آگ پر پانی نہ ڈالتا تو میں زندہ نہ رہ سکتا اور جگر تشنگی کی شدّت سے دم توڑ دیتا۔"

مہیش داس جی نے مرزا غالب کی دل جوئی کے علاوہ شہر میں مسلمانوں کی باز آبادکاری کی کوشش کی۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"انصاف سے نہیں گزرا جا سکتا اور جو دیکھا ہے بن کہے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس نیک طینت نے شہر میں مسلمانوں کی آبادکاری کے سلسلے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ چونکہ سرنوشتِ آسمانی اس کے ساتھ نہ تھی، کام بننا مشکل ہو گیا۔ قصّہ مختصر ایک نیک بخت آدمی ہے۔ اگرچہ میرے ساتھ پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت سے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھے احسان مند کرتا ہے۔"

یہ تو ایک ایسے شخص کا احوال ہے جس کی مرزا صاحب کے ساتھ پرانی جان پہچان نہیں تھی، اب ان کے کچھ قریبی ہندو دوستوں کا ذکر سنئے:

"میرے دوستوں اور شاگردوں میں ہیرا سنگھ جو ایک نیک نہاد اور نیک نام نوجوان ہے، مجھ پر بہت مہربان ہے۔ آتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نیم ویران نیم آباد شہر کے دوسرے لوگوں میں عالی نسب شوجی رام برہمن جو ایک جوانِ دانشمند اور میرے بیٹے کی جگہ ہے، اس دل ریش کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے۔ بساط بھر میری فرماں برداری میں مستعد اور غمگساری میں یکتا ہے۔ دور دست دوستوں میں آسمانِ مہر و مروّت کا وہ ماہِ کامل شیوا زباں ہرگوپال تفتہ جو میرا پرانا ہمدم و ہم آواز ہے..... فرطِ محبت سے میں نے اسے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے اور مرزا تفتہ خطاب دیا ہے۔ اس نے میرٹھ سے ایک ہنڈی بھیجی ہے اور غزل اور خط ہمیشہ بھیجتا رہتا ہے۔"

مرزا غالب اس ہنگامۂ دار و گیر سے زندہ بچ نکلے اور وہ لٹیروں کی دستبرد سے بھی محفوظ رہے لیکن ان پر ایک طرفہ افتاد پڑی۔ اس کی تفصیل بھی ان ہی کی زبانی سن لیجئے:

"زمانے کی نیرنگ سازی پر مرتا ہوں کہ اس لوٹ مار میں، جب شہر کے کسی گھر میں مٹی تک نہیں بچی، اس کے باوجود کہ میرا گھر لٹیروں کی دراز دستی سے محفوظ رہا، قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے کپڑوں کے سوا کچھ گھر میں نہیں رہا۔ اس معمّے کا حل اور اس جھوٹ نظر آنے والے سچ کی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جب کالوں نے شہر پر قبضہ کر لیا، بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں، زیور وغیرہ جو کچھ تھا، خفیہ طور پر میر زادہ کالے صاحب کے گھر بھیج دیا۔ وہاں تہہ خانے میں محفوظ کر کے دروازہ مٹّی سے پاٹ دیا گیا۔ جب لشکر آرا گوروں نے شہر کو فتح کیا اور لشکریوں کو لوٹ مار کا حکم ملا، بیگم نے اس راز سے مجھے باخبر کیا۔ کام ہاتھ سے نکل گیا تھا اور جا کر سامان لے آنا ممکن نہیں تھا۔ میں چپ ہو رہا اور خود کو یہ سمجھ کر بہلا لیا کہ یہ جانے والا ہی تھا۔ اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گیا۔ اب کہ جولائی کا یہ مہینہ، پندرھواں مہینہ ہے، انگریزی حکومت سے جو قدیم پنشن ملتی تھی، اس کے دوبارہ ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وہی بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر جسم و جاں کی پرورش کرتا ہوں۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب سارے کپڑے کھا چکوں گا تو ننگا بھوکا مروں گا۔"

پنشن کی بحالی اور اس کے ساتھ ہی سرکار انگلشیہ سے خطاب اور خلعت کے مرزا صاحب آخری دم تک آرزو مند رہے۔ "دستنبو" کا خاتمہ بھی انھوں نے اسی آرزو مندی کے ساتھ کیا ہے:

"سالِ گذشتہ کے مئی مہینے سے جولائی 1858 تک کی روداد میں نے لکھی ہے اور یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش ان تین خواہشوں، خطاب، خلعت اور پنشن کے بارے میں، جن کی واگزاری کا اس کتاب میں بھی ذکر کیا ہے اور بدبینوں کی نظر بچا کر بڑی امیدوں سے دل ان کی طرف لگائے ہوئے ہوں..... سکندر پایہ شہنشاہ کے حضور سے منظوری کا فرمان پہنچ جائے۔"

انگریزوں کی یہ حکمتِ عملی بھی کارفرما رہی ہوگی کہ مقامی لوگوں میں نفاق ڈالا جائے اور انھیں ایک دوسرے کی طرف سے بدگمان کر دیا جائے۔



شہیدانِ وطن اور غدر پارٹی

نسرین اختر

1857 میں ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کو غدر بھی کہا جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں بیسویں صدی کے اوائل میں امریکہ میں مقیم وطن پرست ہندوستانیوں نے اپنے ملک سے انگریزی حکومت ختم کرنے کے لئے غدر تحریک شروع کی جس کا پروپیگنڈہ ہندوستان کے علاوہ امریکہ، کناڈا، جاپان، فجی اور دیگر ممالک میں آباد ہندوستانیوں میں بھی کیا گیا۔ لالہ ہردیال، محمد برکت اللہ، خودی رام، لوکمانیہ تلک، راش بہاری بوس، اربندو گھوش، رام چند، بھگوان سنگھ، سوہن سنگھ، سوہن لال پاٹھک، حسین رحیم، باونت سنگھ جیسے انقلابی اور مجاہدین آزادی کی سرگرم سرپرستی اور رہنمائی اس تحریک کو حاصل تھی۔ 1915 میں غدر پارٹی نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے اعلان جنگ کر دیا اور غیر ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے وطن عزیز کی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں اور ہندوستانی عوام کو آزادی کی اہمیت وافادیت اور انگریزوں کی غلامی کے نقصانات سے آگاہ کرنے کے لئے وطن واپس جائیں نیز فوج کو بھی انگریزی سرکار کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے تقریباً آٹھ ہزار ہندوستانی غیر ممالک سے وطن واپس آئے لیکن چونکہ انگریز حکمرانوں کو ان کے مشن کا علم ہو گیا اس لئے 1915 میں باہر سے آنے والے 1500 ہندوستانیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

> غدر پارٹی میں اگرچہ سکھوں اور پنجابیوں کی اکثریت تھی تاہم ہندوستان کے مختلف صوبوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے مجاہدین آزادی بھی اس میں شامل تھے۔

غدر پارٹی اور اس کے رہنماؤں کی قابلِ ذکر دین یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانیوں میں وطن پرستی، سیکولرزم اور جمہوریت کا جذبہ پیدا کیا۔ بظاہر غدر پارٹی ہندوستان کو آزاد کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکی مگر اس حقیقت کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ اس تحریک نے بعد میں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو روشنی دی۔ غدر پارٹی کے تقریباً 40 ممبران کو انگریزی حکومت نے تختۂ دار پر لٹکا دیا اور 200 سے زائد کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ اس کے بہت سے اراکین نے آگے چل کر دوسری اور تیسری دہائیوں میں کسانوں اور مزدوروں کی تحریکوں اور کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی کی۔ غدر پارٹی میں اگرچہ سکھوں اور پنجابیوں کی اکثریت تھی تاہم ہندوستان کے مختلف صوبوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے مجاہدین آزادی بھی اس میں شامل تھے۔

1914 میں غدر تحریک کو تین عوامل نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور اس کے فروغ میں رکاوٹ پیدا کی۔ پہلی وجہ لالہ ہردیال کی گرفتاری تھی۔ دوسری "کوما گاٹا مارو" کا واقعہ اور سوئم پہلی عالمی جنگ تھی۔ اس تحریک کے بانیوں نے یکم نومبر 1913 میں اُردو اخبار "غدر" نکالا۔ 9 دسمبر 1913 سے اس اخبار کا گرومکھی ایڈیشن بھی شائع ہونے لگا۔ اس اخبار میں جہاں ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کی ترغیب دی جاتی تھی وہیں ایک کالم "انگریزی راج کا کچا چٹھا" میں انگریزی حکومت کے مظالم اور لوٹ کھسوٹ کی پول بھی کھولی جاتی تھی۔ "غدر" اخبار نے عوام میں حب الوطنی، فرض شناسی اور جذبہ ایثار و قربانی پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور سیکولرزم کو اپنا نصب العین بنایا۔ "غدر" پارٹی کا نعرہ تھا۔

"ہندوؤ، سکھو، پٹھانو، مسلمانو!
اور فوج میں کام کرنے والو متوجہ ہو
انگریز ہمارے ملک کو لوٹ رہے ہیں
ہمیں اُن کے خلاف جنگ کرنی ہے
ہمیں پنڈتوں اور قاضیوں کی ضرورت نہیں
ہمیں اپنے جہاز کو ڈوبنے نہیں دینا ہے
عبادت کا وقت اب ختم ہو چکا ہے
یہ تو تلوار اُٹھانے کا وقت ہے"

(انڈیا ز اسٹرگل فار انڈیپنڈینس سے ماخوذ)

چوتھی اور پانچویں دہائی میں ہندو مسلم اتحاد، خلافت تحریک میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ ہندوؤں کی شمولیت اور سیکولر خیالات کے فروغ میں غدر پارٹی اور اس کے رہنماؤں نے اہم رول ادا کیا۔

انگریزی حکومت نے غدر پارٹی کے سیکڑوں اراکین کو گرفتار کر کے سخت سزائیں دیں اور اس کے ممبران کو پھانسی دی گئی۔ غدر پارٹی اور تحریک آزادی سے تعلق رکھنے والے چند محبانِ وطن کے مختصر حالات زندگی پیش ہیں۔

لالہ کانشی رام

لالہ کانشی رام پنجاب کے باشندے تھے اور غدر تحریک سے وابستہ تھے۔ فیروز پور کے نزدیک گولی چلی تھی جس میں ایک تھانیدار مارا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں لالہ کانشی رام سمیت سات ہندوستانیوں کو جن کا تعلق غدر پارٹی سے تھا انھیں سزائے موت دی گئی۔ لالہ جی نے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی لیکن اس کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی انھیں تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ انگریزوں کے انصاف کی حقیقی تصویر اس وقت نظر آئی جب بعد میں تھانیدار کا اصل قاتل مل گیا تو حکومت برطانیہ نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ جن سات آدمیوں کو پھانسی دی گئی وہ بے قصور تھے۔ اس طرح لالہ کانشی رام کو تحریک آزادیٔ ہند میں حصہ لینے کی پاداش میں انگریزی حکومت نے اُنھیں جھوٹے مقدمہ میں پھنسایا اور بعد میں پھانسی دے دی۔

سردار گندھا سنگھ

آپ 15-1914 میں غدر پارٹی کے لیڈر رہے۔ 1915 میں انھیں امریکہ سے ہندوستان بھیجا گیا یہاں آکر سردار جی نے غدر پارٹی کی تنظیم کو مضبوط بنانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ انتہائی باہمت اور خوددار انسان تھے۔ انگریز حکومت کے زرخرید غلام ایک تھانیدار ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا تو مادرِ ہند کے اس بہادر سپوت نے اس پولیس افسر کے گولی مار دی۔ اس جرم میں مارچ 1916 میں انگریز حکمرانوں نے سردار جی کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا اور غدر پارٹی کا یہ سچا سپاہی ابدی نیند سو گیا۔

بھائی کرتار سنگھ سرابا

1895 میں سرابا ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منگل سنگھ تھا۔ آپ نے 1912 میں امریکہ سے "غدر" نامی اخبار نکالا تھا۔ یہ اخبار ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی تحریک چلا رہا تھا اور غدر پارٹی کا ترجمان تھا۔ بھائی کرتار سنگھ پنجابی زبان میں شاعری بھی کرتے تھے۔ انگریز افسران نے انھیں ملک میں بغاوت پھیلانے کے الزام میں گرفتار کر کے مقدمہ چلانے کا ڈرامہ کیا۔ جب جج نے اُنھیں سزائے موت سُنائی تو انھوں نے جج کا شکریہ ادا کیا تھا۔ نومبر 1916 میں 21 سال کی عمر میں اُنھیں پھانسی دے دی گئی۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا کہ اگر کوئی میرا حال پوچھے تو کہنا کہ "باغی کرتار سنگھ پھانسی پر چڑھا دیا گیا"۔ پھانسی سے پہلے اس شہیدِ وطن کا وزن مارے خوشی کے دس پونڈ بڑھ گیا تھا۔

بھائی جگت سنگھ

امریکہ میں رہ رہے تھے۔ انھوں نے غدر پارٹی میں رہ

کر مادرِ وطن کی آزادی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کا تہیّہ کر رکھا تھا۔ بھائی جگت سنگھ بھی پنجاب کے ہی رہنے والے تھے۔ ان کو غدر تحریک میں حصّہ لینے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ انگریز حکومت نے انھیں سزائے موت دی۔ اس طرح آزادی کا یہ بہادر سپاہی بھی خاکِ ہند میں مل گیا۔

وی۔ جی۔ پنگلے

کا تعلق بھی غدر پارٹی سے تھا اور آپ بھی وطن کے اُن پجاریوں میں شامل تھے جنھوں نے ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وی جی۔ پنگلے امریکہ میں پیدا ہوئے، وہاں سے غدر تحریک کو چلانے کے لئے ہندوستان آ گئے۔ 21 فروری کی بغاوت ناکام ہو جانے کے بعد بھی محبِ وطن پنگلے نے ہمّت نہیں ہاری۔ انگریز حکومت آپ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی۔ بالآخر آپ کو میرٹھ میں گرفتار کر لیا گیا اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں اس وطن پرست نے جامِ شہادت قبول کر لیا اور وہ ہنستے ہوئے پھانسی کے تختہ پر چڑھ گئے۔

تحریک میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ ہندوؤں کی شمولیت اور سیکولر خیالات کے فروغ میں غدر پارٹی اور اس کے رہنماؤں نے اہم رول ادا کیا۔

بلونت سنگھ

پنجاب کے باشندے تھے اور کناڈا چلے گئے تھے۔ وہاں کی حکومت ہندوستانیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتی تھی۔ محبِ وطن بلونت سنگھ نے اس کی مخالفت کی تو وہ حکومت کناڈا کی نظر میں خار کی طرح کھٹکنے لگے۔ وطن عزیز کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں شدت پیدا کرنے کے لئے وہ ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ انگریزی حکومت ان کی وطن پرستانہ سرگرمیوں کو برداشت نہیں کر سکی اور بالآخر لاہور سازش کے مقدمہ میں دیگر محبانِ وطن کے ساتھ بلونت سنگھ کو بھی تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

سوہن لال پاٹھک

کا تعلق بھی غدر تحریک سے تھا اور غدر پارٹی کی جانب سے پاٹھک جی کو برما میں غدر کا پروپیگنڈہ کرنے کی ذمّہ داری سونپی گئی تھی۔ برما آکر آپ نے فوج میں کام شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ انگریز حکمرانوں کو اُن کی یہ سرگرمیاں ناپسند تھیں لہٰذا اگست 1914 میں اُنھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور مقدمہ چلایا گیا۔ جب پاٹھک جی سے کہا گیا کہ "معافی مانگو تو چھوڑ دیا جائے گا" تو آپ نے کہا تھا کہ "اگر معافی مانگنی ہو تو انگریز ہی مجھ سے معافی مانگیں۔ اصل مجرم تو وہ ہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" ظاہر ہے انگریز جج آپ کی صاف گوئی سے ناراض ہوا ہوگا۔ بہرحال تحریک آزادی کے اس سرفروش کو سزائے موت سُنائی گئی اور پاٹھک جی مسکراتے ہوئے پھانسی کے تختے پر لٹک گئے۔

بنتا سنگھ

سگوال ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے اور تعلیم کے بعد پہلے چین اور پھر امریکہ گئے وہاں وہ آزادیٔ ہند کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ آپ نے انگریزی سرکار کے وفادار ایک تھانیدار کے غیر مہذبانہ رویّہ پر اُسے گولی مار دی تھی۔ بنتا جی نے دوآبہ میں غدر پارٹی کے مشہور لیڈر بھائی پیارا سنگھ کے ساتھ ملک کی آزادی کے لئے سخت جانفشانی کی تھی۔ انگریز حکمرانوں کو آپ کی تلاش تھی لیکن بنتا سنگھ روپوش ہو کر آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ افسوس ایک غدّارِ وطن نے اُنھیں گرفتار کرا دیا۔ آپ کو لاہور لایا گیا اور پھانسی کی سزا سُنائی گئی جسے سُن کر بنتا جی نے ہنستے ہوئے کہا تھا "آخر یہی تو ہونا تھا" بعد ازاں اُنھیں سولی پر لٹکا دیا گیا۔

پاٹھک جی نے کہا "اگر معافی مانگنی ہو تو انگریز ہی مجھ سے معافی مانگیں اصل مجرم تو وہ ہیں

ڈاکٹر متھرا سنگھ

کی پیدائش 1884 میں ڈھڈیاں ضلع جہلم میں ہوئی تھی۔ طب کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد آپ ڈاکٹری کرنے لگے اور ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کے لئے غدر پارٹی کے رہنما راش بہاری جی کے ساتھ کام بھی کرنے لگے۔

اُودھم سنگھ

کی پیدائش امرتسر کے موضع کیسل میں ہوئی تھی۔ وہ امریکہ گئے اور وہاں غدر پارٹی کے ممبر بن گئے تھے اور پارٹی کے حکم پر ہی اپریل 1915 میں ہندوستان واپس آئے۔ یہاں لاہور سازش کیس میں گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ اودھم سنگھ جی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور اُنھیں کالے پانی کی سزا دی گئی۔ وہ چند سال انڈمان جزائر میں رہے۔ 1921 میں اودھم سنگھ کو بیلاری جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک روز وہ اس جیل سے فرار ہو گئے اور وہاں سے کابل پہونچ گئے۔ لیکن اودھم سنگھ جی تو ہندوستان میں رہ کر جدوجہد آزادی کے لئے کام کرنا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے افغانستان سے ہندوستان آنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی وہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوئے انگریزوں کے ایک ایجنٹ نے اس مجاہدِ آزادی کو گولیوں سے بھون دیا اور وہ وہیں شہید ہو گئے۔

محمّد برکت اللہ

کی پیدائش 1864 میں ہوئی۔ ان کے والد منشی شیخ برکت اللہ ریاست بھوپال میں کام کرتے تھے۔ برکت اللہ نے پہلے کھنڈوا اور بعد ازاں بمبئی میں بطور معلم کام کیا۔ کچھ برس بعد وہ انگلینڈ چلے گئے 1895 میں وہ لیورپول میں تھے جہاں اُن کا تعارف اس وقت کے امیرِ کابل کے بھائی سردار نصر اللہ خاں سے ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ برکت اللہ کے ذریعے انگریزوں سے متعلق رپورٹ اپنے بھائی کو بھیجتے تھے۔ 1903 میں برکت اللہ امریکہ چلے گئے اور وہاں سے فروری 1909 میں اُنھیں ٹوکیو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ 1911 میں وہ روس اور قاہرہ بھی گئے۔ برکت اللہ ایک سچّے سرگرم و فعّال محبِ وطن تھے۔ انگریز ان کی جدوجہد آزادی سے پریشان ہو گئے تھے کیونکہ غدر پارٹی میں شمولیت کے بعد برکت اللہ کی انگریز مخالف سرگرمیوں میں بے انتہا شدت پیدا ہو گئی تھی۔ آپ نے مسلمانوں میں نئے حالات کا شعور اور اسلامی اخوت پیدا کرنے کی کوشش کی اُنھیں جدوجہد آزادی میں تن من دھن سے کود پڑنے کی ترغیب دی۔ برکت اللہ نے اپنے اخبار "دی اسلامک فریٹرنیٹی (اسلامی اخوت) میں لکھا تھا کہ "انگریز ہندوستان کے دشمن ہیں، ان کو ہندوستان سے باہر کر دینا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔"

برکت اللہ جب جاپان میں تھے تو ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے حکومت جاپان کو لکھا کہ وہ برکت اللہ کے خلاف سخت کارروائی کرے۔ نتیجتاً جاپانی حکمرانوں نے ٹوکیو یونیورسٹی سے اُن کے کنٹریکٹ کو ختم کرا دیا اور ان کو جاپان چھوڑنا پڑا۔ بہرحال اس محبِ وطن نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے کوئی کسر اُٹھا کر نہیں رکھی اور اپنی ساری زندگی مادرِ وطن کی نذر کر دی۔

سعید بابو

آپ کی ولادت 1908 میں موضع دہانگرے ضلع پونہ (مہاراشٹر) میں ہوئی تھی۔ سعید بابو تعلیم تو درجہ چہارم تک ہی حاصل کر پائے تھے لیکن حب الوطنی کی کتاب آپ کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ گھر کے معاشی حالت اچھی نہیں تھی لہٰذا آپ ایک مل میں مزدور کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ 1930 کی تحریکِ سول نافرمانی میں سعید بابو نے سرگرم حصّہ لیا۔ نمک ستیہ گرہ میں شرکت کی نیز شراب اور غیر ملکی کپڑا فروخت کرنے والوں کی دوکانوں پر دھرنا دیا۔ 12 دسمبر 1930 کو پرنس اسٹریٹ بمبئی کے نزدیک ایک کپڑے کے گودام پر غیر ملکی کپڑے سے لدے ہوئے ایک ٹرک کے سامنے وہ لیٹ گئے اور کچلے گئے۔ وہ اُسی روز جی ٹی اسپتال بمبئی میں زخموں کی تاب نہ لا کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ اس شہیدِ وطن کی یاد میں اس گلی کو ان کا نام دے دیا گیا جس میں وہ زخمی ہوئے تھے۔ سعید بابو کے گاؤں میں اُن کا ایک مجسمہ نصب کیا گیا ہے اور اُن کی یاد میں ایک اسکول

قائم ہے۔

عبدالکریم غلام جیلانی

2 اکتوبر 1904 کو موضع ایگر چار ضلع ڈھاکہ بنگال (حالیہ بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئے آپ کے والد چودھری غلام محمد جیلانی بھی مئے حب الوطنی سے سرشار تھے۔ 1921 میں گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون شروع کی جس میں عبدالکریم جیلانی نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ 1930 کی سول نافرمانی تحریک میں شمولیت کی پاداشں میں انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا جہاں ان کو دیگر سیاسی قیدیوں کے ساتھ ایذائیں دی گئیں۔ عبدالکریم کی حالت خراب ہوگئی لیکن جیل کے حکام نے ان کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ نتیجتاً 10 فروری 1932 کو گاندھی جی کا یہ شاگرد مجاہد آزادی ڈھاکہ جیل میں اپنے وطنِ عزیز پر قربان ہو کر ابدی نیند سوگیا۔

22 اگست 1948 کو شہر حیدرآباد میں نظام کے غلام رضاکاروں نے شعیب صاحب کو اتنا مارا کہ وہ شہید ہوگئے۔ رضاکاروں نے اُن کے ہاتھ قلم کر دیے تھے۔

اشفاق اللہ خاں

کی پیدائش اکتوبر 1900 میں شاہ جہاں پور اتر پردیش میں ہوئی تھی۔ آپ نے آٹھویں درجے تک تعلیم پائی آپ کے والد کا نام شفیق اللہ تھا۔ اشفاق اللہ نے طالب علمی کے زمانے سے ہی برطانوی حکومت کے خلاف وطن پرستانہ سرگرمیوں میں نمایاں طور پر حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ بعد میں آپ ایک انقلابی جماعت موسومہ ہندوستانی ریپبلکن ایسوسی ایشن کے رکن بن گئے تھے۔ 9 اگست 1925 میں انھوں نے کاکوری میل ڈکیتی اور شیر گنج بچپور اور رامین پوری وغیرہ پر انقلابیوں کے چھاپوں میں شرکت کی۔ انگریز حکومت اشفاق اللہ اور ان کے دیگر انقلابی ساتھیوں کے خلاف سرگرم عمل ہوگئی اور بالآخر انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ انھیں اور ان کے رفقا کو سزائے موت دی گئی اور 3 اپریل 1927 کو فیض آباد جیل میں اس مجاہد آزادی کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

اسد اللہ گلگر

1906 میں شری نگر، ریاست جموں وکشمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جناب غفار بٹ گلگر بھی محب وطن تھے۔ اسد اللہ ایک معمار اور سیاسی کارکن تھے۔ انھوں نے ریاست جموں وکشمیر میں انگریزوں کی کٹھ پتلی حکومت کی بجائے عوامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے والی سیاسی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ 1931 میں وہ مطلق العنان حکومت کے خلاف جامع مسجد شری نگر میں ہونے والے ایک مظاہرے میں شریک ہوئے۔ ریاستی فوج کے سپاہیوں نے مظاہرین پر بے دردی سے لاٹھی چارج کیا جس میں اسد اللہ سمیت متعدد محبان وطن زخمی ہوئے۔ اسد اللہ بُری طرح زخمی ہوگئے تھے۔ نتیجتاً زخموں کی تاب نہ لا کر وہ فوت ہوگئے۔

علی محمد پٹھان

بھی ریاست جموں وکشمیر کے شہر شری نگر میں 1229 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب محمد سلطان پٹھان وطن پرست تھے۔ جب علی محمد درجہ آٹھ کے طالب علم تھے تب سے ہی آپ نے اپنی ریاست میں عوامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے والی نیشنل کانفرنس کی سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور اسی لئے وہ اپنی تعلیم کو مزید جاری نہیں رکھ سکے۔ 1946 میں علی محمد کشمیر میں مطلق العنان حکومت کے خلاف خانقاہ معلیٰ شری نگر کے ایک مظاہرے میں شریک ہوئے۔ وہاں کے راجہ کی پولیس نے مظاہرین پر اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ فائرنگ کے دوران علی محمد کے جسم میں پانچ گولیاں لگیں اور وہ وہیں شہید ہو گئے۔

محمد عبدالقادر

کی پیدائش 15 مئی 1917 میں موضع دکوم ضلع تروینادرم ریاست کیرالا میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد کا نام واوا کنجو تھا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ریاست تراونکور میں انگریزوں کی غلام حکومت کی بجائے عوامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے والی عوامی تحریک 1938 میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1938 میں مطلق العنان حکومت کے خلاف طالب علموں کے ایک مظاہرے کی تنظیم و سربراہی کی۔ دوسری جنگِ عظیم سے قبل وہ ملایا چلے گئے۔ 1942 میں عبدالقادر آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے، اوائل 1942 میں ایک مخبری کی ذمہ داری لے کر ایک آبدوز کشتی کے ذریعے کالی کٹ کے ساحل پر اُترے لیکن برطانوی حکام نے انھیں تاڑ کر گرفتار کرلیا۔ ان پر غیر ملکی طاقت کے حق میں مخبری کرنے کا الزام عائد ہوا۔ عدالت نے انھیں سزائے موت دی۔ 15 ستمبر 1943 کو مدراس کے اصلاحی قید خانے میں انھیں کو پھانسی دے دی گئی۔

غلام نبی شول

کا جنم 1929 میں شری نگر ریاست جموں وکشمیر میں ہوا تھا اور آپ کے والد قادر شال ایک وطن دوست تاجر تھے۔ غلام نبی ایک دیانت دار دوکاندار اور نیشنل کانفرنس کے سیاسی کارکن تھے۔ ریاست جموں وکشمیر میں عوامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے والی نیشنل کانفرنس کی سیاسی تحریک میں غلام نبی نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ یہ تحریک 1940 میں اپنے شباب پر تھی اور تمام وطن پرست کشمیری اس میں شامل تھے۔ اس وقت کشمیر میں مطلق العنان انگریزوں کی پٹھو حکومت تھی جو ریاست کے عوام پر جبر و ظلم کرتی رہتی تھی۔ لہٰذا اس حکومت نے نیشنل کانفرنس کی تحریک کو بُری طرح سے کچلنے کا فیصلہ کیا۔ جلسوں جلوسوں پر لاٹھیاں اور گولیاں برسائی گئیں، قوم پرست افراد کے ساتھ غلام نبی کو بھی گرفتار کر کے شری نگر کی سنٹرل جیل میں قید کر دیا گیا۔ جیل کی سختیوں اور مصیبتوں کو برداشت کرتے کرتے ایک روز غلام نبی شول اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔

شعیب اللہ خاں

کی ولادت 17 اکتوبر 1930 کو بمقام مُبرادید ضلع کھم ریاست آندھرا پردیش میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام حبیب اللہ خان تھا۔ شعیب صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے گریجویشن کیا اور ہفتہ وار اُردو اخبار "تاج" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بعد ازاں اُردو روزنامہ "رعیت" کے نائب مدیر ہو گئے۔ قوم پرستانہ پالیسیوں کی وجہ سے جب انگریز دوست حکومتِ نظام نے ان جرائد کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی تو شعیب صاحب نے اُردو روزنامہ "امروز" کی اشاعت شروع کی۔ وہ ریاست حیدرآباد کو انڈین یونین میں ضم کرنے والی عوامی تحریک 48-1947 کی اپنے اخبار کے ذریعے حمایت کرتے رہے۔ نتیجتاً 22 اگست 1948 کو شہر حیدرآباد میں نظام کے غلام رضاکاروں نے شعیب صاحب کو اُن کے گھر کے قریب اتنا مارا کہ وہ شہید ہو گئے۔ رضاکاروں نے ان کے ہاتھ قلم کر دیے تھے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

علی محمد ریشی

کی پیدائش 1906 میں موضع ملک ناگ ضلع اننت ناگ (ریاست جموں وکشمیر) میں ہوئی۔ آپ کے والد جناب ولی ریشی بھی وطن پرست تھے۔ علی محمد صاحب نویں درجے کے طالب علم تھے تب سے آپ نے وطن پرستانہ تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ریاست جموں وکشمیر میں انگریز نواز حکومت کی بجائے عوامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے والی سیاسی تحریک میں علی محمد ریشی نے سرگرمی سے کام کیا۔ 1931 میں مطلق العنان حکومت کشمیر کے خلاف ملک ناگ میں ایک بڑا مظاہرہ کیا گیا۔ مظاہرہ کے لئے جلوس نکالا گیا تو ریاستی فوج کے سپاہیوں نے جلوس پر بے دریغ گولیاں برسائیں۔ 25 سالہ جوان علی محمد ریشی بھی گولیوں کا نشانہ بن گئے اور اُسی روز آپ نے جام شہادت نوش کیا۔



مجاهد آزادی

جتیندر ناتھ داس

جتیندر داس کی پیدائش 27 اکتوبر 1904 کو کلکتہ میں ہوئی تھی۔ 1991 میں گاندھی جی کی تحریکِ عدم تعاون شروع ہوئی تو جتیندر جی نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

ڈاکٹر مہیش نارائن شرما

بغیر کھانے کے کیسے زندہ رہیں گے؟ پُرشوتم داس نے جب مجاہدِ آزادی جتیندر ناتھ داس سے پوچھا تھا تو انھوں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا تھا "اپنی قوتِ ارادی سے!" اُس وقت یہ شہیدِ آزادی لاہور جیل میں سیاسی قیدیوں کی حالت میں بہتری کے لئے بھوک ہڑتال پر تھے۔ اُن پر کھانا کھانے کے لئے مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا تھا لیکن جتیندر ناتھ اپنے عہد پر برقرار رہے۔

جتیندر داس کی پیدائش 27 اکتوبر 1904 کو کلکتہ میں ہوئی تھی۔ وہ ایک ذہین اور محنتی طالب علم رہے اور میٹرک و انٹرمیڈیٹ کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ 1919 میں گاندھی جی کی تحریکِ عدم تعاون شروع ہوئی تو جتیندر جی نے اُس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اُنھیں جنوبی کلکتہ کی کانگریس یونٹ کا معاون سکریٹری مقرر کیا گیا۔ وہ کئی بار جیل گئے تاہم پُرعزم جتیندر اپنی گرفتاری کے باوجود ہندوستانیوں کے استحصال کے خلاف جدّوجہد کرتے رہے۔ جب انھیں میمن سنگھ جیل میں بھیجا گیا تو انھوں نے سیاسی قیدیوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے خلاف 20 روز تک کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

1928 میں کلکتہ میں کانگریس اجلاس کے دوران جتیندر داس نے "رضا کار فوج" تشکیل دے کر اپنی تنظیمی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ اُنھیں بم بنانے کا ہُنر بھی معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابی ان سے مدد لیتے تھے۔ 14 جون 1929 کو سانڈرس کے قتل کے شبہ میں جتیندر کو کلکتہ میں گرفتار کیا گیا اور اُنھیں لاہور جیل بھیج دیا گیا۔ یہیں پر انھوں نے اپنی تاریخی بھوک ہڑتال شروع کی۔ اُن کے اس عمل سے ملک کی ہر عظیم شخصیت متفکر ہو گئی تھی اور بھگت سنگھ، سبھاش چندر بوس وغیرہ جیسے محبّانِ وطن نے کوشش کی تھی کہ جتیندر داس کچھ کھا لیں تاکہ وہ زندہ رہیں اور جدوجہد آزادی میں سرگرم شرکت کر سکیں۔ لیکن جتیندر نے سیاسی قیدیوں کی حالت میں سُدھار کی شرط پوری کرائے بغیر بھوک ہڑتال ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹروں نے انھیں مصنوعی طریقے سے غذا دینے کی کوشش کی لیکن جتیندر داس نے اس عمل کی مزاحمت کی اور انجکشن کے ذریعے دوا یا غذا اپنے جسم میں نہیں پہونچنے دی۔ ہڑتال کے آخری دنوں میں اُن کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی اور وہ نہایت نحیف آواز میں سوالات کے جواب دے پاتے تھے۔ دراصل وہ جسمانی لحاظ سے جتنے کمزور اور لاغر ہو رہے تھے اُن کی قوتِ ارادی اتنی ہی مضبوط اور طاقتور ہو رہی تھی۔ اپنے اس رہنما کی جان بچانے کے لئے ملک کے عوام بے چین تھے لیکن ان کے عزمِ مستحکم کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے تھے۔ جیوں جیوں جتیندر جی کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ویسے ویسے انگریز حکومت کی گھبراہٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لئے حکومت پنجاب نے لاہور کے ضلع مجسٹریٹ کو ہدایت دی تھی کہ اگر جتیندر داس کی جانب سے ضمانت کی درخواست آئے تو وہ اس کی مخالفت نہ کریں۔ لیکن جتیندر جی کے بھائی نے اپنے بھائی کی ضمانت پر رہائی کو قبول نہیں کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی برادرانہ محبت اُن کے مجاہد بھائی کی عظیم قربانی کی راہ میں رُکاوٹ بنے۔

آخر میں وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ یہ عظیم مجاہدِ آزادی 13 ستمبر 1929 کو اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ سوگوار عوام اپنے اس عظیم شہید کا آخری دیدار کرنے کے لئے جوق در جوق آ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں اشک تھے لیکن دلوں میں بغاوت کا طوفان۔ لاہور سے کلکتہ تک اُن کا جنازہ نہایت عقیدت و احترام سے لے جایا گیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جتیندر داس کے جلوس جنازہ میں 5 لاکھ سے زائد افراد شریک ہوئے تھے۔ کانپور میں جواہر لال نہرو نے ریل کے ڈبے میں جاکر جتیندر کے جسدِ خاکی کو سر جُھکا کر خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ ڈیلی میل، بامبے کرانیکل اور ٹائمس آف انڈیا جیسے بڑے اخبارات نے جتیندر داس کو اپنے اداریوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ غیر ممالک کے باشندوں نے بھی اُن کی موت پر اظہارِ تعزیت کیا تھا۔

صوبۂ متحدہ آگرہ، اودھ، پنجاب، بنگال اور ملک کے دیگر صوبوں میں جتیندر داس کے سوگ میں جلوس نکالے گئے تھے اور ہڑتالیں کی گئی تھیں۔ آج بھی ہندوستانی عوام اُن کے جذبۂ قربانی، وطن پرستی اور مضبوط قوتِ ارادی سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جتیندر داس کے جلوسِ جنازہ میں 5 لاکھ سے زائد افراد شریک ہوئے تھے۔ کانپور میں جواہر لال نہرو نے ریل کے ڈبے میں جاکر جتیندر کے جسدِ خاکی کو سر جُھکا کر خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ غیر ممالک کے باشندوں نے بھی اُن کی موت پر اظہارِ تعزیت کیا تھا۔

جائزہ

1947 تا 1992

یادگار واقعات

ڈاکٹر کبیر کوثر

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ برِ صغیر کے دو ٹکڑے اس اُمیدِ موہوم پر ہو گئے کہ دونوں اقوام صلح و صفائی ـــــ امن و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کریں گی لیکن انجام امیدوں کے برعکس ہوا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی گھروں سے سڑکوں پر آ گئی۔ عوام ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ صدیوں کا بھائی چارہ ایک خواب سا بن گیا۔ لوگوں کے دل بدل گئے، مکانوں کے مکین بدلے ایک دوسرے کے پیمانوں کے اصول اور ضوابط ہی نہیں بدلے بلکہ دیرینہ روایات کو بغیر کفن کے یا تو دفن کر دیا گیا یا چِتاؤں میں بھسم کر دیا گیا۔ بہرکیف صورت حال میں سدھار پیدا ہوا۔ رِستے ہوئے ناسور مرہمِ اخوت سے بھرنے لگے۔

ملک میں 1957 کے دوران دوسرے عام انتخابات کے نتیجے میں کانگریس پھر برسرِ اقتدار آئی۔ اس سال کا سب سے اہم واقعہ 4 جنوری کو کانگریس کا 62واں سیشن تھا جو اندور، مدھیہ پردیش میں منعقد ہوا۔ میں نے اس سیشن کے دوران نہرو جی اور شیخ عبداللہ کو ایک ہی کار میں بلا حفاظتی دستوں کے گھومتے پھرتے دیکھا تھا

ڈاکٹر راجندر پرشاد جمہوریۂ ہند کے صدر اور جواہر لال نہرو ہندوستان کی وزارتِ عظمیٰ کے لیے پھر سے چُن لیے گئے اور پارلیمنٹ نے سیاسی، معاشی، سماجی حالات میں سدھار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ 1957 میں ناپ اور وزن کے لیے میٹرک سسٹم نافذ کیا گیا 1960 میں انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر صوبہ بمبئی کو مہاراشٹر اور گجرات میں تقسیم کر دیا گیا۔

آزاد ہندوستان کے ماتھے پر جو پرتگالی مقبوضات گوا، دمن اور دیو کی شکل میں تھے انھیں 1961 میں مکمل طور پر صاف کر دیا گیا 1962 میں تیسرے عام انتخابات میں کانگریس پھر برسرِ اقتدار آئی اور ایک بار پھر راجن بابو اور نہرو جی صدر و وزیر اعظم کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ اسی سال ہندی چینی بھائی بھائی کے فلک شگاف نعرے فضاؤں میں معدوم ہو گئے۔ چین نے 19 ستمبر کو ہندوستان کی سرحدوں پر حملہ کر کے دیرینہ روایات کو پامال کر دیا۔

1963 میں تین اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ فروری کو راجن بابو کی موت واقع ہو گئی۔ مرارجی ڈیسائی نے گولڈ کنٹرول آرڈر کا نفاذ کر کے سونے کے تاجروں میں ہلچل پیدا کر دی اور ناگالینڈ ہندوستان کا ایک صوبہ بن گیا۔ اگلے سال 27 مئی کو جواہر لال کی بھی موت ہو گئی۔ ان کی جگہ مرارجی ڈیسائی اور لال بہادر شاستری کے



آزاد ہندوستان کے ماتھے پر جو داغ پرتگالی مقبوضات گوا، دمن اور دیو کی شکل میں تھے انھیں 1962 میں مکمل طور پر صاف کر دیا گیا۔

درمیان کشمکش کا باعث ہوئی اور شاستری جی ہندوستان کے وزیر اعظم بن گئے۔

1960 میں ہند پاک جنگی جھڑپ رَن آف کچھ میں ہوئی جو 30 جون کو ختم ہو گئی۔ 1966 کی جنگ کو ختم کرانے کے لیے تاشقند کانفرنس میں پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خاں اور ہندوستان سے وزیر اعظم لال بہادر شاستری شریک ہوتے اسی کانفرنس کے دوران 11 جنوری کو شاستری جی فوت ہو گئے جس نے ہندوستان کو رنج والم کی چادر میں ڈھانپ لیا۔ 8 دن بعد شریمتی گاندھی کو بھارت کا وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا۔ اور پھر نہرو خاندان، راجیو گاندھی کے قتل تک کم و بیش حکمرانی کرتا رہا۔ ہریانہ اور پنجاب بھی علیحدہ علیحدہ صوبے بن گئے۔

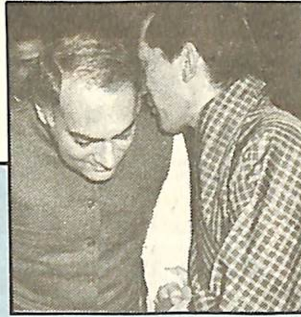
1967 کے چوتھے عام انتخابات نے شریمتی گاندھی کو وزیر اعظم برقرار رکھا جبکہ صدارت کی کرسی پر ڈاکٹر ذاکر حسین متمکن ہو گئے۔ دو سال بعد صوبہ مدراس تامل ناڈو کہلایا۔ اُسی سال 1969 میں، ڈاکٹر صاحب موصوف اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کی جگہ 20 ، اگست کو وی۔ وی۔ گری کو صدر چُن لیا گیا۔ اس سال ملک کے چودہ اہم بینک قومیائے گئے اور کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی۔ اقتدار اندرا کانگریس کے پاس ہی رہا جس نے سابق رؤسائے ہند کے خصوصی اختیارات کے ساتھ ساتھ ان کے صرفِ خاص کو بھی مسقوط کر دیا۔

1971 میں دنیا کے نقشے پر ایک اور ملک اُبھرا جس کا نام بنگلہ دیش ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی افواج میں جنگ چھڑی جو 17 دسمبر کو اختتام پذیر ہوئی۔ اگلے سال منی پور، میگھالیہ اور تری پورہ کے صوبوں نے تشکیل پائی۔ مدھیہ پردیش کے جنگجو ڈاکوؤں نے جے پرکاش نرائن کی مساعی سے خود کو حکومت کے حوالے کر دیا۔ اسی سال ملک کی مشہور و معروف سیاسی ہستی سی راج گوپال آچاری رحلت کر گئے۔ یکم نومبر کو صوبہ میسور کا نام کرناٹک رکھ دیا گیا۔

20 اگست 1974 کو فخرالدین علی احمد کو صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے چن لیا گیا۔ اس سے قبل 18 مئی کو راجستھان میں پوکران کے مقام پر کامیاب ایٹمی تجربہ کیا گیا۔ 2 جنوری 1975 کو سمستی پور میں دہشت گردوں نے ایل، این، مصرا ریلوے منسٹر کو ایک بم کے ذریعے ہلاک کر کے ملک میں سیاسی تشدد کی تحریک کا آغاز کیا جس نے بعد کے سالوں میں عوامی روپ دھارن

کرلیا۔ کشمیر، پنجاب، آسام میں ایسے ہی واقعات اسی کے دہے میں رو پذیر ہونا شروع ہو گئے۔ اسی سال 17 جنوری کو سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن اجل کا شکار ہو گئے۔ شریمتی گاندھی نے بیس نکاتی پروگرام کو قوم کے سامنے رکھا۔ 16 مئی کو ریاست سکم برضا و رغبت ہندوستان میں شامل ہو کر بائیسواں صوبہ بن گئی۔ آر۔ ایس۔ ایس، جماعتِ اسلامی آنند مارگ اور دیگر بئیس جماعتوں پر حکومتِ ہند نے پابندی عائد کردی۔ 26 ستمبر کو کلکتہ اور مدراس میں دوردرشن کا افتتاح ہوا۔ 2 اکتوبر کو "کامراج پلان" کے شہرت یافتہ کے۔ کامراج اِس دنیا سے چل بسے۔ 24 کو جبری مزدوری کی دیرینہ مذموم رسم کے خاتمے کا قانون نفاذ پذیر ہوا جس سے بندھوا مزدوروں کی صفوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا ہی تاریخ ساز واقعہ 2 نومبر 1976 میں رو پذیر ہوا جبکہ دستورِ ہند میں 42 ویں ترمیم کے ذریعے ہندوستان کو سوشلسٹ سیکولر ری پبلک قرار دے دیا گیا

1977 میں فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ انتقال کر گئے۔ 20 جون 1975 کو کانگریسی حکومت نے ایمرجنسی نافذ کردی۔ اندرا جی مستعفی ہوئیں اور ملک میں جن سیاسی، مذہبی جماعتوں پر پابندی لگائی گئی تھی اُٹھا لی گئی۔ جنتا پارٹی کے لیڈر مرارجی ڈیسائی وزیرِاعظم بنے بعد میں شریمتی گاندھی جیل میں بند کردی گئیں لیکن جلد ہی انھیں رہا کر دیا گیا۔



1980 کا آغاز ہوا بیسویں صدی کا یہ دہائے شمار حادثات کا شکار بنا جن کے نتائج میں مسز گاندھی سنجے گاندھی اور 1991 میں راجیو گاندھی لقمۂ اجل بن گئے

گاندھی اور 1991 میں راجیو گاندھی حادثات کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بن گئے۔ اس سال کے آغاز میں 10 جنوری کو مسز گاندھی لوک سبھا میں دو تہائی اکثریت سے داخل ہوئیں اور 10 جنوری کو انھوں نے اپنی وزارت کی تشکیل کی۔ 18 کو آسام میں احتجاجی ہنگاموں کے باعث فوج کو تعینات کیا گیا۔ دیگر ہنگامی صورت حالات کے باعث بہار، اڑیسہ، مدھیہ پردیش، راجستھان، گجرات اور پنجاب میں 17 فروری کو صدر راج نافذ کر دیا گیا۔ 6 اپریل کو بھارتیہ جنتا پارٹی وجود میں آئی اور باجپئی جی پارٹی کے صدر چنے گئے۔ 24 کو بابا گور بچن سنگھ نرنکاری بابا کو قتل کر دیا گیا تو ان کے سپوت کو ان کا جانشین تسلیم کر لیا گیا۔

13 جون کو سنجے گاندھی کو کانگریس (آئی) کا جنرل سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ لیکن دس دن بعد وہ ایک ہوا بازی کے دوران ہلاک ہو گئے۔ سابق صدر وی۔ وی۔ گری بھی 24 جون کو راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔

1981 کے آغاز میں 17 جنوری کو میزورم کو ریاستی درجہ دیا گیا۔ 26 جنوری کو وایودوت نامی تیسری ہندوستانی ایئر لائن کا افتتاح کیا گیا۔ 5 اگست کو جگ جیون رام کانگریس (یو) سے منحرف ہو کر کانگریس (جے) کے صدر بن گئے۔ اُن کی جگہ شرد پوار 20 اگست کو کانگریس (یو) کے صدر ہو گئے۔ اس سے دو ماہ قبل 30 جون کو



13 جون کو سنجے گاندھی کو کانگریس (آئی) کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا لیکن 10 دن بعد وہ شہری ہوابازی کے دوران حادثے کا شکار ہو گئے۔

تاریخ ساز واقعہ 2 نومبر 1976 میں رو پذیر ہوا جبکہ دستورِ ہند میں 42 ویں ترمیم کے ذریعے ہندوستان کو سوشلسٹ سیکولر ری پبلک قرار دیا گیا۔

2 فروری کو کانگریس (آئی) کا الیکشن لڑنے کے لیے "ہاتھ" کا نشان منظور کر لیا گیا۔ لوک سبھا سے مسز گاندھی کا اخراج ہوا۔ انھیں پھر جیل ہوئی۔ 19 سے 26 دسمبر تک وہ حوالات میں رہیں۔

1979 میں پہلا مانسونی تجرباتی راکٹ روہنی 200 تھمبا سے داغا گیا۔ مرارجی نے 15 جولائی کو وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دیدیا اور چودھری چرن سنگھ وزیرِاعظم بنائے گئے۔ 21 اگست کو صدر نے پارلیمنٹ توڑ دی لیکن چودھری صاحب نگراں وزیرِاعظم بنے رہے۔ اسی سال 8 اکتوبر کو جے پرکاش نرائن نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔

1980 کا آغاز ہوا۔ بیسویں صدی کا یہ دہے شمار حادثات کا شکار بنا جن کے نتائج میں مسز گاندھی، سنجے آسام میں صدارتی حکومت قائم ہوئی۔ 29 ستمبر کو پانچ سکھ دہشت گردوں نے انڈین ایئر لائنز بوئنگ کا اغوا کیا اور مع 117 مسافروں کے لاہور پہنچ گئے، لیکن پاکستانی حکمرانوں نے پانچوں ہائی جیکروں کو حراست میں لے لیا۔ 1982 میں 21 ممبران پر مشتمل ٹیم 14 جنوری کو انٹارٹکا میں اُتری ——— 19۔ مارچ کو آچاریہ جے۔ بی۔ کرپلانی بعمر 94 سال راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔

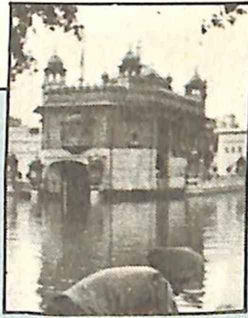
25 جولائی کو گیانی ذیل سنگھ نے ہندوستانی جمہوریہ کی صدارت سنبھالی۔ 7 ستمبر کو 77 سال کی عمر میں جموں کشمیر کے وزیراعظم شیخ عبداللہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اکتوبر 8 کو ہندوستانی فوجی فضائیہ نے اپنی پچاسویں سالگرہ بڑے جوش و خروش سے منائی۔ ہندوستان میں ریاستوں اور مرکز کے درمیان چپقلشوں کے سدھار کے لیے ایک نفری کمیشن مارچ 24 کو جسٹس آر۔ ایس سرکاریہ کی نگرانی میں مقرر کیا گیا۔ اگلے سال یعنی 1984 میں مدراس نے اپنے نام سے ایک یونیورسٹی کو ڈاک کنال، مدراس میں قائم کی۔ مئی 9 کو نودورجی نے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ بغیر آکسیجن کے سر کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

پنجاب میں دہشت گردوں کی سرگرمیاں تیز ہو جانے پر مرکزی حکومت نے ان کی سرکوبی کے لیے اسے فوج کے حوالے کر دیا۔ آپریشن بلیو اسٹار میں بہت سے انتہا پسند سنت جرنیل سنگھ بھنڈراں والے اور کچھ دوسرے لوگ مارے گئے اور امرتسر گوردوارے پر سرکاری کنٹرول ہو گیا۔ 22 اگست کو ونکٹ رمن جمہوریہ ہند کے آٹھویں نائب صدر منتخب کر لیے گئے۔ 20 ستمبر کو گولڈن ٹیمپل سے فوج ہٹائی گئی اور اکال تخت کی مکمل مرمت عمل میں آئی۔

31 اکتوبر کو مسز گاندھی کے قتل کے بعد کانگریس نے اُن کے بڑے بیٹے راجیو گاندھی کو ہندوستان کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر بٹھا دیا۔ شریمتی گاندھی کے قتل پر 2 نومبر کو بھاری پیمانے پر ہنگامے ہوئے اور کئی سکھوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔

اسی سال 1984 میں 3 دسمبر کو بھوپال میں یونین کاربائڈ کے کارخانے سے خوفناک زہریلی گیس کے اخراج نے قیامتِ صغریٰ برپا کر دی۔ ہزاروں آدمی راتوں رات ہلاک ہوئے اور بے گنتی انسانوں کو اس مہلک گیس نے بری طرح متاثر کر دیا۔

• 1985 میں یکم فروری کو لگاتار تین کرکٹ میچوں میں سینچری بنانے پر محمد اظہر الدین کو کرکٹ ہسٹری کا پہلا کھلاڑی تسلیم کر لیا گیا۔ دسمبر میں صدر ضیا الحق مرحوم اور آنجہانی راجیو گاندھی کے درمیان دہلی میں ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت دونوں ملکوں نے ایک دوسرے پر ایٹمی ہتھیاروں سے حملہ نہ کرنے کی رضامندی کا اظہار کیا۔ اسی سال کانگریس نے اپنی ایک صدی پورا کرنے کا یوم منایا۔



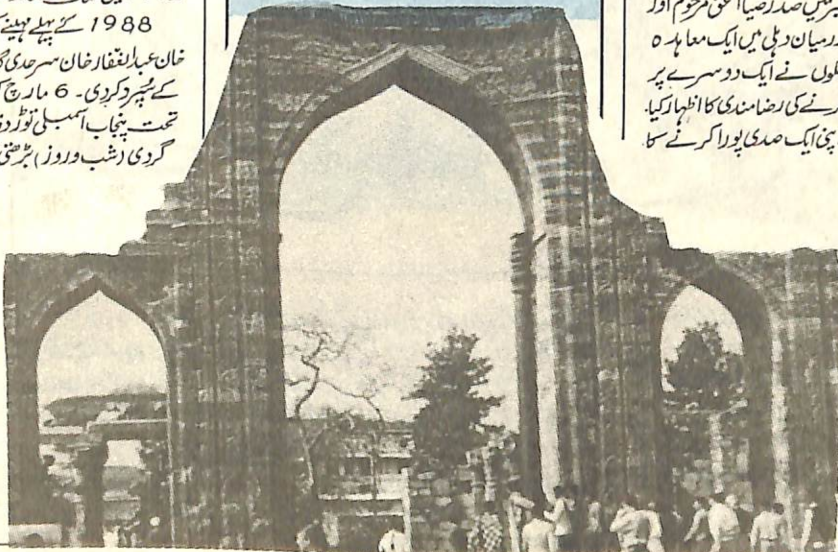


پنجاب میں دہشت گردوں کی سرگرمیاں تیز ہو جانے پر وہاں کی حکومت کو ان کی سرکوبی کے لیے فوج کے حوالے کر دیا گیا۔

1986 میں پاکستان نے ہندوستان کے ساتھ نجی تجارتی درآمد، برآمد پر لگائی گئی 8 سالہ پابندی منسوخ کر دی لیکن اخبارات، رسل و رسائل پر نفاذ پذیر پابندیاں جاری رہنے دیں جو اب تک جاری و ساری ہیں۔ اس سال بھارتی فضائی طاقت میں مگ 27 کا اضافہ ہوا۔ 8 مارچ کو ایل، کے اڈوانی کو بھارتیہ جنتا پارٹی کا صدر چنا گیا۔ اسی ماہ کی سولہ تاریخ کو چارلس شوبھراج اور اس کے چھ ساتھی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنس جو ہندوستان کی پہلی میڈیکل یونیورسٹی تھی بمقام وجے واڑہ معرضِ وجود میں آئی۔ 5 مئی کو پارلیمنٹ نے مسلم خواتین بل پاس کیا۔ بمبئی کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ایڈز کا مریض جاں بحق ہوا۔ یہ ملک کی تاریخ میں اس مرض کا پہلا شکار تھا۔ 6 ستمبر کو جموں و کشمیر میں افراتفری کے پیشِ نظر چھ ماہ کے لیے صدر راج کے نفاذ کا اعلان ہوا۔

1987 کو اگر بوفورس فیئرفکس کا سال کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا چونکہ اس سال ہندوستان نے سترہ سو کروڑ روپوں کے ہتھیار خریدنے کا سوئیڈن سے معاہدہ کیا تھا جس کے بارے میں سارے ملک میں یہ بات گونج اٹھی کہ اس سودے میں بااثر سیاسی دلالوں نے کروڑوں روپے بطور کمیشن کھا لیے اور سوئیڈن حکومت کی تحقیقاتی کمیٹی نے اس کمیشن کی ادائیگی کی تصدیق تو کر دی لیکن ملوث شدہ مجرمین کی نشاندہی نہیں کی جس کی وجہ سے تاحال یہ گتھی الجھی ہوئی ہے۔ 15 جولائی کو وزیراعظم مذکور نے اپنی کابینہ سے وی۔ سی شکلا، ارون نہرو اور عارف محمد خان کو برخاست کر دیا۔ وی۔ پی سنگھ جو اس وقت وزیرِ مالیات تھے اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ 17 جولائی کو آر۔ وینکٹ رمن بھاری اکثریت سے صدر جمہوریہ ہند منتخب کیے گئے۔ 19 جولائی کو راجیو گاندھی نے وی۔ پی۔ سنگھ کو کانگریس سے نکالے جانے کا حکم صادر کر دیا۔ 14 اگست کو ہندوستان نے خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی کو "بھارت رتن" کے عظیم خطاب سے سرفراز کیا۔ اسی ماہ کی 21 تاریخ کو ڈاکٹر شنکر دیال شرما کو نائب صدر چنا گیا۔ جو جولائی 1992 میں ملک کے صدر منتخب کر لیے گئے۔

1988 کے پہلے مہینے کی 20 تاریخ کو مجاہدِ آزادی خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ 6 مارچ کو صدارتی احکامات کے تحت پنجاب اسمبلی توڑ دی گئی اور پنجاب میں دہشت گردی (شب و روز) بڑھتی چلی گئی۔ مدھیہ پردیش ہائی



کورٹ نے بھیانک گیس اخراج سے متاثرہ لوگوں کو عارضی و جزوقتی طور پر دو سو پچاس کروڑ روپے ادا کرنے کے احکامات یونین کاربائڈ کو صادر کیے۔

18 جون کو لال بہادر شاستری کے صاحبزادے سابق وزیر یو۔پی، سنیل شاستری عام انتخابات کے دوران

ہاکی ٹیم نے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ہاکی گولڈ کپ ایک بار پھر جیت لیا۔ تامل ناڈو میں ڈی ایم کے پارٹی نے عام انتخابات میں بھاری اکثریت حاصل کی۔ انجام کار ایم کرونا ندھی نے 27 جنوری کو وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھایا۔ 9 فروری کو ایجرٹ ڈائرکٹر سنجے خان

اکتوبر 89 کو کیرالا ہائی کورٹ جج بی بی فاطمہ کو سپریم کورٹ کی پہلی خاتون جج مقرر کیا گیا۔

وی۔پی۔ سنگھ سے شکست کھا گئے۔ 28 جولائی کو قومی بیڈمنٹن چیمپین سید مودی کو گولی کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا گیا۔ دوسرے دن دلّی میں ہیضہ وغیرہ جیسے موذی

امراض پر قابو نہ پانے کی پاداش میں لیفٹیننٹ گورنر ایچ۔ ایل۔ کپور کو سبکدوش کر دیا گیا۔ 6 اگست کو سات سیاسی مخالف پارٹیوں نے 'راشٹریہ مورچہ' قائم کیا۔

میسور اسٹوڈیو میں ٹیپو سلطان ٹی وی سیریل فلماتے کے دوران ہوئی آتشزدگی میں بُری طرح جھلس گئے۔ 17 مارچ کو ایچ این بہوگنا چیرمین لوک دل (ب) کی موت واقع ہوئی۔ 22 مئی کو آئی آر بی۔ ایم اگنی نے چاندی پور اُڑیسہ سے کامیاب پرواز کی۔ 16 جولائی کو راجیو گاندھی پاکستان پہنچے۔ گذشتہ 30 برسوں میں ہندوستانی وزیراعظم کی یہ پہلی سرکاری یاترا تھی۔ 24 کو حزب مخالف کے کئی ممبران نے لوک سبھا سے



5 ستمبر دنیا کی تاریخ میں ایک ایسا تاریخ ساز دن ہے جب ملک بھر میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوا۔ یہ احتجاج حکومت کے ڈی فیمیشن بل کے خلاف تھا جسے بعد میں حکومت نے 22 ستمبر کو واپس لے لیا۔

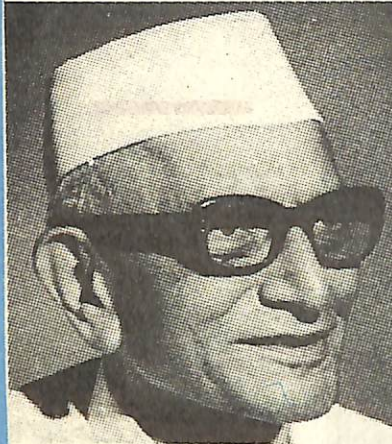
11 اکتوبر کو جنتا دل ایک نیا حزب مخالف بن کر اُبھرا وی۔پی۔ سنگھ کو اس پارٹی نے اپنا صدر تسلیم کر لیا 15 دسمبر کو راجیو گاندھی چین کے سرکاری دورے پر روانہ ہوئے کسی بھارتی وزیراعظم کا یہ سفر 34 برس بعد عمل میں آئی۔

1989 کو جب پہلے دن سورج کی کرنیں نمودار ہوئیں تو ہندوستان اور پاکستان نے حکومتی سطح پر تین معاہدوں پر دستخط کیے اسی سال پاکستان کے

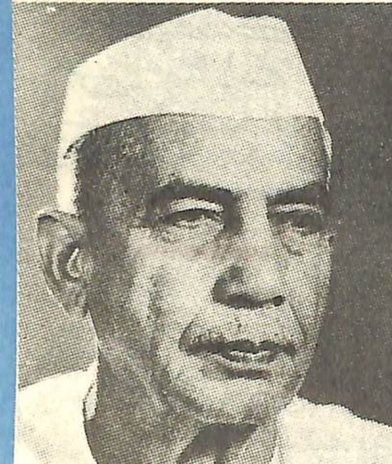
بوفورس کے معاملے میں احتجاجاً استعفے دیدیے۔ 30 اگست کو اپوزیشن پارٹیوں نے ایک دن کے لیے "بھارت بند" کی تحریک چلائی۔ 27 ستمبر کو ہری کوٹہ سے "پرتھوی مزائل" نے فضا میں کامیاب پرواز کی۔ اکتوبر 1989 کو کیرالا ہائی کورٹ جج بی بی فاطمہ کو سپریم کورٹ کی پہلی خاتون جج مقرر کیا گیا۔ 12 اکتوبر کو کرناٹک اور پنجاب میں صدر راج کی توسیع کی گئی 27 کو صدر جمہوریہ نے آٹھویں لوک سبھا توڑ دی۔ بعد انتخابات کانگریس آئی سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے لوک سبھا میں داخل ہوئی۔ اس نے 193 سیٹیں حاصل کیں جبکہ جنتا دل کو 141، بی جے پی کو 88 اور سی پی ایم کو 32 نشستیں ملیں کرناٹک میں کانگریس آئی نے حکومت قائم کی۔ قومی



لال بہادر شاستری



مرارجی ڈیسائی

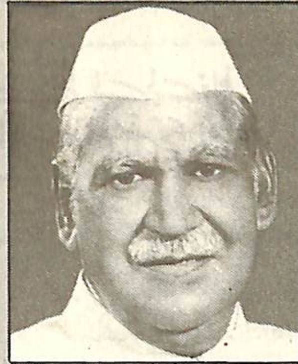


چودھری چرن سنگھ

مورچہ نے دیگر سیاسی پارٹیوں کی مدد سے مرکزی حکومت قائم اور وی پی سنگھ بھارت کے ساتویں وزیر اعظم چن لئے گئے۔ انھوں نے بلا حفاظتی انتظامات امرتسر جاکر عوام سے رابطہ قائم کیا۔ مفتی محمد سعید وزیر داخلہ کی بیٹی ڈاکٹر روبیہ سعید کو کشمیری دہشت گردوں نے اغوا کر لیا۔ بعد میں 5 دہشت گردوں کی رہائی کے بدلے اسے رہا کر دیا۔ کشمیر دہشت پسندوں کا مرکز و محور بن گیا۔ آئے دن قتل و غارت گری اور اغوا کے واقعات رونما ہونے شروع ہو گئے۔ 26 کو کے شنکر پلائی مشہور و معروف کارٹونسٹ نئی دہلی میں فوت ہوئے۔ ہندوستان نے بوفورس کمپنی سے تجارتی مقاطعے کا اس وقت تک اعلان کیا جب تک وہ کمیشن کھانے والوں کی نشاندہی نہ کرے۔ لیکن بوفورس نے اس مقاطعہ کا تا حال کوئی نوٹس نہیں لیا۔

1990 میں دستور ہند میں تیرہ ترمیمیں کی گئیں۔ تا حال ان کی تعداد 76 سے زیادہ ہو چکی ہے۔ خلیجی جنگ کی وجہ سے اسی سال کے آخر تک افراطِ زر میں دھماکہ خیز اضافہ ہوا مگر حکومت نے دلاسہ دیا کہ 1991 کے ماہ مارچ تک افراطِ زر کا تناسب 7.5 فیصد سے زیادہ نہیں بڑھ سکے گا۔

1990-1991 میں پہلا منفی عنصر بجٹ میں تیرہ سو کروڑ روپیہ کا خسارہ تھا جسے کم کر کے سات ہزار دو سو کروڑ روپیہ تک پہنچا دیا گیا۔ خلیجی جنگ کے اثرات نے ہندوستانی اقتصادی صورت حال کو بری طرح متاثر کیا۔ لاکھوں افراد اپنے وطن ہندوستان لوٹ کر



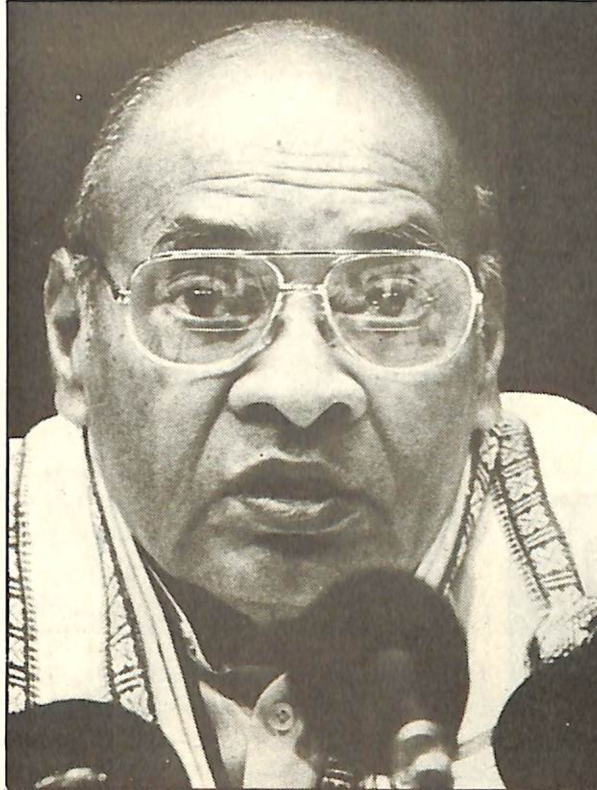
بے روزگاری کی شرح میں اضافے کا باعث بنے۔ آٹھویں منصوبے کے تحت حکومت ہند نے 18 ستمبر 1990 کو چھ لاکھ دس ہزار کروڑ روپیہ مختص کیا۔ جبکہ پہلے اقتصادی 1901-1907 پنج سالہ منصوبے کی رقم دو ہزار تین سو اٹھہتر کروڑ تھی۔

ہندوستان کا اسٹاک مارکیٹ دنیا بھر میں 23 ویں حیثیت کا حامل ہے اور کھاتے داروں کی تعداد تخمیناً چار کروڑ سے زیادہ ہے۔ 92-1991 کے دوران شیئر ہولڈرز (حصہ داروں) نے ہندوستان کی اقتصادی ساکھ کو ایک بڑے گھپلے کے دوران شدید صدمہ پہنچایا۔ کئی حصہ دار گرفتار ہوئے اور ایک وزیر کو بہر طور مستعفی ہونا پڑا۔

1990 میں منڈل کمیشن کی رپورٹ نے اور مسجد، مندر مسئلہ نے بھی ہنگامہ برپا کر دیا۔ تباہی، بربادی نے وہ رُخ اختیار کیا کہ وی پی سنگھ سرکار کو استعفیٰ دینے کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہیں رہا۔

1991 میں ماہ مئی کے دوران پارلیمانی انتخابات ہوئے لیکن الیکشن کی پہلی شام کو سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی

11 اکتوبر کو جنتا دل ایک نیا حزب مخالف بن کر ابھرا۔ وی۔ پی۔ سنگھ کو اس پارٹی نے اپنا صدر تسلیم کر لیا۔ 15 دسمبر کو راجیو گاندھی چلنے کے سرکاری دورے پر روانہ ہوئے۔ کسی بھارتی وزیر اعظم کا یہ سفر 34 برس کے بعد عمل میں آیا۔



1991 میں ماہ مئی کے دوران پارلیمانی انتخابات ہوئے لیکن الیکشن کی پہلی شام کو سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کا بہیمانہ قتل وقوع پذیر ہوا۔ کانگریس کے برسر اقتدار آنے پر وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ پی وی نرسمہا راؤ نے سنبھالا۔

کا بہیمانہ قتل وقوع پذیر ہوا۔ کانگریس کے برسر اقتدار آنے پر وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ نرسمہا راؤ نے سنبھالا۔

1992 کی 13 جولائی کو ملک میں صدارتی الیکشن ہوا جس میں نائب صدر ڈاکٹر شنکر دیال نے کامیابی و کامرانی حاصل کی۔ 20 جولائی 1992 کو صدر وینکٹ رمن نے صدارت کا عہدہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے حوالے کر دیا۔



اہم خبریں

یکم جولائی ـــــ وزیر اعظم نرسمہاراؤ نے سری فورٹ آڈیٹوریم میں پہلی بار بر ہجوم پریس کانفرنس کو خطاب کیا۔

2 جولائی ـــــ کل ہند موٹر ٹرانسپورٹ کانگریس کی جانب سے ٹول ٹیکس اور چنگی کے خاتمے کے لئے بے مدت ہڑتال ہوئی۔ تقریباً پندرہ لاکھ ٹرک سڑکوں پر سے غائب رہے۔

3 جولائی ـــــ وزیر اعظم نے اپنی وزارت میں چھ اور وزراء کو شامل کر کے کابینہ میں توسیع کی۔

4 جولائی ـــــ حکومت نے ٹرکوں سے متعلق ہڑتال کا جائزہ لینے کے بعد دہلی میں چنگی ختم کرنے کا اعلان کیا۔

5 جولائی ـــــ گجرات میں 'رتھ یاترا' پر مبینہ حملے کے خلاف احتجاج میں تمام دکانیں اور کاروباری ادارے بند رہے۔

6 جولائی ـــــ پناما کی ایک فرم کا جنیوا بینک اکاؤنٹ منجمد کرنے کے لئے سی۔ بی۔ آئی نے سوئز حکومت سے درخواست کی کیونکہ بوفورس سودے میں اس فرم "کولابار انویسٹ مینٹ" پر 21 کروڑ روپے رشوت لینے کا شبہ کیا جارہا ہے۔

7 جولائی ـــــ لمبے عرصے سے چلنے والے تناؤ اور کھنچاؤ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بغیر کسی گڑبڑ اور باہری مداخلت کے تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں طلباء اور طالبات نے سالانہ امتحان میں شرکت کی۔

8 جولائی ـــــ چھ روز سے ٹرک آپریٹروں کی ہڑتال ختم ہوئی۔

9 جولائی ـــــ حکومت نے بمبئی میں ایک نیا اسٹاک ایکسچینج قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو آدرش اسٹاک ایکسچینج کی شکل میں کام کرے گا۔

10 جولائی ـــــ اجودھیا میں مندر کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا اس مسئلہ کو لے کر لوک سبھا میں زبردست ہنگامہ ہوا۔

11 جولائی ـــــ شمال مغربی دہلی ضلع کے سمے پور بادلی علاقے میں فرقہ وارانہ تشدد بھڑکنے کے نتیجے میں 13 افراد زخمی ہوئے۔ فساد پھیلانے کا الزام بی جے پی ورکرز پر ہے۔

12 جولائی ـــــ لاپتہ روسی سفارت کار تین دن بعد دہلی واپس ہوئے۔ تلاش کئے جانے پر وہ کُلّو میں ملے۔

13 جولائی ـــــ نویں صدر جمہوریہ کے لئے ووٹ ڈالے گئے۔ مسٹر سوئیل اور مسٹر شرما میں عہدہ صدارت کے الیکشن میں سخت مقابلہ ہوا۔

14 جولائی ـــــ الٰہ آباد ہائی کورٹ نے متنازعہ (بابری مسجد و رام جنم بھومی) زمین تعمیراتی کام روکا۔

17 جولائی ـــــ شنکر دیال شرما نے بی جے پی و قومی مورچہ کے اُمیدوار سوئیل کو 3 لاکھ ووٹوں سے شکست دے کر ملک کے نویں صدر منتخب ہوئے۔

18 جولائی ـــــ شہرۂ آفاق شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی طویل علالت کے بعد 83 برس کی عمر میں فوت ہو گئے۔

20 جولائی ـــــ کشمیر میں دہشت گردوں سمیت 23 افراد ہلاک ہوئے۔ جن میں جموں و کشمیر مسلح پولیس کے ڈی۔ ایس۔ پی سیتل سنگھ بھی شامل تھے۔

21 جولائی ـــــ کیرالا میں فرقہ وارانہ تشدد سے تین افراد ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے۔ تقریباً 150 دکانیں جلائی گئیں۔

24 جولائی ـــــ وزیر اعظم نرسمہاراؤ نے ہندو پریشد اور سادھوؤں سے اجودھیا کے متنازعہ پلاٹ پر تعمیراتی کام کو روک دینے کے سلسلے میں بات چیت کی۔

26 جولائی ـــــ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ملک کے نویں صدر جمہوریہ کے عہدہ کا حلف اُٹھایا۔

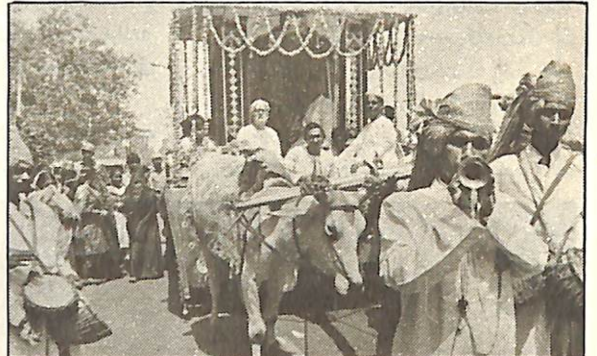
28 جولائی ـــــ مشہور و معروف فلم اسٹار امجد خان کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 49 برس کے تھے۔



نرسمہاراؤ



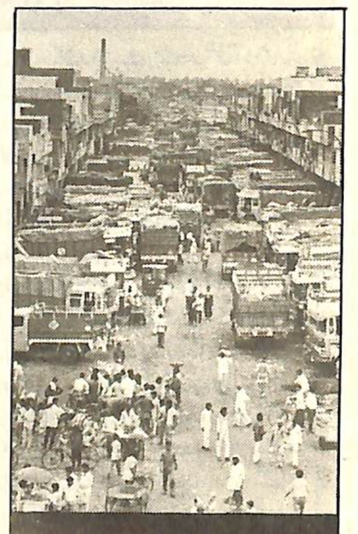
ڈاکٹر شنکر دیال شرما



رتھ یاترا کا ایک منظر



کنور مہندر سنگھ بیدی سحر



ٹرک ہڑتال کا ایک منظر



امجد خان

طنزیہ

آزادی ہی آزادی

وبھانشو دویالی

> ہمارے آزاد ملک نے جتنی آزادیاں حاصل کی ہیں اتنی آزادیاں پوری دُنیا مِل کر بھی حاصل نہیں کر سکتی۔ ہر انسان کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ آزادی کے تئیں عقیدت ظاہر کرے۔

ہمارے وطن عزیز کو آزاد ہوئے پینتالیس سال ہو گئے ہیں اوران برسوں میں ہم چاہے کچھ بھی نہ ہوئے ہوں لیکن آزاد خوب ہو گئے ہیں کوئی بھی ایسا میدان نہیں ہے جس میں ہم آزاد نہ ہوئے ہوں۔ دوسرے ملک جب آزاد ہوتے ہیں تو اُنھیں سیاسی، آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن ہم آزاد ہوئے تو ہم نے زندگی کا ہر گوشہ آزاد کر لیا۔ ہم معاشی میدان میں آزاد، سماجی میدان میں آزاد ہیں۔ ثقافتی اور مذہبی میدان میں آزاد ہیں، ادبی لحاظ سے آزاد ہیں یہاں تک کہ سنیما اور ویڈیو کے میدان میں بھی ہمیں آزادی مل چکی ہے رہا سوال صحافت کا تو ہماری صحافت بھی بالکل آزاد ہے۔

سیاست میں ہم جتنے آزاد ہیں اُتنا آزاد دنیا کا کوئی بھی دوسرا ملک نہیں ہے۔ اولمپک میں بھی آزاد ہونے کا مقابلہ ہوتا تو ہم ایک نہیں کئی کئی طلائی تمغے مار لاتے۔ سیاست میں ہم غیر ملکی غلامی سے ہی آزاد نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہر پالیسی سے بھی آزاد ہو گئے ہیں۔ ایسا کوئی اصول اور قاعدہ نہیں جس سے ہم آزاد نہ ہوں۔ ایسا کوئی آدرش نہیں ہے جو ہمیں غلام بنائے رکھ سکا ہو، ہم صرف اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ہمارے بڑے سے بڑے لیڈر کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ جہاں ہے وہیں رہے گا، جس پارٹی کا نمک کھایا ہے اُسی کا ساتھ نبھائے گا یا اب تک جس کی مخالفت کرتا رہا ہے اس کی مخالفت کرتا رہے گا۔ بڑے سے بڑا جیوتشی بھی یہ نہیں بتلا سکتا کہ ہمارا لیڈر کب قلابازی کھائے گا۔ کب خیمہ بدل لے گا اور کب خیال ممکن ہے وہ آج جس کو گالی دے رہا ہے کل اُسے گلے لگائے اور آج جس کے گلے لگ رہا ہے کل اس کا گلا کاٹنے لگے۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری سیاست اور سیاستدانوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ آزاد ملک میں جتنی آزاد ہماری سیاست ہوئی اتنا آزاد کوئی دوسرا میدان نہیں ہوا ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما جو بھی غیر ذمہ دارانہ کام کرتے ہیں۔ جو بھی دنگے فساد کراتے ہیں۔ جو بھی گالی گلوچ، مار پیٹ ہائے توبہ کراتے ہیں اُس میں نہ اُنھیں کوئی خوف ہوتا ہے نہ کوئی خطرہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اُسے کرنے کی اُنھیں پوری آزادی ہے، کس کی مجال ہے جو اُن کی آزادی میں خلل ڈالے۔ ہمارے سیاسی رہنما آزادی سے کام کرنے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ ملک کی آزادی بھلے ہی خطرہ میں پڑ جائے لیکن وہ اپنی آزادی کو معرض خطر میں نہیں آنے دیتے۔ جس ملک کے لیڈران اتنے آزاد ہیں کہ اُنھیں آزادی کے علاوہ کچھ اور نہیں دکھائی دیتا تو مان لینا چاہیے کہ ملک سچ مچ آزاد ہے۔

ہماری سیاست ہی آزاد نہیں ہے بلکہ ہمارے ملک کا سرمایہ بھی آزاد ہے اور سرمایہ دار بھی۔ پیسے اور سرمائے کے معاملہ میں جو آزادی چور کو حاصل ہے وہی جیب کترے اور اسمگلر کو بھی ملی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کا سرمایہ آزادی سے اِدھر سے اُدھر گھومتا ہے اُسے پرہیز ہے تو صرف غریبوں سے، غریب مزدوروں اور کسانوں سے اُن کے پاس ایسا ہے ہی کیا جو اُن کے پاس جائے ورنہ یہ مُچھے لیڈروں سے لے کر سڑک چھاپ غنڈوں تک کی گود میں بیٹھنے سے قطعی نہیں جھجکتا جو جتنا بڑا اسمگلر، جتنا بڑا ٹھگ ہے وہ اتنا ہی پیسے والا ہے۔ ہمارے وطن عزیز میں چور چوری کرنے کے لئے، ڈاکو ڈکیتی ڈالنے کے لئے اور اسمگلر، اسمگلنگ کرنے کے لئے آزاد ہے۔ تاجر کالا دھندہ کرنے کے لئے آزاد ہے تو افسر رشوت ہضم کرنے کے لئے آپ چاہے دوا میں زہر ملائیں یا کھانے کی اشیاء میں لید، اس آزاد ملک میں آپ کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ بس سرمائے کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آزادی سے گھومنے پھرنے دیجئے آپ کی آزادی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

آزاد ملک میں آزادی کی اس سے بڑی مثال کیا ہو گی کہ جو چاہے جسے گولی سے اُڑا دے یا بم سے مگر کوئی اس کا بال بانکا نہیں کر سکتا۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی بھی آزاد ہے اور دہشت گرد بھی، چاہے جسے گھر سے اُٹھا لے جائیں اور چاہے جب اُٹھا لے جائیں کسی کی مجال ہے کہ اُنھیں کوئی روک سکے۔ اب یہ ان کی آزادی ہے کہ جسے اُٹھا کر لائے ہیں اُس کے بدلے میں پھروتی مانگیں یا پھر اُس کی گردن اُڑا دیں یا اُس کے سینے میں اے کے 47 کی گولیاں اُتار دیں۔ دہشت گرد آزادی کے ساتھ کہیں دس کو مارتے ہیں کہیں بیس کو اور کہیں تیس کو۔ دوسری جانب ہماری پولیس بھی پوری آزادی کے ساتھ آنکھیں بند کئے سوتی رہتی ہے اور جب جاگتی ہے تو وہ بھی پوری آزادی سے اور اپنی بندوقوں سے کبھی کبھی دو چار کو مار گراتی ہے۔ ہماری پولیس آزادی کی جتنی قدر کرتی ہے دنیا میں کسی بھی دوسرے ملک کی پولیس نہیں کرتی کیونکہ وہ آزادی کی قدر کرتی ہے اسی لئے اسمگلروں کو آزادی سے اسمگلنگ، چوروں کو آزادی سے چوری اور قاتلوں کو آزادی سے قتل کرنے دیتی ہے۔

جس طرح ہماری جمہوریت کے تین ستون یعنی قانون سازیہ، عدلیہ اور عاملہ (ایگزیکیٹیو) آزاد ہیں اُسی طرح ہماری جمہوریت کا چوتھا ستون یعنی صحافت بھی آزاد ہے۔ جتنی آزادی سے ہمارا پریس ڈاکوؤں کی مدح سرائی کر سکتا ہے اُتنی ہی آزادی سے وہ پارٹی اور نظریات بدلنے والے کسی لیڈر کی ثنا خوانی بھی کر سکتا ہے۔ ہمارا پریس جمہوریت کی آزادی کو اہم سمجھتا ہے۔ اسی لئے وہ جمہوریت کو آزادی کے ساتھ اپنی جیب میں رکھتے رہتا ہے۔ پریس جتنی آزادی سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا سکتا ہے۔ اُسے دیکھ کر ہمیں اپنے پریس پر فخر ہوتا ہے۔ جو پریس کا آزادی سے گلا گھونٹ سکتا ہے پریس اُس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور جو پریس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے پریس اُن کی گردن پر گھٹنے ٹیکے رہتا ہے اور یہ سارا کام پوری آزادی کے ساتھ ہوتا ہے۔

ہمارے آزاد ملک نے جتنی آزادیاں حاصل کی ہیں اُتنی آزادیاں پوری دنیا مل کر بھی حاصل نہیں کر سکتی۔ چونکہ اگست کا مہینہ آزادی کے رنگ میں ڈوبا رہتا ہے اور آزادی کے یوم پیدائش پر ہر انسان کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ آزادی کے تئیں عقیدت ظاہر کرے، لہٰذا آج ہمیں عقیدت و احترام کے ساتھ یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم اسی طرح آزاد رہیں گے اور اسی طرح اپنی آزادیوں سے ملک کی آزادی کا گلا دباتے رہیں گے۔



قتیل شفائی

Qateel Shifai

QATEEL SHIFAI STREET
GHALIB COLONY SAMANABAD
LAHORE-25, PAKISTAN
PHONE : 412888

لکھنؤ

— پہلے سفر کے تاثرات —

ہر گلی اچھی لگی، ہر بام و در اچھا لگا
لکھنؤ! مجھ کو یہ پہلا ہی سفر اچھا لگا

خوبصورت ہر نئی تعمیر تھی، لیکن مجھے
ایک پرانا سا محلہ خاص کر اچھا لگا

چلمنیں اٹھتی نظر آئیں تصور میں مجھے
گھومنا مجھ کو مرا یوں دربدر اچھا لگا

جس کے نادیدہ حسینوں کے بہت چرچے سنے
خواب بن کر بھی وہ خوابوں کا نگر اچھا لگا

کچھ نئے پیڑوں کی رنگ آرائیوں کے درمیاں
سر جھکائے مجھ کو اک بوڑھا شجر اچھا لگا

جس نے ہندی میں سنایا میرا اردو خط اسے
ایک دیوی سا مرا وہ نامہ بر اچھا لگا

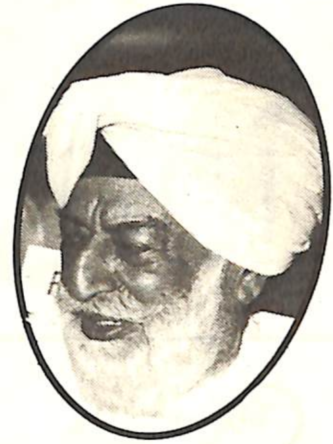
مجمع اہلِ سخن میں جب ہوا میں سربلند
اپنے کاندھوں پر مجھے تب اپنا سر اچھا لگا

جس نے کیں بار دگر آنے کی سو فرمائشیں
کیا کہوں وہ شخص مجھ کو کس قدر اچھا لگا

ایک بار اچھا لگا جو آدمی مجھ کو قتیل
سچ اگر پوچھو تو پھر وہ عمر بھر اچھا لگا

قتیل شفائی

غزل بہ خطِ شاعر



کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

محبت اور انسانیت کا ترجمان

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

اشتیاق عابدی

جنرل سکریٹری، اردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دہلی۔

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام نامی ان لوگوں کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں جو برِصغیر کی گزشتہ پچاس برس کی ادبی، ثقافتی اور سماجی زندگی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتے ہیں۔ بیدی صاحب ایک ہمہ صفت موصوف شخصیت تھے اور ان کی سبھی صفات کا اعتراف و احترام ہر جگہ اور ہر دور میں کیا گیا۔

کنور صاحب نے 9 مارچ 1909 کو ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو دنیوی طور پر بھی اور دینی لحاظ سے بھی اعتبار و امتیاز کا حامل تھا۔ ان کے دادا سر بابا کھیم سنگھ بیدی اپنے زمانے کی بہت اہم شخصیت تھے۔ متحدہ پنجاب کے سکھ، ہندو، مسلمان سب ان کے ارادتمند اور حلقہ بگوش تھے اور سرکارِ انگریزی بھی انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتی تھی۔ کنور صاحب کے والدِ محترم بابا ہردت سنگھ بیدی ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور ریاست و وجاہت انھیں ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے سو برس سے زیادہ عمر پائی اور 15 اکتوبر 1985 کو ان کا چنڈی گڑھ میں انتقال ہوا۔

کنور صاحب کا خاندانی امتیاز اس سے ظاہر ہے کہ وہ سکھ مت کے بانی بابا گورو نانک دیو کی اولاد میں تھے اور ان کا سلسلۂ نسب سولہ واسطوں سے گورو نانک سے جا ملتا ہے۔ گویا کنور صاحب ان کی سترہویں پشت میں تھے۔

کنور صاحب کی تعلیم منٹگمری (موجودہ نام ساہیوال) اور لاہور میں ہوئی۔ 1925 میں انھوں نے چیفس کالج لاہور سے سینیر کیمبرج کا ڈپلوما حاصل کیا۔ اس کالج میں صرف انگریز حکام یا بڑے بڑے ہندوستانی رؤسا کے بچے ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ 1929 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انھوں نے بی۔ اے کی سند لی۔ ان کے مضمون تاریخ اور فارسی تھے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی کی شادی بھی ایک بڑے گھرانے میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ شریمتی سوہندر کور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مشہور جرنیل ہری سنگھ نلوہ کی اولاد میں ہیں۔ ان کے والد سردار بہادر بلونت سنگھ اس زمانے میں (جنوری 1933) موگا، ضلع فیروزپور کے ایس۔ ڈی۔ ایم تھے اور سماج میں بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے۔

کنور صاحب ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ تھے اور انھیں ملازمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن ان کے والدِ محترم چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوں چنانچہ انھوں نے اس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں سے کہہ کر کنور مہندر سنگھ بیدی کو لائل پور (موجودہ نام فیصل آباد) کا E.A.C (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) مقرر کرا دیا۔

کنور صاحب کا سرکاری ملازمت کا دور 1934 میں شروع ہو کر 1967 میں وظیفۂ حسنِ خدمت پر ان کی سبک دوشی پر اختتام پذیر ہوا۔ وہ تقریباً 34 برس سرکاری ملازم رہے۔ 13 سال آزادی سے قبل اور 21 سال آزادیٔ وطن کے بعد۔ گویا دو ایسے زمانے ان کے دورانِ ملازمت میں آئے جن کے تقاضے باہم متضاد و متصادم رہے ہوں گے۔ ان کی معاملہ فہمی، فرض شناسی اور انتظامی سوجھ بوجھ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں ہی ادوار میں مرجعِ خلائق رہے اور عوام و خواص دونوں حلقوں میں نیک نامی حاصل کی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کنور مہندر سنگھ بیدی خاندانی رئیس تھے۔ ملازمت ان کے لیے حصولِ معاش کا ذریعہ کبھی نہیں رہی 1947 تک تو ان کا یہ معمول رہا کہ وہ اپنی تنخواہ کبھی گھر لے کر نہیں گئے۔ تنخواہ کا کچھ حصہ ان لوگوں کی مدارات پر خرچ ہو جاتا جو دفتری اوقات میں اپنے کام لے کر ان سے ملنے آتے اور باقی رقم نچلے درجے کے ضرورتمند ماتحتوں میں تقسیم ہو جاتی۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری "یادوں کا جشن" میں اپنے پہلے تقرر کا ذکر کرتے ہوئے، انھوں نے لکھا ہے:

"جب میں اپنی پہلی تقرری پر حاضر ہونے کے لیے لائل پور جانے لگا تو علاقے کے ہزاروں لوگ مجھے دعائیں دے کر رخصت کرنے آئے۔ اچھا خاصا میلہ لگ گیا۔ دو تین دن تک جشن ہوتے رہے۔ میرے آرام کے لیے گائے، بھینس، گھوڑی، کار، ملازم ــــ سب کا بڑی احتیاط سے اہتمام کیا گیا۔"

کنور صاحب نے اپنی مدتِ ملازمت میں متعدد ذمہ دارانہ عہدوں پر کام کیا اور اپنی ذمہ داریوں سے انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے لیکن ان کی کارکردگی کی سب سے بڑی آزمائش اس وقت ہوئی جب 1947 کے آشوب میں انھیں دارالحکومت دہلی کا سٹی مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ اس وقت یہاں کشت و خون کا بازار گرم تھا اور باہمی رواداریوں کی دیرینہ روایت شکست انجام ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کنور صاحب نے عہدہ سنبھالتے ہی وزیرِ داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کے سامنے بحالیٔ امن کے لیے کچھ تجاویز پیش کیں جنھیں فوری منظوری حاصل ہو گئی۔ ان تجاویز میں ایک تجویز جسے ماننے میں سردار پٹیل کو قدرے تامل ہوا، یہ بھی تھی کہ شہر میں ثقافتی سرگرمیاں شروع کی جائیں۔ مثلاً مشاعرے، قوالیاں اور دوسرے تفریحی اجتماعات کا اہتمام کیا جاتے۔ کنور صاحب کا خیال تھا کہ ان اجتماعات میں شرکت سے لوگوں کا دھیان تخریبی کارروائیوں کی طرف سے ہٹے گا اور غم و غصے کی جگہ محبت اور یگانگت کے جذبات دلوں میں پیدا ہوں گے۔ چنانچہ کنور صاحب نے نہ صرف اپنی کوٹھی پر بلکہ عدالت کے احاطے میں بھی مختلف تفریحی مشاغل کا آغاز کر دیا جن میں مرغوں اور تیتروں کی پالیاں اور مینڈھوں کی لڑائی بھی شامل تھی۔ شرکا کو سرکاری گاڑیاں شہر سے لے کر آتیں اور پھر چھوڑنے جاتیں۔ اپنی اس حکمتِ عملی کے بارے میں کنور صاحب "یادوں کا جشن" میں لکھتے ہیں:

"مقصد دراصل یہ تھا کہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی مذاہب کے لوگ ایک جگہ پھر سے اکٹھے ہوں اور تفریح میں شریک ہوں تاکہ فرقہ وارانہ فسادات نے جو گہرے گھاؤ لگائے تھے، وہ مندمل ہوں۔"

اس پُرآشوب دور میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے دہلی میں امن و امان بحال کرنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خیر سگالی کی فضا قائم کرنے کے لیے جس خلوص، لگن، سوجھ بوجھ اور جاں فشانی سے کام کیا، اس کی اہمیت کا کچھ اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ان تین خطوط سے بھی ہو سکتا ہے جو حال ہی میں نیشنل آرکائیوز کی طرف سے شائع

کردہ ان کے سرکاری خطوط کے ایک مجموعے میں شامل ہیں۔ یہ تینوں خطوط اس وقت کے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بھیم سین سچر کے نام ہیں۔ بیدی صاحب پنجاب کی صوبائی سول سروس سے وابستہ تھے اور دہلی انھیں بطورِ خاص بلایا گیا تھا۔ ان خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ سچر صاحب بیدی صاحب کو واپس پنجاب بلانا چاہتے تھے لیکن مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ انھیں دہلی میں رہنے دیا جائے۔ بیدی صاحب کو سردار پٹیل کے ایما پر دہلی طلب کیا جانا اور پھر مولانا آزاد کا اس پر اصرار کہ انھیں سرِ دست دوبارہ پنجاب نہ بھیجا جائے؛ کیا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ ان کی دانش مندی، فرض شناسی اور انصاف پسندی پر ان دو بزرگ ذمہ دار ہستیوں کو کس قدر بھروسا تھا۔

دراصل کنور مہندر سنگھ بیدی جن اخلاقی اصولوں کے پابند اور جس تہذیبی روایت کے حامل تھے، ان میں مذہبی بنیادوں پر انسان اور انسان کے درمیان تفریق کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بابا گورو نانک نے اپنی تعلیمات میں جس انسان دوستی پر زور دیا ہے، وہ بیدی صاحب کے خمیر میں رچی بسی تھی۔ سونے پر سہاگہ بنی اردو شعر و ادب سے ان کی گہری وابستگی جس نے ان کی کشادہ دلی اور وسیع المشربی پر اور جِلا کر دی۔

مشاعروں کی افادیت یا عدم افادیت اکثر موضوعِ بحث بنی ہے لیکن تقسیم وطن کے بعد پیدا شدہ کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر اردو کے خلاف جو تعصبات پیدا ہو گئے تھے انھیں دور کرنے میں شاعروں نے بہت اہم رول ادا کیا اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر گزشتہ چالیس پینتالیس سال سے مشاعروں کی روح رواں تھے۔ ملک کے طول و عرض میں ہونے والے اکثر مشاعروں کے انعقاد میں کنور صاحب کا ایما شامل ہوتا۔ وہ ان مشاعروں میں شرکت کے لیے معاوضہ تو کجا اکثر آمد و رفت کے مصارف بھی نہ لیتے اور جن شعرا سے خود شرکت کے لیے کہتے انھیں بھی کم سے کم معاوضہ قبول کر لینے پر آمادہ کر لیتے۔ مشاعروں کی نظامت بالعموم انھی کے ہاتھ میں رہتی اور جب وہ شاعروں کو کلام پڑھنے کی دعوت دیتے ہوئے ان کا تعارف کراتے تو کچھ ایسے جملے بھی ضرور کہتے جو اُردو کی شعری، ادبی اور تہذیبی روایات پر روشنی ڈالتے۔ اس طرح انھوں نے مشاعروں کو اردو زبان اور اس تہذیب کے فروغ کا بھی ایک وسیلہ بنانے کی کوشش کی جس کی ترجمانی یہ زبان کرتی ہے۔ یہ قابلِ تعریف فریضہ انھوں نے اس وقت انجام دیا جب یہ زبان اور اس کی تہذیب دونوں ہی ناپسندیدہ قرار دی جا رہی تھیں۔ یہ اُردو والوں پر ان کا ایسا احسان ہے، جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صحیح معنوں میں اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کے ارد گرد ہمیشہ ایسے لوگوں کا مجمع رہا جو مختلف المزاج اور مختلف المذاق ہونے کے باوجود علوم و فنون کے دلدادہ اور اپنے اپنے شعبے میں امتیاز رکھنے والے تھے۔ شاعر، ادیب، گائیک، پہلوان، مکہ باز، پتنگ باز، شاطر (شطرنج کھیلنے والے) سبھی ان کے پاس آتے اور ان کی فیض رساں شخصیت سے فیض اٹھاتے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہاں کے بہت سے علمی ادبی اداروں اور ثقافتی انجمنوں سے ان کا گہرا تعلق رہا۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی اور نائب صدر، غالب اکیڈمی کی مجلسِ انتظامیہ کے رُکن اور ترقی اُردو بورڈ کے نائب صدر رہے۔ خود انھوں نے "پریم سبھا" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس کا مقصد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی اور محبت کا رشتہ قائم کرنا اور اسے فروغ دینا تھا۔

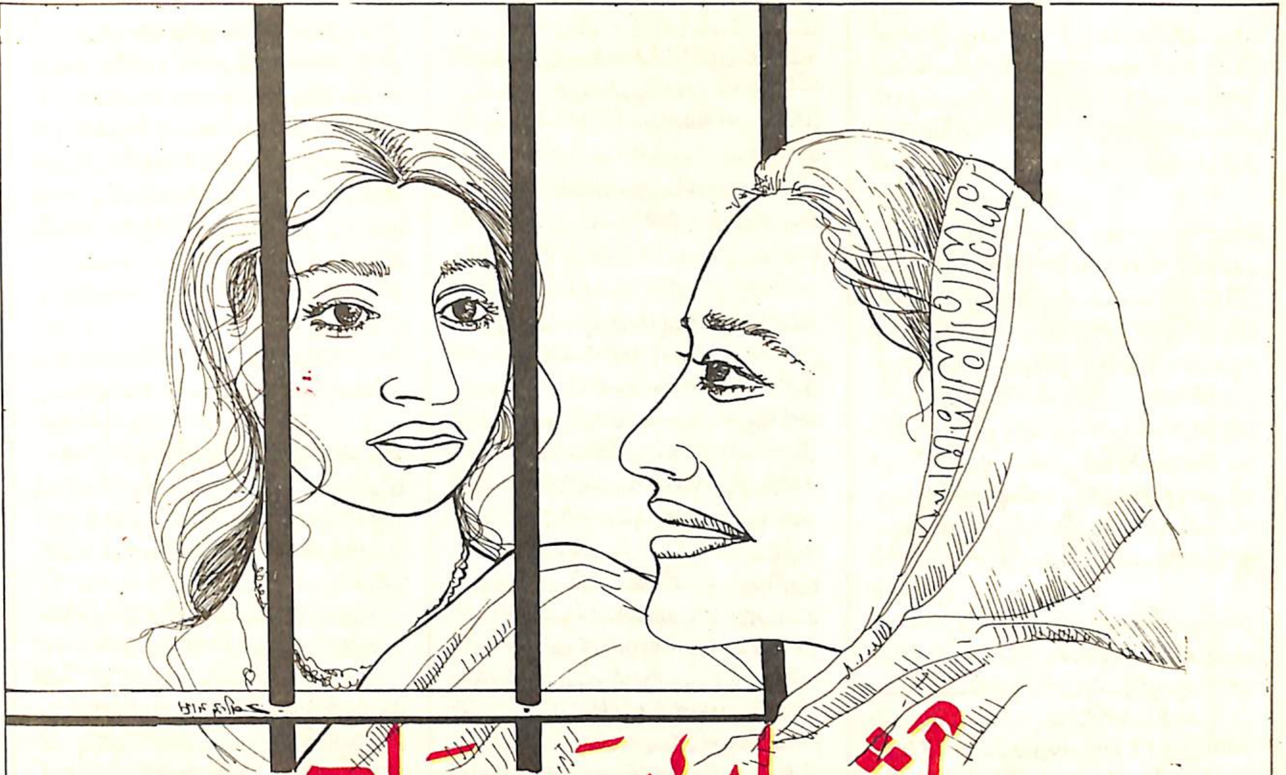
دہلی اردو اکادمی کے ساتھ بیدی صاحب کا تعلق اکادمی کے قیام کے ساتھ ہی قائم ہو گیا تھا۔ وہ اکادمی کی مختلف کمیٹیوں کے چیئرمین اور کچھ مدت تک اکادمی کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ اردو اکادمی کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جس میں بیدی صاحب کے مفید مشورے شامل نہ رہے ہوں۔

بیدی صاحب نے طبعی عمر پائی اور زندگی کی 83 بہاریں دیکھیں۔ اس عمر کو پہنچتے پہنچتے، لوگ قوتِ عمل کھو بیٹھتے ہیں اور گوشہ گیر ہو جاتے ہیں لیکن آنجہانی اپنی موت سے مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے تک ان سبھی مشاغل میں حصہ لیتے رہے جو انھیں عزیز تھے اور لوگوں سے اسی تپاک، گرم جوشی اور خوش مزاجی سے پیش آتے رہے جو ان کی فطرت کا حصہ تھی۔

"یادوں کا جشن" میں کنور صاحب نے لکھا ہے کہ ابھی نوجوانی کے دنوں میں ایک بار وہ بیمار ہوئے تو ڈاکٹروں نے یہ شک ظاہر کیا کہ انھیں کینسر ہو گیا ہے۔ اس وقت یہ شک بے بنیاد نکلا تھا لیکن اب بڑھاپے میں اسی موذی مرض نے ان کی جان لی اور 17 جولائی 1992 کی صبح کو وہ شخص ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گیا جسے ہم کبھی بھُلا نہ سکیں گے۔



کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور جناب اشتیاق عابدی



آشیاں برباد

منشی پریم چند

یہ عالمی ادب میں اُردو ہندی افسانوں کو بلندی سے ہمکنار کرنے والے منشی پریم چند کی تحریر کردہ کہانی ہے جسنے انگریزی اقتدار کو اس قدر بوکھلا دیا کہ بہت سے دوسرے مواد کی طرح اس کہانی کو بھی ضبط کر لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

مردلا مجسٹریٹ کے اجلاس سے زنانے جیل میں واپس آئی تو اس کا چہرہ شگفتہ تھا۔ بری ہو جانے کی گلابی امید اس کے رخساروں پر چمک رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سیاسی قیدیوں کے ایک گروہ نے گھیر لیا اور پوچھنے لگیں "کتنے دن کی ہوئی بہن؟"

مردلا نے فاتحانہ انداز میں کہا "میں نے تو صاف کہہ دیا، میں نے دھرنا نہیں دیا۔ یوں آپ زبردست ہیں جو فیصلہ چاہیں کریں۔ نہ میں نے کسی کو روکا، نہ پکڑا نہ دھکا دیا، نہ کسی سے کچھ آرزو منت ہی کی کوئی خریدار میرے سامنے آیا ہی نہیں ہاں میں دکان پر کھڑی ضرور تھی، وہاں کئی والنٹیر گرفتار کر لئے گئے تھے، خلقت جمع ہو گئی تھی، میں بھی کھڑی ہو گئی، بس تھانیدار نے آ کر مجھے گرفتار کر لیا۔"

چھما دیوی کچھ قانون جانتی تھی، بولی۔ "تم خاموش رہو گی تو مجسٹریٹ پولیس والوں کے بیان پر فیصلہ کرے گا۔ میں تو کئی ایسے مقدمے دیکھ چکی ہوں!"

مردلا نے فوراً تردید کی "میں مقدمہ کی کسی کارروائی میں شریک نہ ہونا چاہتی تھی لیکن جب میں نے ان لوگوں کو صریح جھوٹ بولتے دیکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے ان سے جرح کرنا شروع کی۔ میں نے بھی اتنے دنوں گھاس نہیں کھودی ہے۔ تھوڑا سا قانون جانتی ہوں۔ پولیس والوں نے سمجھا ہوگا کہ یہ کچھ بولے گی تو ہے نہیں۔ ہم جو بیان چاہیں گے، دے دیں گے۔ جب میں نے جرح کرنی شروع کی تو سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے۔ میں نے تینوں گواہوں کے بیانات کو فرضی ثابت کر دیا۔ اس وقت جانے کیونکر مجھے نکتے سوجھتے گئے۔ مجسٹریٹ نے تھانہ دار صاحب کو دو تین بار پھٹکار بھی بتائی۔ وہ میرے سوالوں کا اول جلول جواب دیتا تھا تو مجسٹریٹ بول اٹھتا تھا "وہ جو کچھ پوچھتی ہیں اس کا جواب دیجئے فضول کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔" تب حضرت کا چہرہ ذرا سا نکل آیا۔ میں نے سبھوں کو لاجواب کر دیا۔ ابھی مجسٹریٹ نے فیصلہ تو نہیں سنایا، لیکن مجھے یقین ہے بری ہو جاؤں گی۔ میں جیل سے نہیں ڈرتی، لیکن بے وقوف بھی بننا نہیں چاہتی۔ وہاں سکریٹری صاحب بھی تھے۔ اور بہت سی بہنیں بھی تھیں۔ سب یہی کہتے تھے کہ تم چھوٹ جاؤ گی۔"

عورتیں اُسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی چلی گئیں۔ ان میں کسی کی معیاد سال بھر کی تھی، کسی کی چھ مہینے کی کسی نے بھی عدالت کی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کے مشرب میں یہ کفر سے کم نہ تھا۔ مردلا پولیس سے جرح کر کے ان کی نظروں میں گر گئی تھی۔

دور جا کر ایک دیوی نے کہا "اسطرح تو ہم بھی چھوٹ جاتے۔ ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ سرکاری عدالتوں سے ہمیں انصاف کی کوئی امید ہی نہیں۔"

دوسری خاتون بولیں "یہ تو معافی مانگ لینے کے برابر ہے۔ گئی تو تھیں دھرنا دینے ہی، ورنہ دوکان پر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ والنٹیر گرفتار ہوئے تھے آپ کی بلا سے، آپ وہاں کیوں گئیں مگر اب کہتی ہیں۔ میں دھرنا دینے گئی ہی

نہیں تھی۔ یہ تو معافی مانگنا ہوا۔"

تیسری دیوی نے فرمایا۔"جیل میں رہنے کے لئے بڑا کلیجہ چاہئے۔ اس وقت تو واہ واہ کہلانے کے لئے آگئیں، اب رونے لگیں ایسی عورتوں کو قومی کام کے نزدیک ہی نہ آنا چاہئے۔ تحریک کو بدنام کرنے سے کیا فائدہ؟

صرف چھما دیوی اب تک مرڈلا کے پاس متفکر کھڑی تھی۔ اس نے ایک تقریر کرنے کے الزام میں سال بھر کی سزا پائی تھی۔ دوسرے ضلع سے تبدیل ہوکر ایک مہینہ ہوا یہاں آئی تھی۔ ابھی معیاد پوری ہونے میں آٹھ ماہ باقی تھے یہاں کے پندرہ قیدیوں میں سے کسی سے اُس کا دل نہ ملتا تھا۔ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے ان کا آپس میں جھگڑنا، آرائش اور شوق کی چیزوں کے لئے لیڈی وارڈنوں کی خوشامدیں کرنا، گھر والوں سے ملنے کے لئے اُن کا اضطراب، اسے پسند نہ تھا، وہی بدگوئیاں اور سرگوشیاں جیل کے اندر بھی تھیں وہ خودداری جو اس کے خیال میں ایک سیاسی قیدی میں ہونی چاہئے کسی میں بھی نہ تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت اپنے خانگی معاملات کی چرچا میں گزرتا تھا چھما ان سے احتراز کرتی تھی۔ اُس میں قوم کا فدائیانہ جوش تھا اور سچا درد۔ مگر دوسری دیویاں اسے مغرور سمجھتی تھیں اور احتراز کا جواب احتراز سے دیتی تھیں مردلا کو حراست میں آئے آٹھ دن ہوئے تھے، اتنے ہی دنوں میں چھما کو ان سے خاص اُنس ہوگیا تھا۔ مرڈلا میں تنگ دلی اور رقابت نہ تھی، نہ بدگوئی کی عادت، نہ آرائش کا خبط نہ بیہودہ مذاق، اس نے مہر پذیر دل پایا تھا۔ جوشِ خدمت سے پُر، ہمدردی سے لبریز چھما نے سوچا تھا، اس کے ساتھ چھ مہینے لطف سے گزر جائیں گے لیکن تقدیر یہاں بھی اسے پامال کرنے پر آمادہ تھی کل مرڈلا یہاں سے چلی جائے گی، پھر وہ اکیلی ہوجائے گی۔ یہاں ایسا کون ہے جس کے ساتھ وہ گھڑی بھر بیٹھ کر اپنے دل کی باتیں کہے گی۔ ملک اور قوم کی چرچا کریگی جس کی صحبت میں منافرت یا ناہمدردی کی بو نہ آئے۔

مرڈلا نے پوچھا۔"تمہیں تو ابھی آٹھ مہینے باقی ہیں بہن بڑی مشکل سے گزریں گے۔"

چھما نے حسرتناک لہجہ میں کہا۔"کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے بہن، مگر تمہاری یاد ہمیشہ ستایا کرے گی۔ اس ایک ہفتہ کے اندر تم نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کر دیا۔ جب سے تم آئی ہو مجھے یہ جیل خانہ جیل خانہ نہ لگتا تھا۔ کبھی کبھی ملتی رہنا۔"

مرڈلا نے دیکھا چھما کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ تشفی کے انداز میں بولی۔ "ضرور ملوں گی بہن۔ مجھے خود بغیر تم سے ملے چین نہ آئے گا۔ بھان کو بھی لاؤں گی، کہوں گی تیری ماسی آئی ہے، تجھے بلا رہی ہے۔ دوڑا ہوا آئے گا۔ اب تم سے آج کہتی ہوں بہن مجھے یہاں کسی کی یاد آتی تھی تو بھان کی۔ بچارا اماں اماں کہہ کر مجھے تلاش کرتا ہوگا اور روتا ہوگا۔ مجھے دیکھ کر روٹھ جائے گا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں، جاؤ میں تم سے نہیں لتا، تم میرے گھر سے نکل جاؤ، بڑا شیطان ہے بہن، چھن بھر بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ صبح اٹھتے ہی گاتا ہے۔"جھنڈا اونچا لہے امالا، چھولاج کا مندل دیل میں ہے" جب ایک جھنڈی کندھے پر رکھ کر کہتا ہے "تالی جھلاب پینا حلام ہے۔" تو دیکھتے ہی بنتا ہے۔ باپ کو نوکہتا ہے۔"تم گلام ہو۔" ایک انگریزی کمپنی میں نوکر ہیں۔ بار بار سوچتے ہیں استعفیٰ دے دوں، لیکن گزر بسر کی بھی تو کوئی صورت ہو۔ کیسے چھوڑیں وہ اب تک چھوڑ بیٹھے ہوتے بہن۔ تم سے سچ کہتی ہوں نوکری سے انھیں نفرت ہے لیکن میں ہی منع کرتی رہتی ہوں۔ بچارے کیسے دفتر جاتے ہوں گے، کیسے بھان کو سنبھالتے ہوں گے۔ ساس جی کے پاس تو رہتا ہی نہیں۔ وہ بچاری بوڑھی اس کے ساتھ کہاں کہاں دوڑیں چاہتی ہیں انکے پاس بیٹھا رہے۔ وہ پل بھر نچلا نہیں بیٹھتا اماں بہت بگڑیں گی، بس یہی ڈر لگ رہا ہے مجھے دیکھنے ایک دن بھی نہیں آئیں۔ کل بابو جی کہتے تھے"تم سے بہت ناراض ہیں۔ تین دن تو دانہ پانی چھوڑ دیا تھا۔ کہتی تھیں "اس چھوکری نے کُل کی مریاداڈبو دی، خاندان میں داغ لگا دیا، کلموہی، کلچھنی" نہ جانے کیا کیا بکتی رہتی ہیں، میں تو ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی بہن۔! پرانے زمانے کی ہیں، انھیں کوئی چاہے کہ ہم لوگوں میں آکر مل جائیں تو اس کی زیادتی ہوگی۔ چل کر منانا پڑے گا، بڑی منتوں سے مانیں گی۔ کل ہی کتھا ہوگی دیکھ لینا، براہمن کھائیں گے، جیل خانہ کا پرائشچت تو کرنا ہی پڑے گا۔ تم ہمارے گھر ایک دو دن رہ کر تب جانا بہن۔ میں تمہیں آکر لے جاؤنگی۔

چھما کو ان خوشیوں میں سے ایک بھی نصیب نہ تھی۔ وہ اکیلی بیوہ تھی۔ جلیانوالے باغ میں اس کا آشیانہ برباد ہوگیا تھا۔ شوہر مارا گیا، لڑکے مارے گئے اب کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی۔ اور ان دس برسوں سے اس کا حرماں نصیب دل قوم کی خدمت میں تشفی اور سکون تلاش کررہا تھا جن اسباب نے اس کے بسے ہوئے گھر کو ویران کر دیا۔ اس کے سہاگ کو لوٹا، اس کی گود سونی کردی، ان اسباب کو مٹانے میں مجنونانہ جوش کے ساتھ مصروف تھی۔ بڑی سے بڑی قربانیاں تو وہ پہلے ہی کرچکی تھی۔ اب اس کے پاس اپنے دل اور دماغ کے سوا قربان کرنے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔ اوروں کے لئے خدمت قوم تہذیب کا ایک تقاضا ہو یا، نمود کا ایک ذریعہ، اس کے لئے تو یہ ایک عبادت تھی۔ اور وہ اپنی ساری نسوانی عقیدت اور انہماک کے ساتھ اسے بجالاتی تھی۔ لیکن طائر کو آسمان پر پرواز کرنے کے بعد اپنے آشیانہ کی یاد تو آتی ہے چھما کا یہ آشیانہ کہاں تھا! یہی تو وہ موقعے تھے جب اس کا دل ہمدردی کے لئے بے قرار ہوجاتا تھا۔ یہاں درد شناس مرڈلا کو پاکر وہ اپنی قسمت کی تعریف کررہی تھی۔ مگر یہ صحبت بھی اتنی جلد برہم ہوگئی۔

چھما حسرتناک انداز سے بولی۔ یہاں سے جاکر بھول جاؤگی مردلا! تمہارے لئے یہ ریل گاڑی کی ملاقات ہے۔ اور میرے لئے تمہارے وعدے اس ملاقات کے وعدے ہیں۔ کبھی کہیں ملاقات ہوجائے گی تو یا تو پہچانوگی ہی نہیں۔ یا ذرا مسکرا کر نمستے کہتی ہوئی اپنی راہ چلی جاؤگی۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ اپنے رونے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ دوسرے کے لئے کوئی کیوں کر روئے۔ تمہارے لئے تو میں کچھ نہیں تھی۔ میرے لئے تم بہت کچھ تھیں۔ اپنے پیاروں میں بیٹھ کر کبھی کبھی مجھے ضرور یاد کرلیا کرنا۔ بھکاری کے لئے چٹکی بھر آٹا ہی بہت ہے۔

دوسرے دن مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا۔ مردلا رہا ہوگئی۔ شام کو وہ سب بہنوں کو گلے مل کر، رو کر، رلا کر رخصت ہوگئی۔ گویا میکے سے بدا ہوئی ہو۔

تین مہینے گزر گئے مگر مردلا ایک بار بھی نہ آئی۔ اور قیدیوں سے ملنے والے آتے رہتے تھے۔ بعضوں کے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں بھی آجاتی تھیں۔ لیکن چھما کو کون پوچھنے والا تھا۔ ہر مہینے کے آخری اتوار کو وہ صبح سے مردلا کا انتظار کرنے لگتی۔ جب ملاقات کا وقت گزر جاتا تو ذرا رو کر دل کو سمجھا لیتی۔ زمانہ کا یہی دستور ہے۔

ایک دن شام کو چھما سندھیا کرکے اٹھی تھی کہ دیکھا مردلا سامنے چلی آرہی ہے۔ نہ وہ چہرہ ہے نہ وہ رونق، دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور روتی ہوئی بولی یہ تیری کیا حالت ہے مردلا، صورت ہی بدل گئی، تم بیمار ہوگیا۔

مردلا کی آنکھوں سے آنسوں جاری تھے۔ بولی، بیمار تو نہیں ہوں بہن۔ مصیبت زدہ ہوں۔ تم مجھے بے وفا اور وعدہ فراموش سمجھتی ہوں گی ان ساری شکایتوں کی تلافی کرنے آئی ہوں، اور ساری فکروں سے آزاد ہوکر آئی ہوں۔

چھما کا دل کانپ اٹھا۔ سینہ کی گہرائیوں سے ایک لہر سے اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی بولی۔ خیریت تو ہے؟ اتنی جلد تم پھر یہاں کیوں آگئیں۔ ابھی تو تین مہینے بھی نہیں ہوئے۔

مردلا زرد تبسم کے ساتھ بولی۔ اب سب خیریت ہے بہن! ہمیشہ کے لئے خیریت ہوگئی۔ کوئی فکر نہیں رہی اب یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے تیار ہوں تمہاری محبت کی کشش اب معلوم ہوئی۔

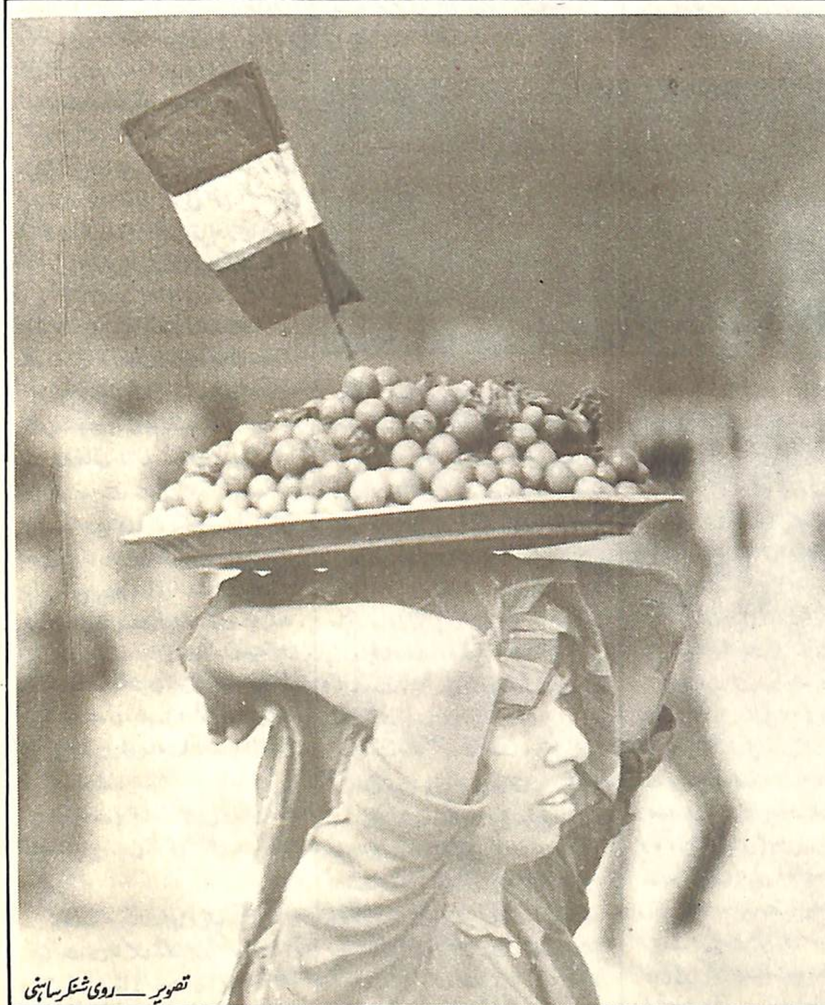
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ تمہیں باہر کی خبریں کیا ملی ہوں گی۔ پرسوں شہر میں گولیاں چلیں۔ دیہاتوں میں آج کل لگان وصول کیا جارہا ہے، کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں۔ غلہ ارزاں ہوگیا ہے اور دن دن بھاؤ گرتا جاتا ہے۔ پونے دو روپیہ میں من بھر گیہوں آتا ہے۔ میری عمر ہی کیا ہے، اماں جی بھی کہتی ہیں، اتنا سستہ غلہ کبھی نہیں تھا۔ کھیت کی پیداوار سے بیجوں تک کے دام نہیں آتے، سینچائی اور محنت سب اوپر، غریب

اس کے لیے تو یہ ایک عبادت تھی۔ اور وہ اپنی ساری نسوانی عقیدت اور انہماک کے ساتھ اسے بجالاتی تھی۔ لیکن طائر کو آسمان پر پرواز کرنے کے بعد اپنے آشیانہ کی یاد تو آتی ہے۔ چھما کا یہ آشیانہ کہاں تھا۔

لگان کہاں سے دیں؟ سرکار کا حکم ہے کہ جیسے بھی ہو لگان وصول کیا جائے' کسان اس پر بھی راضی ہیں کہ ہمارے مال اسباب نیلام کرلو' گھر قرق کرلو' اپنی زمین لے لو' مگر یہاں تو حاکموں کو اپنی کارگذاری دکھلانے کی فکر لگی ہوئی ہے' زمینداروں نے کہہ دیا ہے کہ ہم سے وصول نہیں ہوگا۔ اب پولیس بھیجی گئی ہے۔ بھیروی گنج کا علاقہ پیسا جا رہا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ایک کسان کے گھر میں گھس کر کئی کانسٹبلوں نے اسے پیٹنا شروع کیا۔ بیچارہ بیٹھا مار کھاتا رہا اس کی بیوی سے نہ رہا گیا۔ شامت کی ماری کانسٹبلوں کو گالیاں دینے لگی۔ بس ایک کانسٹبل نے اسے برہنہ کردیا۔ اور اب بہن' کیا کہوں' ہمارے ہی بھائی اتنی بے رحمی کریں' اس سے زیادہ شرمناک اور کیا ہوگا' اب کسان سے نہ ضبط ہوا۔ کبھی پیٹ بھر غریبوں کو کھانے کو تو ملتا نہیں' اس پر کڑی مشقت' جسم سے نہ طاقت باقی رہتی ہے' نہ ہمت۔ مگر انسان کا دل ہی تو ٹھہرا' بیچارا بے دم پڑا ہوا تھا۔ بیوی کا چلانا سن کر اٹھ بیٹھا۔ اور اس بدمعاش کانسٹبل کو زور سے دھکا دے کر اس سے لپٹ گیا۔ ایک کسان کسی پولیس کے آدمی کے ساتھ اتنی بے ادبی کرے' اسے بھلا وہ کہیں برداشت کرسکتی ہے۔ سب کانسٹبلوں نے غریب کو اتنا مارا کہ وہ مرگیا۔

چھما۔ گاؤں کے اور لوگ تماشا دیکھتے رہے

مردلا ـــ بہن اس میں بھی آفت ہے۔ اگر دس بیس آدمی جمع ہو جاتے تو پولیس سمجھتی' مزاحمت کرنے آتے ہیں۔ شاید ڈنڈے چلانا شروع کردیتی اور اگر کوئی آدمی غصہ میں ایک آدھ پتھر پھینک دیتا تو گولیاں چلا دیتی' دو چار آدمی جن جاتے اسی لئے لوگ جمع نہیں ہوتے۔ لیکن جب وہ کسان مرگیا' تو گاؤں والے طیش میں آئے۔ لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے اور کانسٹبلوں کو گھیر لیا۔ ممکن ہے دو چار آدمیوں نے لاٹھیاں چلائی ہوں۔ کانسٹبلوں نے گولیاں چلانی شروع کیں دو تین کانسٹبلوں کے چوٹیں آئیں۔ اس کے بدلے میں دس بارہ آدمیوں کی جانیں لے لی گئیں' چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو اختیارات مل جاتے ہیں۔ یہ لوگ اس کا بے جا استعمال کرنے لگتے ہیں۔ گاؤں کے غریب لوگوں پر اپنا رعب جما کر کانسٹبل فتح کے نقارے بجاتے ہوئے لوٹ گئے۔ گاؤں والوں کی فریاد کون سنتا! غریب ہیں' بیکس ہیں' بے زبان ہیں' جتنے آدمیوں کو چاہو مار ڈالو' حکام اور عدالت سے انہوں نے انصاف کی امید چھوڑ دی۔ سوچتے ہیں' آخر اسی سرکار نے تو کانسٹبلوں کو تعینات کیا تھا۔ وہ سرکار کسانوں کی فریاد کیوں سننے لگی؟ مگر آدمی کا دل بغیر فریاد کئے نہیں مانتا گاؤں والوں نے اپنے شہر کے بھائیوں سے فریاد کرنے کا فیصلہ کیا' پبلک اور کچھ نہیں کرسکتی' ہمدردی تو کرتی ہے' غم کی داستان سن کر آنسو تو بہاتی ہے۔ مظلوم کے لئے ہمدردی کے آنسو بھی کم پیارے نہیں ہوتے۔ اگر آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو کر کچھ ہمدردی کرتے' تو ان غریبوں کی تشفی ہو جاتی۔ مگر پولیس نے اس گاؤں میں لوگوں کا آنا جانا بند کردیا تھا۔ چاروں سرحدوں پر کانسٹبل کھڑے کر دیئے گئے تھے' یہ زخم پر نمک تھا' مارتے بھی ہو اور رونے بھی نہیں دیتے آخر لوگوں نے لاشیں اٹھائیں اور شہر والوں کو اپنی مصیبت کی کہانی سنانے آئے' ہنگامہ کی خبر پہلے ہی شہر میں پہنچ چکی تھی۔ ان مظلوموں کو دیکھ کر پبلک کو اشتعال ہو گیا۔ اور جب سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان لاشوں کا جلوس نکالنے کی



تصویر ـــ روی شنکر ساہنی

نغمۂ حبّ الوطنی

حُبّ وطن کے نغمے گا کر دل میں جوت جگاؤ نا
یک جہتی کا پرچم لے کر بستی بستی جاؤ نا

دیش اگر ہے تم کو پیارا اب اُس کے کام آؤ نا
دیش پہ تن من وارنی کر کے اُس کی شان بڑھاؤ نا

اُنس و محبت خُلق و مُروت اوصافِ انسانی ہیں
دشمنِ انساں ہیں جو انساں تم ان کو سمجھاؤ نا

نفرت کے سب زہریلے پودوں کی کر کے بیخ کنی
گُلشن گُلشن کیاری کیاری پیار کے پھول کھلاؤ نا

سُکھ دیکر ہی سُکھ ملتا ہے دُکھ دے کر دُکھ پاؤ گے
جو بوؤ گے وہ کاٹو گے یہ سب کو سمجھاؤ نا

انسانوں میں باہم اِک رشتہ ہے بھائی چارے کا
اُس رشتے کا مقصد کیا ہے یہ سب کو سمجھاؤ نا

اُس کا پیارا ہے وہ جس کو پیار ہے اسکے بندوں سے
حق کے بیگانوں کو طالب حق کی بات بتاؤ نا

طالب چاندپوری
7۔ امیر نشاں' دودھ پور علی گڑھ (یو۔پی)

کی اجازت نہیں دی تو لوگ اور بھی جھنجھلائے، بہت بڑا مجمع ہوگیا۔ میرے بابو جی بھی اس مجمع میں تھے۔ سمجھاتی رہی مت جاؤ، آج کا رنگ اچھا نہیں ہے۔ کہنے لگے میں کسی سے لڑنے تھوڑے ہی جاتا ہوں، پچاس ہزار آدمی جنازہ کے ساتھ تھے، اور پانچ سو مسلح پولیس راستہ روکے ہوئے تھی۔ سوار اور پیادے پوری فوج تھی۔ جب بار بار پولیس کی دھمکیوں پر بھی مجمع منتشر نہ ہوا، تو گولیاں چلانے کا حکم ہوگیا۔ فائر ہونے لگے، کتنے گھائل ہوئے؟ کون جانتا ہے میرا مکان لب سٹرک ہے، میں اپنے چھجے پر کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ ہزاروں آدمی بھاگے چلے آرہے تھے۔ بہن! وہ نظارہ یاد کرکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی دہشت ایسی سراسیمگی کہ تم سے کیا کہوں، مگر ان بھاگنے والوں کے پیچھے سرفروش جانبازوں کی ایک جماعت تھی۔ جو دیوار کی طرح مستقل کھڑے گولیاں کھا رہے تھے۔ اور پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے، بندوقوں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اور ہر ایک دھائیں دھائیں کے بعد ہزاروں گلوں سے "جے" کی صدا نکلتی تھی۔ اس صدا میں کتنی کشش تھی! کتنا جوش تھا! بس یہی جی چاہتا تھا کہ جا کر گولیوں کے سامنے کھڑی ہو جاؤں، اور ہنستے ہنستے مر جاؤں۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا مر جانا کوئی کھیل ہے۔ اماں جی کمرہ میں بھان کو لئے مجھے بار بار اندر بلا رہی تھیں، جب میں اندر نہ گئی، تو وہ بھان کو لئے ہوئے چھجے پر آگئیں۔ اسی وقت دس بارہ آدمی ایک سٹریچر پر میرے سوامی کی لاش لئے ہوئے دروازہ پر آئے۔ اماں کی ان پر نظر پڑی، سمجھ گئیں، مجھے تو سکتہ سا ہوگیا، اماں نے جا کر ایک بار لاش کو دیکھا، اسے چھاتی سے لگایا اس کا بوسہ لیا۔ اور سیدھے چورستے کی طرف چلیں۔ جہاں سے اب بھی دھائیں دھائیں" اور "جے" کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نقش دیوار بنی کبھی لاش کو دیکھتی تھی، کبھی اماں جی کو، نہ کچھ بولی نہ جگہ سے ہلی، نہ روئی، نہ بے قرار ہوئی۔ احساس کی مجھ میں قوت ہی نہ رہی تھی۔ اماں جی جانبازوں کی صف میں جا کر سامنے کھڑی ہوگئیں۔ اور ایک ہی منٹ میں ان کی لاش بھی زمین پر گر پڑی۔ ان کے گرتے ہی جانبازوں کا ضبط بھی رخصت ہوگیا۔ ان کے سر پر خون سا سوار ہوگیا۔ نہتے تھے۔ مگر ہر ایک فرد اپنے دل میں شیر کی سی قوت محسوس کر رہا تھا سپاہیوں نے اس سیلاب کو آتے دیکھا، تو ہوش

> جب چتائیں راکھ ہوگئیں، تو ہم لوگ لوٹے لیکن اس گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی میرے لیے اب وہ گھر نہ تھا، میرا گھر اب یہ ہے جہاں میں بیٹھی ہوں، یا پھر وہی چتا، میں نے گھر کا دروازہ بھی نہیں کھولا، مہلا آشرم میں چلی گئی کل کی گولیوں میں کانگریس کمیٹی کا صفایا ہوگیا تھا۔ کانگریس باغی انجمن قرار دے دی گئی تھی

اڑ گئے، جانیں لے کر بھاگے کوئی اِدھر کوئی اُدھر مگر بھاگتے ہوئے بھی گولیاں چلاتے تھے۔ بھان چھجے پر جھکا کھڑا تھا۔ نہ جانے کدھر سے ایک گولی آکر اس کے سینے میں لگی۔ میرا لال وہیں گر پڑا، سانس تک نہ لی، مگر میری آنکھوں میں اب بھی آنسو نہ تھے۔ میں نے بھان کو گود میں اٹھا لیا، اس کے سینے سے خون جاری تھا۔ میں نے اسے جو دودھ پلایا تھا اسے وہ خون سے ادا کر رہا تھا۔ اس کے خون سے تر کپڑے پہنے ہوئے، مجھے ایسا فخرمندانہ غرور ہو رہا تھا جو شاید اس کے بیاہ میں ریشمی کپڑے پہن کر بھی نہ ہوتا۔ لڑکپن، جوانی اور موت، ساری منزلیں ایک ہی ہچکی میں تمام ہوگئیں۔ میں نے بیٹے کی لاش کو باپ کی گود میں دے دیا۔ اتنے میں اماں جی کا جنازہ بھی آپہنچا۔ معلوم ہوتا تھا لیٹی ہوئی مسکرا رہی ہیں۔ مجھے تو روکتی رہتی تھیں اور خود اس طرح بھاگ کر آگ میں کود پڑیں، گویا وہی سورگ کا راستہ ہو۔ جب ندی کے کنارے ایک ہی چتا میں تینوں لاشیں رکھی گئیں، تب میرا سکتہ ٹوٹا، ہوش آیا، ماں اپنے جنم بھر کی کمائی لئے جاتی ہے، جنہیں اتنے نازوں سے پالا انہیں چھوڑ کر کیسے جاتی۔ وہ تو وہاں بیٹے اور پوتے کے ساتھ گئیں، میرے لئے کیا چھوڑا ایک بار جی میں آیا میں بھی انھیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں، سارا کنبہ ایک ساتھ ایشور کے دربار میں جا پہنچے۔ لیکن پھر میں نے سوچا، تو نے ابھی ایسا کام ہی کون سا کیا ہے؟ جس کا معاوضہ یہ ملے بہن! اس چتا کی لپٹوں میں مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا، کہ اماں جی سچ مچ بھان کو گود میں لئے بیٹھی مسکرا رہی ہیں۔ اور سوامی جی مجھ سے کہہ رہے ہیں، تم جاؤ اور بے فکر ہو کر کام کرو۔ ان کے چہروں پر کتنا جلال تھا! خون اور آگ میں ہی تو دیوتا بنتے ہیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ندی کے کنارے نہ جانے کتنی چتائیں جل رہی تھیں دور سے یہ جلتی ہوئی چتائیں مشعلوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے دریا کے پل پر برقی لالٹینوں کی ایک لمبی قطار ہو، اسی پل ہو کر شہادت کی منزل ہے، اور یہی مشعلیں بتاتے دوام کی طرف لے جاتی ہیں، یا یہ بھٹیاں تھیں، جن میں بھارت کی تقدیر گھڑی جا رہی تھی۔

جب چتائیں راکھ ہوگئیں، تو ہم لوگ لوٹے، لیکن اس گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی، میرے لئے اب وہ گھر نہ تھا، میرا گھر اب یہ ہے، جہاں ہیں بیٹھی ہوں، یا پھر وہی چتا، میں نے گھر کا دروازہ بھی نہیں کھولا، مہلا آشرم میں چلی گئی۔ کل کی گولیوں میں کانگرس کمیٹی کا صفایا ہوگیا تھا۔ کانگرس باغی انجمن قرار دے دی گئی تھی۔ اس کے دفتر پر پولیس نے چھاپا مارا، اور اس پر اپنا قفل ڈال دیا۔ مہلا آشرم پر بھی حملہ ہوا۔ اس پر بھی قفل ڈال دیا گیا۔ ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا۔ اور کام کرتے رہے شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ کل کے خونیں واقعہ کی یاد اور خوشی اور مبارکباد میں جلوس نکالنا ضروری تھا لوگ کہتے ہیں، جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں، مستعد ہیں، میدان سے ہٹے نہیں، ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ یہ دکھا دینا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں، ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ جس کی بنیاد خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے۔ اور پولیس نے جلوس کو روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت دینا بھی ضروری سمجھا، شاید پبلک کو دھوکہ ہوگیا ہو کہ کل کے واقعے سے سرکار کا اخلاقی احساس بیدار ہوگیا ہے اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہے۔ پبلک کے اس

وہم کو دور کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا۔ وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے تمہاری خوشی یا ناخوشی کی ہم کو پروا نہیں۔ جلوس نکالنے کی ممانعت کردی گئی۔ پبلک کو ہدایت اور تنبیہ کی گئی کہ خبردار جلوس میں نہ آنا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ مگر شام کے وقت پچاس ہزار کا مجمع ہوگیا۔ آج کانگرس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت، جسے بولنے کا بھی شعور نہیں، جس نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا، آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس رتبہ پر پہنچ گئی تھی۔ جو بڑے سے بڑے سرکاری افسر کو بھی، بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں۔ یہ دلوں کی حکومت تھی۔ یہ مجمع کیا میرا تنخواہ دار تھا، یا اسے مجھ سے کسی نفع کی امید تھی، یا نقصان کا خوف تھا! ہرگز نہیں۔ پھر بھی وہ میرے کڑے سے کڑے حکم کو بسر و چشم ماننے کو تیار تھے اسی لئے کہ ان کے دلوں میں آزادی کی جو تڑپ ہے، غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کی جو بے چینی ہے، میں اس تڑپ اور بے چینی کی زندہ مثال تھی جلوس روانہ ہوا۔ اسی وقت پولیس نے میری گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ مجھے وارنٹ دیکھتے ہی تمہاری یاد آئی، پہلے تمہیں میری ضرورت تھی۔ اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ پہلے تم مجھ سے ہمدردی کی خواستگار تھیں۔ اب میں تمہاری ہمدردی کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں۔ اب بے فکر ہوں، اور مجسٹریٹ جو بڑی سے بڑی سزا دے اس کے لئے تیار ہوں۔ اب میں پولیس کی غلط بیانیوں یا بے جا الزام کے خلاف ہرگز زبان تک نہ کھولوں گی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں میں آزاد رہ کر جو کچھ کرسکتی ہوں، جیل میں رہ کر اس سے کہیں زیادہ کرسکتی ہوں۔ آزادی میں غلطیوں کا امکان ہے، بہکنے کا خوف ہے، مصالحت کا اندیشہ ہے، رقابت کی فکر ہے، جیل احترام اور عقیدت کا ایک دائرہ ہے جس کے اندر شیطان قدم نہیں رکھ سکتا۔ میدان میں جلتا ہوا الاؤ ہوا میں اپنی حرارت کو کھو دیتا ہے لیکن انجن میں بند ہو کر وہی آگ تحریک کا لازوال خزانہ بن جاتی ہے۔

اور دیویوں کو بھی خبر ملی۔ سب کی سب مردانہ ملنے آپہنچیں۔ پھر بھارت ماتا کی "جے" کی صدا جیل کی دیواروں کو توڑتی ہوئی آسمان میں جا پہنچی۔

گلشنِ ہند

م۔م۔ راجندر 68۔ چتروہار۔ دہلی۔

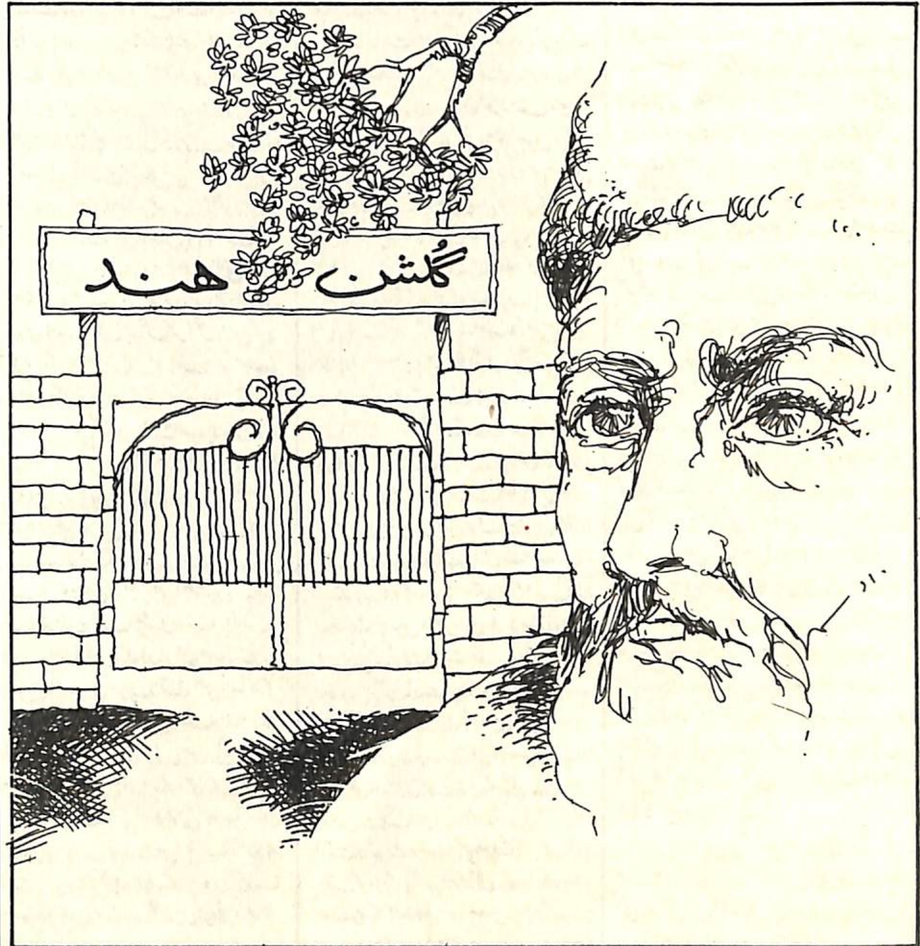
الطاف حسین بساطی کے سامان کے پُرانے اور مشہور تاجر تھے۔ کئی ہزار روپے روز کی بکری تھی اور ان کا شمار شہر کے متموّل سوداگروں میں ہوتا تھا۔ عمر کوئی ساٹھ باسٹھ سال کی ہوگی مگر جسم توانا اور فربہ تھا۔ گول، سرخ اور سفید چہرہ جس سے ذہانت، طمانیت، خوش دلی اور اعتماد جھلکتا تھا۔ گھنی، کھچڑی داڑھی چہرے کو اور بارعب بناتی تھی۔ عموماً سفید رنگ کی گاندھی ٹوپی، اچکن اور چوڑی دار پاجامہ و جوتی پہنتے تھے۔ یہی لباس اُن کے آبا مرحوم شرافت حسین صاحب کا تھا جنھوں نے اپنے وقت کے سیاسی رہنماؤں کی قیادت میں جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور طرح طرح کی صعوبتیں سہہ کر ہر قسم کی قربانی دی تھی۔ دراصل ان کا سارا خاندان ہی آزادی کے پروانوں پر مشتمل تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد الطاف حسین نے اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنا خاندانی کاروبار سنبھال لیا تھا جسے اُن کے دادا اور بعد ازاں ان کے والد کے زمانے میں ان کی وطن پرستی اور جدوجہد سے فرنگیوں نے بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ اگرچہ وہ ایک تاجر تھے مگر ان کی رگوں میں بھی اپنے دادا اور اپنے والد کا خون ہی دوڑ رہا تھا اور حب الوطنی میں وہ اب بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ چال میں ایک مخصوص وقار اور وجاہت تھی۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ اپنے والد مرحوم شرافت حسین صاحب کی ہو بہو تصویر تھے۔ یہی بات ان کے دونوں بیٹوں، ارشد اور امجد کے بارے میں کہی جا سکتی تھی جو کالج کی پڑھائی ختم کر کے اب کاروبار میں اپنے والد کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

الطاف حسین کے لمبے چوڑے حویلی نما مکان میں جو بات ہر آنے والے کو کھینچتی تھی وہ سنہری قیمتی فریموں میں جڑی ہوئی بڑے سائز کی متعدد تصویریں تھیں جو دیوار پر آویزاں تھیں۔ یہ تصویریں گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں اور دوسرے قومی لیڈروں کی تھیں۔ اسی طرح قومی لیڈروں کی تصویروں کی ایک پوری گیلری ان کی بڑی بیٹھک میں بھی تھی۔ ان تصویروں سے اُن کے خاندان کی روایتی حب الوطنی عیاں تھی۔ ملنے والوں کو ان تصویروں کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے:

"ان عظیم رہنماؤں کی تصویروں کو دیکھ کر فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اپنے وطن کے لیے قربانی اور سرفروشی کس جذبے کا نام ہے۔ والد صاحب کی تصویر ان سب کے نیچے یوں لگا رکھی ہے کیونکہ ان کا احترام کرنا، اُن کی یاد کو قائم رکھنا مجھ پر واجب ہے۔ ان کی تصویر مجھے کاروبار میں ایمانداری کے اصول کی مسلسل یاد دلاتی ہے۔ انھوں نے یہ بزنس سخت ناساعد حالات میں صرف ایک ہزار روپے کے سرمایے سے شروع کیا تھا۔ زندگی بھر ایمانداری اور دیانتداری کے اصول پر قائم رہے اور کبھی کسی مال پر دس فیصدی سے زیادہ منافع نہیں لیا خواہ تیار کرنے والی کمپنی کا کمیشن اس سے زیادہ ہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں دس فیصدی سے زیادہ کمیشن ہوتا تو اس کا فائدہ گاہک کو مل جاتا — چونکہ وہ جنگِ آزادی کے سپاہی بھی رہے۔ اس لیے انگریزوں کی حکومت نے ہمیں بڑا نقصان پہنچایا مگر میں ان کے ہی اصول پر قائم ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج یہ کاروبار بہت بڑا ہے مگر مجھے اس بات پر بڑا فخر ہے کہ ہم نے کبھی ایک پیسے کی بے ایمانی نہیں کی، نہ سرکار کے ساتھ اور نہ اپنے گاہکوں کے ساتھ۔"

الطاف حسین ایک مثالی بزنس مین کے علاوہ ایک عمدہ شہری بھی تھے۔ سماجی خدمت کا کوئی بھی کام ہوتا، اپنی اور اپنے بیٹوں کی خدمات فوراً پیش کر دیتے۔ کوئی بھی انجمن کسی عمدہ کام کے لیے چندہ مانگتی تو دل کھول کر دیتے۔ یہ چندہ بلا کسی تفریق اور امتیاز کے دیا جاتا۔ رام لیلا ہوتی تو ایک خطیر رقم ان کے یہاں سے جاتی۔ شِوراتری کے موقع پر بھی اور سکھوں کے دھارمک جلوسوں میں بھی شربت کی سبیلوں کے خرچے میں بھی اپنا حصہ ادا کرتے تھے۔ اگرچہ ادب کے دلدادہ تھے اور اپنے مکان پر ہر دوسرے مہینے ایک مشاعرہ کرواتے تھے مگر شہر میں ہونے والے مشاعروں کے لیے بھی مالی مدد دیتے تھے۔ ان کی دریادلی اور وسعتِ قلب کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے مشہور تہواروں کی انتظامیہ کمیٹیوں کا اُنھیں بھی رُکن بنا لیا جاتا۔ الطاف حسین اکثر کہا کرتے۔

"ہمارا سارا ملک ایک چمن ہے، ایک گلشن، جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ مختلف مذاہب، عقائد اور رسوم کے باوجود ہماری ایک مخلوط اور مشترکہ تہذیب



ہے جس پر ہمیں فخر ہے. میں تو اسے آفاقی یا انسانی تہذیب کے ارتقا کی طرف ایک بڑا قدم سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہماری مثال آفاقی سطح پر بھی بھائی چارے اور رواداری کے جذبے کو تقویت دے گی۔"

الطاف حسین صاحب کے گھر پر ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کا اتفاق مجھے بھی ہوا. ان کی طرف سے شعرا کی پر تکلف خاطر تواضع کا انتظام بڑے پیمانے پر تھا. جب کسی صاحب نے صدر کے طور پر الطاف حسین کا نام تجویز کر دیا اور ہم سب نے فی الفور اس کی تائید کی تو انھوں نے انکار کرنے میں کوئی وقت ضائع نہیں کیا اور بڑے عجز سے بولے کہ"میں ہرگز اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا اور یہ اعزاز کسی شاعر یا ادیب کو ہی ملنا چاہیے"! انھوں نے وہاں موجود ایک ممتاز اور بزرگ شاعر کا نام خود ہی تجویز کر دیا. مشاعرے میں جس میں پندرہ سولہ شعرا نے حصہ لیا اور مجھ جیسے پانچ سات سننے والے بھی تھے، بڑا لطف رہا اور شعر و سخن کا دور نصف شب تک چلتا رہا. جب الطاف حسین ہم سب کو باہر اپنے مکان کے بیرونی دروازے تک چھوڑنے آئے تو مجھے روک کر بولے۔

"کل اتوار ہے اور دکان بند رہے گی. آپ کی بھی چھٹی ہے اگر کل آپ صبح گیارہ بجے کے قریب تھوڑی دیر کے لیے آسکیں تو آجائیے، آپ سے کچھ صلاح کرنی تھی۔"

"میں حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا.

میں اگلے روز ان کے یہاں وقت پر پہنچ گیا. اتوار کو وہ عموماً اپنے اکاؤنٹنٹ دینا ناتھ کو حسابات کے سلسلے میں اپنے گھر پر بلوا لیتے تھے مگر اس روز انھیں نہیں بلوایا تھا. الطاف حسین مجھے اپنی بیٹھک میں لے گئے اور دیوان پر بیٹھ کر ایک بڑا سا نقشہ کھول کر بولے۔

"والدِ محترم دکان کی آمدنی میں سے صرف ایک ہزار روپے ماہانہ گھر کے اخراجات کے لیے لیتے تھے. ہاں ان کے زمانے میں یہ رقم کافی بڑی ہوتی تھی مگر کنبہ بھی بڑا تھا. کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کئی ہزار روپے ماہوار کی آمدنی ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے نجی اخراجات میں فضول خرچی بالکل نہیں کرتے تھے. انھوں نے صرف یہ ایک مکان ہم سب کے رہنے کے لیے بنایا. اگر وہ چاہتے اور آزادی کی جنگ میں شریک ہونے کا جنون سر پر سوار نہ ہوتا تو بڑی بھاری جائداد کھڑی کر سکتے تھے. مگر ان کا تو یہ عقیدہ تھا کہ زیادہ آمدنی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان عیش و عشرت میں پڑ جائے بلکہ یہ اس بات کا موقع ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ راہِ مولا میں خرچ کرے. اس لیے وہ اپنی آمدنی کا کثیر حصہ رفاہِ عام کے کاموں میں خرچ کرتے تھے. یہی اصول میں نے اپنایا ہے. اب مہنگائی کی وجہ سے میں گھر کے اخراجات کے لیے پانچ ہزار روپے ماہانہ لیتا ہوں. خدا کا فیض اتنا رہا کہ آج میری ایک نہیں چار دکانیں ہیں اور ایمانداری سے جوڑی ہوئی کافی بڑی رقم میرے پاس ہے میری دلی خواہش ہے کہ اسے والد صاحب کے ایک خیال کو عملی جامہ پہنانے میں صرف کر دوں. میں اولاد کے لیے بھی ضرورت سے زیادہ پیسہ چھوڑنے کے حق میں بالکل نہیں ہوں. آپ سے اسی سلسلے میں صلاح کرنی ہے۔"

"آپ کے والدِ محترم نے کیا سوچا تھا؟" میں نے پوچھا.

"والد صاحب یہ چاہتے تھے کہ وہ اس شہر میں ایک عظیم مہمان خانہ یا سرائے قائم کریں اور اس کا نام "گلشنِ ہند" رکھا جائے، یہ مسلمانوں کی سرائے یا مسافر خانہ یا ہندوؤں کی دھرم شالہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے دروازے ہر مسافر اور ہر شہری کے لیے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو کھلے رہیں گے. اسی میں ہماری باراتوں کے ٹھہرنے کا انتظام بھی ہوگا اور ایک ہال تمدنی اور ادبی تقریبات کے لیے وقف رہے گا. دوسرے لفظوں میں یہ مہمان خانہ جہاں کوئی اجرت نہیں لی جائے گی ہمارے وطن اور ہماری مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کا آئینہ دار ہوگا۔"

"یہ خیال تو بڑا قابلِ تعریف ہے. اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔" میں نے کہا

"والد صاحب نے" الطاف حسین بولے "اپنی زندگی میں ہی اس مقصد کے لیے دو لاکھ روپے کی مالیت کی زمین ریلوے روڈ پر لے لی تھی. انھوں نے جنگِ آزادی میں کل ملا کر تقریباً تین سال جیل میں کاٹے. کاروبار میں تو بھاری نقصان ہوا ہی. اپنی صحت بھی گنوا بیٹھے تھے. اللہ تعالیٰ نے انھیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ "گلشنِ ہند" کی تعمیر شروع کرا دیتے. شاید خدا نے یہ سعادت مجھے بخشی تھی. اب آپ فرمائیے کہ کیا یہ منصوبہ ٹھیک رہے گا یا آپ اس میں کوئی ترمیم یا اضافہ کرنا پسند کریں گے. یہ نقشہ بھی دیکھ لیجیے. شاید کچھ مسلمان یا کچھ ہندو اب یا بعد میں ایک مشترکہ سرائے کی مخالفت کریں مگر مجھے ایسی بے بنیاد مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں۔"

"مخالفت ہونی تو نہیں چاہیے۔" میں نے کہا "اس میں کوئی بات ہی قابلِ اعتراض نہیں ہے. ویسے سر پھرے تو دونوں مذاہب میں ہی موجود ہیں. آپ اس کا خیال نہ کریں. اس منصوبے کی اجتماعی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے. اس میں کسی ترمیم یا اضافے کی بھی ضرورت نہیں ہے. آپ نے نقشہ بھی بہت عمدہ اور ہر ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر بنوایا ہے. آپ خدا کا نام لے کر بسم اللہ کر دیجیے. آپ نے اپنے بیٹوں ارشد اور امجد سے تو ذکر کیا ہی ہوگا۔"

"اس خاندان میں" الطاف حسین سر اٹھا کر بولے "بچوں نے بڑوں کی خواہشات اور احکام کے آگے ہمیشہ سرِ تسلیم خم کیا ہے. وہ تو کئی بار کہہ چکے ہیں کہ "گلشنِ ہند" کی بنیاد رکھوا دیں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے ریلوے روڈ پر ایک لمبے چوڑے قطعۂ اراضی پر بنیادیں کھدنے لگیں اور تعمیر کا کام شروع ہو گیا. باہر لکڑی کے ایک بڑے بورڈ پر "گلشنِ ہند" لکھوا دیا گیا. لوگ بورڈ پر اس نام کو پڑھ کر ازراہِ تجسس پوچھتے کہ یہ کون سی عمارت بن رہی ہے. الطاف حسین اور ان کے بیٹے خود بھی جتنا ممکن تھا موقع پر موجود رہتے اور ہم لوگ بھی باری باری جو دیکھ بھال اور نگرانی ہم سے ہوتی کر آتے. کوئی دو سال میں عمارت مکمل ہو گئی. الطاف حسین نے بڑا اعلیٰ سامان لگوایا اور یہ شہر کی سب سے خوبصورت نئی عمارت تھی۔

اس کی رسمِ افتتاح کے لیے ایک ہزار سے زیادہ دعوت نامے بھیجے گئے. اس موقع پر اس میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہونا تھا. اس لیے رسمِ افتتاح بھی شام کو سات بجے ہی رکھ لی گئی تھی. شہر کی خلقت تھی کہ ٹوٹی پڑ رہی تھی. عمارت کی پیشانی پر بجلی کے قمقموں سے بنا ہوا اور بڑے حروف میں "گلشنِ ہند" لکھا ہوا تھا ساری عمارت کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا. مشاعرے کے ہال میں اس صبح جو پہلی چیزیں لگیں وہ اُن ہی عظیم قومی رہنماؤں کی بڑی بڑی تصویریں تھیں جو اُن کی دکانوں اور ان کے گھر کی بھی زینت تھیں. الطاف حسین نے اس عمارت کو بنوانے میں دن رات اتنا کام کیا تھا کہ وہ اب خاصے کمزور اور بوڑھے نظر آ رہے تھے. مگر چہرے پر وہ شادمانی بھی عیاں تھی جو ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل سے آجاتی ہے. لوگ مبارکباد دے رہے تھے مگر الطاف حسین انکسار اور عجز کی مورت بنے ہوئے اُن تصویروں کی طرف اشارہ کر دیتے اور کہتے۔

"ان عظیم ہستیوں کے سامنے ہماری حیثیت خس و خاشاک کی سی ہے. ملک آج جو کچھ بھی ہے ان ہی کی قربانیوں کی بدولت ہے جہاں تک 'گلشنِ ہند' کا سوال ہے خدا ہی کارساز ہے. جو کچھ بھی ہوا اس کی رحمت اور برکت سے ہوا۔"

اور میں سوچ رہا تھا کہ الطاف حسین ایسی ہستی تھے جو ہمارے دلوں میں، اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں، جنگِ آزادی کی یاد کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور جن پر ہم سب بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں. اپنی محنت کی کمائی کو عوام کی بہبودی کے لیے بے دریغ خرچ کرنے کی ایسی مثال شاذ ہی ملتی ہے. اس زمانے میں اصول پروری اور ایمانداری ویسے ہی عنقا ہیں. بلاشبہ وہ ایک سچے ہندوستانی تھے جنھیں اپنے وطن سے حقیقی پیار تھا. ان کے نزدیک اس ملک کے سارے رہنے والے مختلف المذہب ہونے کے باوجود بھائی بھائی تھے. پھر اس ہال میں اس وقت جو مجمع تھا وہ گلشنِ ہند کی ہی تصویر تھا، ایک خالص ہندوستانی بھیڑ جو ہمیں ملک کی ہر گلی، کوچے، بازار اور محلے میں نظر آتی ہے، دست بہ دست، شانہ بہ شانہ اور دل بہ دل. اچانک الطاف حسین کی آواز کانوں میں پڑی۔

"آئیے قبلہ مولانا صاحب، آپ یہاں تشریف رکھیے. پنڈت رام پرشاد جی آپ مولانا صاحب کے برابر میں اسی کرسی پر آئیے اور رنبیر سنگھ جوہر صاحب آپ تو شاعر ہیں، اوپر ڈائس پر تشریف لائیے نا . . . ."

"ہمارا ملک ایک چمن ہے، ایک گلشن جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ مختلف مذاہب، عقائد اور رسوم کے باوجود ہماری ایک مخلوط اور مشترکہ تہذیب ہے جس پر ہمیں فخر ہے۔ میں تو اسے آفاقی یا انسانی تہذیب کے ارتقا کی طرف ایک بڑا قدم سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہماری مثال آفاقی سطح پر بھی بھائی چارے اور رواداری کے جذبے کو تقویت دے گی"

ایک تمثیلی نظم

بہارِ آزادی

رفعت سروش
B 2 پاکٹ C، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی

کردار: تاریخ - وقت

تاریخ :- (اپنی موج میں کچھ گنگنا رہی ہے)
بہار جس کو کہیں ہے بہارِ آزادی
دلوں کو رکھتا ہے زندہ خمارِ آزادی

وقت :-
تمہارے نغمے نے مسحور کچھ ایسا کیا مجھکو
کہ میں نے چلتے چلتے ــــ رک کے دیکھا ــ کون گاتا ہے!!
یہ نغمہ جس میں میری روح کی آواز شامل ہے
بتاؤ - کون ہو تم ــــ؟

تاریخ :- .... تم بتاؤ، کون ہو! کیوں اس طرف آئے
وقت :- حسینہ! وقت میرا نام ہے ــ اب تو بتاؤ کچھ
تاریخ :- میں ہوں تاریخ
میں خود کچھ نہیں ــ انسان نے مجھ کو لکھا، لیکن
مجھے لکھنے سے پہلے اس نے اپنے آپ کو پرکھا
اسے جو کچھ بھی یاد آیا
کہانی اپنی اور اپنے بزرگوں کی
وہی میری بنا ٹھہری
میں ہوں انسان کی تخلیق
لیکن اب ہزاروں سال سے جب میں لکھی جاتی رہی
انساں کو رستہ دکھاتی ہوں

وقت :- تو گویا اپنی ہی تخلیق کے ہاتھوں میں اب انساں کھلونا ہے
تاریخ :- نہیں
لیکن مدد کرتی ہوں اس کی،
جب وہ خود کو بھول جاتا ہے
اُسے ماضی کا آئینہ دکھا کر یہ بتاتی ہوں
کہ اچھا کیا ــــ بُرا کیا ہے
کہ ظالم کون ہے
مظلوم آخر کس کو کہتے ہیں
ہزاروں سال کی باتیں،
ہزاروں سال کے قصے،
ہزاروں سال کے سب تجربے انسان نے مجھ میں سجائے ہیں
میں اب زندہ حقیقت ہوں
میں ہوں انسان کی عظمت
نہ جانے کتنی قوموں، کتنی نسلوں، کتنے ملکوں اور سماجوں کا ہوں آئینہ
مرے صفحات پر انسان کے اعمال
اس کی جستجو، محنت، مشقت، ظلم، استحصال
اس کے کارنامے، کامرانی، نامرادی
کیا نہیں لکھا
مجھے پڑھنے کو لیکن عقل و دانش کی ضرورت ہے

وقت :- تمہیں شاید ضرورت سے زیادہ ناز ہے خود پر،
مجھے دیکھو! کہ میں ہوں وقت،
میں انساں کا ساتھی روزِ اول سے
غلامی اور آزادی پرانا کھیل ہے
کھیلا گیا جو میرے آنگن میں
کبھی یہ کھیل تلواروں کا تھا
پھر آگئی بارود بھی انسان کے بس میں
اور اب تو ایٹمی ہتھیار بھی جوہر دکھاتے ہیں

تاریخ :- میں ڈرتی ہوں کہ یہ کس دور میں داخل ہوا انساں،
مجھے ہر حال میں انسانیت کا بوجھ اُٹھانا ہے
مرے اوراق پر مرقوم ہر تازہ فسانہ ہے

وقت :- تمہیں تو صرف لکھنا ہے فسانہ
میں ہمیشہ ساتھ رہتا ہوں
میں اس کے ہر عمل کو دیکھتا ہوں،
روکنا اس کو مگر منصب نہیں میرا
غلامی سے مجھے نفرت رہی
لیکن اک ایسا دور بھی آیا
کہ انگریزوں نے دنیا میں
حکومت کا نیا نغمہ
کچھ ایسے ساز پہ چھیڑا
وہ آخر نصف دنیا پر ہوئے قابض

تاریخ :- مجھے معلوم ہے وہ نصف دنیا کے ہوئے آقا
معیشت ان کے قبضے میں
فنون و علم و حکمت ان کے قبضے میں
زمانے بھر کی دولت ان کے قبضے میں
وہ دن جب یاد آتے ہیں
کلیجہ منہ کو آتا ہے
مجھے توڑا ــــ مروڑا
ادھر لکھے صفحات
خود اپنے گناہوں کی سیاہی سے
اور اپنے عدل اور انصاف کے
بجوا دیے ڈنکے
جہاں انگریز نے نفرت اُگائی
اور لڑایا بھائی بھائی کو
انھیں بے بس غلام اقوام میں شامل تھا ہندوستاں بھی
افسوس تو یہ ہے
فرنگی نے یہاں کے چپے چپے پر
ہوا دی خانہ جنگی کو
پھر آیا بن کے ثالث
اور مالک بن گیا آخر
کھلیں آنکھیں غلاموں کی
تو پانی سر سے اونچا تھا
ہزاروں سال کی پونجی،
جسے صدیوں لگا رکھا تھا سینے سے
وہ سب کچھ قبضۂ اغیار میں پہنچا

وقت :- مجھے بھی یاد ہے وہ دن
بالآخر آنکھ کھولی بھوک کی ماری ہوئی مظلوم جنتا نے
لیا سر ہتھیلی پر رکھے نکلے
اُٹھے میرٹھ سے، دلی سے
چلے جھانسی سے، کلکتہ سے
اور ہندوستاں کے گوشے گوشے سے
اُٹھایا پرچم آزادیٔ قوم و وطن شاہ ظفر نے
جس کے پیچھے ایک عالم تھا
مگر کچھ سانپ تھے انگریز کے پالے ہوئے
اہلِ وطن کی آستینوں میں
وہ اب غدار بن کر سامنے آئے
ڈسا اپنوں ہی کو ــــ پھر یوں ہوا
جامِ شہادت پی کے آخر سو گئے کتنے ہی دیوانے
وطن کی شمعِ آزادی پہ آخر جل بجھے کتنے ہی پروانے
سرایہ ہوئے آزادیٔ ہندوستاں کے سورما لاکھوں

تاریخ :- مرے صفحات پر یہ خون کے حرفوں سے لکھا ہے
اٹھارہ سو ستاون میں نئی تحریک آزادی کی ابھری تھی

غزل

جس کو دنیا کی حقیقت کا پتہ ہوتا ہے
اس کے جینے کا سلیقہ ہی جُدا ہوتا ہے

تیری بخشش ہے کہ جو کہتا ہوں ہوتا ہے وہی
تو نہ چاہے تو مرے کہنے سے کیا ہوتا ہے

جانے کیوں تجھ سے بچھڑ کر یہ ہوا ہے محسوس
جیسے قطرہ کوئی ساگر سے جُدا ہوتا ہے

ہے میرا حال ابھی نظرِ کرم کا محتاج
اک نظر دیکھیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

میں تو ہر حال میں راضی بہ رضا رہتا ہوں
جو بھی ہوتا ہے مرے حق میں بجا ہوتا ہے

تھام لیتی ہے جسے رحمتِ خالق بیدلؔ
ایک مجبور کا وہ دستِ دُعا ہوتا ہے

بیدل سرحدی
محکمۂ اکاؤنٹ، گوداوری اپارٹمنٹ سینٹر، نوئیڈا (یو.پی)

ہوئی ناکام
اور طوقِ غلامی پڑ گیا گردن میں ہندوستان کی
بے بس ہوا انساں
مظالم اس قدر توڑے فرنگی نے
کہ زخمی آتما ہندوستان کی روئی بدبختی پہ اپنی
خون کے آنسو
بہت ہی دُکھ بھرے صفحات ہیں
اب ان کو پڑھنے کی نہیں ہمت
وقت :۔ مگر میں آدمی کے ساتھ چلتا ہوں
میں اس کا ہم قدم ہوں
اس کی منزل میری منزل ہے
غلامی کا وہ دور آیا'
زمیں بدلی، فلک بدلا
زمانے کا چلن بدلا
تاریخ :۔ مرے سینے پہ اک اک حرف لکھا ہے
فرنگی نے کیا کس طرح سے تقسیم بھاشا اور زبانوں کو
وہ آنکھیں چھین لیں جن سے وطن کی ایکتا کو دیکھ سکتے تھے
پھر ایسی عینکیں بانٹیں
کہ جن سے رنگ، مذہب، نسل، قومیت
غرض تفریق کے منظر نظر آئیں
مرے اوراق سے نوچی گئیں انسانیت کی ساری تصویریں
کہ جن میں ہندو و مسلم گلے ملتے تھے آپس میں
اشوک و اکبر و ٹیپو کی عظمت کو مٹا دینے کی کوشش کی
وہ نانک ہوں کہ ہوں چشتی
کبیرا ہوں کہ ہوں خسرو
سبھی کے نام کی حرمت مٹا دینے کی کوشش کی
وقت :۔ مجھے ہے یاد
وہ دن رات چھینے
جن میں سب مل کر دوالی، ہولی اور عیدیں مناتے تھے
غرض افرنگیوں کا یہ کرشمہ تھا
کہ جو شیر و شکر تھے کل
ہوئے اب خون کے پیاسے
انھیں انسان سے حیواں بنا ڈالا
انگوٹھے کاٹ ڈالے دستکاروں کے
کلا کو مار ڈالا ___ کارخانوں سے
وہ ہندوستان کے کھیتوں کی چاندی لے گئے لندن
وہاں کایا بدل کر اس طرح وہ مال بخشا
جیسے کوئی بھیک دیتا ہے
دیا کپڑا لیا سونا
تاریخ :۔ میں ہوں تاریخ، میں ہوں رازداں انسان کے دل کی
غلامی کے شکنجے سے نکلنے کے لئے ہر شخص تھا کوشاں
مگر قانون کی زنجیر میں ایسا جکڑ رکھا تھا لوگوں کو
کہ جو اک لفظ بولے
گولیاں کھائے
مگر ہے تجربہ میرا
کہ آزادی کا جذبہ جب دبایا جائے قوت سے
بھڑکتا ہے وہ اک دن پوری شدت سے
کسی نے سچ کہا ہے یہ'
غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں، نہ شمشیریں
جو ہو ذوقِ عمل پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
ہوا ذوقِ عمل پیدا تو منظر ملک کا بدلا
نیا سورج نکلنے کے ہوئے آثار کچھ پیدا
تاریخ :۔ مرے اوراق پر لکھا ہے
بیداری جو ہندوستان میں آئی
مظالم بڑھ گئے کچھ اور انگریزی حکومت کے
بھیانک آندھیاں چلنے لگیں گلشن جلانے کو
وطن کے پاسبانوں نے بچایا آشیانے کو
وہ دادا بھائی نوروجی
تلک اور گوکھلے، گاندھی
بھگت سنگھ، بوس، آزاد و جواہر لال
مولانا حسین احمد
سبھی مشفق وطن کے تھے
سبھی محسن وطن کے تھے
بڑھے جب سامراجی بھیڑیے آگے
وطن کے شیر دل ٹکرا گئے طوفانِ باطل سے
کوئی اشفاق تھا، بسمل کوئی، آزاد تھا کوئی
سبھی کو سرفروشی کی تمنا تھی
سبھی کے دل سے یہ آواز آتی تھی
سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
وقت :۔ نہ تھا یہ صرف اک نغمہ ___ صدا ہندوستاں کی تھی
بدیسی حاکموں کا دل دہل جاتا تھا یہ سن کر
اُدھر تھا انتقامی جوش، اِدھر تھا جوشِ آزادی
بدیسی حکمرانوں نے
کسی کو جیل میں ڈالا، کسی کو دار پر کھینچا
کبھی جلیانوالہ باغ میں وہ خوں بہایا
کانپ اٹھی دھرتی
تاریخ :۔ اسی مٹی سے لیکن فصل ابھری سورماؤں کی
غلامی کے بھنور میں تھی وطن کی ناؤ
لیکن کیا کمی تھی ناخداؤں کی
ودیشی مکر نے اک قوم کو بخشے کئی جھنڈے
پھر ان جھنڈوں کو آپس میں لڑایا
خوں بہایا بے گناہوں کا
پلایا زہر انھیں فرقہ پرستی کا
وقت :۔ مگر جب درد بڑھ جاتا ہے حد سے
خود دوا بن جائے ہے اپنی
غلامی کی چبھن ہر شخص کے سینے میں تھی اتنی
کہ سب اک رات جاگے
اور نہ تھا اب فرق مشرق اور مغرب میں
نہ اُتر اور دکھن میں
نہ مسلم اور ہندو میں
نہ سکھ میں اور عیسائی میں
تاریخ :۔ سبھی نے لی شپتھ ___ اور اک زباں ہو کر کہا سب نے
" ودیشی حکمرانو ! چھوڑ دو ہندوستاں فوراً "
یہ وہ آواز تھی جو باپو کے ہونٹوں سے
بنی آواز بھارت کی
ودیشی حکمرانو ! چھوڑ دو ہندوستاں فوراً
وقت :۔ صدا گونجی ہمالہ کی
ودیشی حکمرانو ! چھوڑ دو ہندوستاں فوراً

کہا گنگا کی لہروں نے
ودیشی حکمرانو ! چھوڑ دو ہندوستاں فوراً
کہا جمنا کی موجوں نے
ودیشی حکمرانو ! چھوڑ دو ہندوستاں فوراً
کہا بنگال کی کھاڑی نے ___ اور بحرِ عرب نے، ہند ساگر نے
ودیشی حکمرانو ! چھوڑ دو ہندوستاں فوراً
تاریخ :۔ ودیشی حکمراں گھبرا گئے ___ سوچا'
کہ پھر تاریخ نے دوہرایا خود کو'
اور اٹھارہ سو ستاون لوٹ آیا ہے
مگر بس فرق تھا اتنا
کہ جب تلوار تھی دونوں کے ہاتھوں میں
لڑائی دو بدو تھی'
آج لیکن سن بیالیس آٹھ اگست کی رات کو
اک فیصلہ سب نے کیا تھا، اور باپو نے کہا تھا
دھیمے لہجے میں
"بدیسی حکمرانو! چھوڑ دو ہندوستاں فوراً
وقت :۔ اہنسا کی صدا ہنسا پہ غالب آ گئی اتنی'
ودیشی تلملا اٹھا'
لئے اک ہاتھ میں فولاد اور اک ہاتھ میں بارود'
جھپٹا وہ نہتوں پر
بھریں جیلیں
چلائیں گولیاں اتنی
بہا دیں خون کی ندیاں
مگر ہر خون کے قطرے سے اک آواز آتی تھی'
" ودیسی حکمرانو ! چھوڑ دو ہندوستاں فوراً
تاریخ :۔ نہتوں پہ مظالم !!
توبہ توبہ ___ مچ گئی ہلچل
زمانے نے کہا'
آزادیوں کا دور آیا ہے
ہے آزادی کا حق ہر قوم کو'
آخر غلام ہندوستاں کیوں ہو ؟
یہ "کیوں ؟" اک گونج بن کر چھائی ایوانِ سیاست میں
بدیسی حکمراں پھر چھٹپٹائے'
اور پلٹ کے جال پھیلائے
لڑایا ہندوؤں کو اور مسلمانوں کو آپس میں
کہانی دکھ بھری ہے یہ :
کلیجہ منہ کو آتا ہے
غرض ہندوستاں کا چیر کر سینہ
بھرت کی آتما کے کر دیے ٹکڑے
ملی آزادی بیشک
خون میں لتھڑی ہوئی لیکن
مگر آزادی ___ آزادی تھی ___ صدیوں بعد آئی تھی
خوشی سے جھومتا تھا، اس کا استقبال کرتا تھا
اندھیری رات میں نکلا تھا سورج بعد صدیوں کے
ترنگا لال قلعہ پہ جو لہرایا'
تو ناچ اٹھی خوشی سے روح بھارت کی
وقت : اُٹھائی میں نے جس دم لاش گلشن سے غلامی کی
نحوست کے نشاں باقی تھے کتنے صحنِ گلشن میں
گلوں کے زرد چہرے تھے'
لبوں پہ پیاس کے پہرے
خبر ان کو نہ تھی ہے کون اپنا، کون بیگانہ
ہزاروں سانپ تھے جو پل رہے تھے آستینوں میں
ودیسی حکمراں "تحفے" میں جن کو چھوڑ بھاگے تھے
بہت سے سانپ زندہ ہیں ابھی جو پھن اُٹھاتے ہیں
کبھی فرقہ پرستی بن کے آتے ہیں'
لڑا دیتے ہیں وہ بھائی سے بھائی کو
زبانوں اور علاقوں کے وہ قضیے چھیڑ دیتے ہیں
مذاہب کو بدل دیتے ہیں نفرت کی عبارت میں
تاریخ :۔ میں ہوں تاریخ'
میں نے بارہا دیکھا
غلام اقوام جب آزاد ہوتی ہیں
تو کچھ دن کے لئے پہچان اپنی بھول جاتی ہیں
سمجھتی ہیں وہ اپنے آپ کو آہستہ آہستہ
ترقی کی طرف بڑھتی تو ہیں'
آہستہ آہستہ
یہی ہندوستاں کا حال ہے
دشواریوں اور مشکلوں سے کھیلتا'
بڑھتا ہی جاتا ہے مگر آہستہ آہستہ
یہ کیا کم ہے کہ ہے اس کا الگ جھنڈا
جو ہے اقوامِ عالم میں بہت اونچا
اسے ماضی کے ورثے سے محبت ہے'
اجاگر کر رہا ہے اپنی عظمت کو ___ مگر آہستہ آہستہ
- وہ اب جمہوریت اور سیکولر قدروں پہ نازاں ہے
اُسے آ جائیں گے جینے کے ڈھنگ آہستہ آہستہ

سنگ اُٹھایا تھا کہ

م.ک.مہتاب

A-1/78 پشچم وہار، نئی دہلی

بات تو اتنی سی تھی لیکن طول پکڑ گئی تھی۔ گلی کے بچوں کو بُلانا یا انھیں اسکول کے کام میں مدد دینا ان سے کھُل کر باتیں کرنا یا ان کے ساتھ گھومنے چلے جانا کوئی جُرم نہیں لیکن اس بات نے جو نوعیت اختیار کر لی تھی یا نازک موڑ لے لیا تھا اُس کی ایک عورت سے عام طور پر توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ عورت بھی ایسی جو زندگی کی چالیس سے زیادہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص کا اندازِ فکر اور جینے کا اسلوب الگ الگ ہوتا ہے۔ کئی لوگ پیدائشی بوڑھے ہوتے ہیں۔ ہر بات کو بزرگانہ زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں اور کئی لوگ بوڑھے ہو کر بھی جوان رہنا چاہتے ہیں۔ ماہ و سال کو پیچھے کی جانب جھٹک دیتے ہیں جوان رہنا چاہتے ہیں۔ نوخیز لڑکے لڑکیوں کی صحبت پسند کرتے ہیں۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ تبدیل نہیں کرتے اور لباس کی وضع قطع یا گیسوؤں کی تراش خراش میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے۔

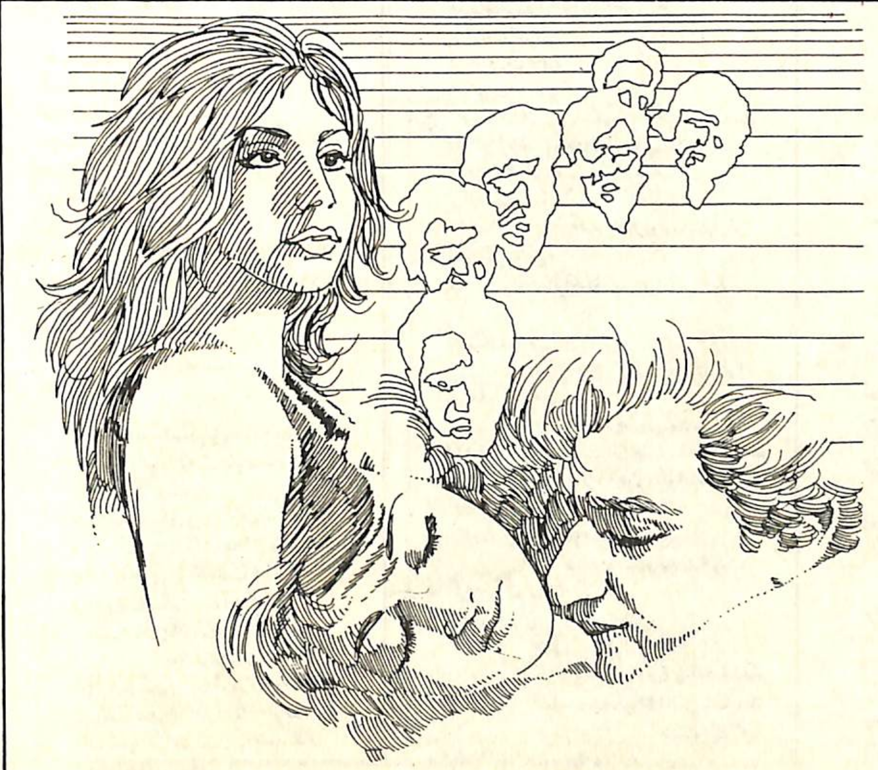
اور شالنی بھی زندگی کے چار دہے پار کر جانے کے بعد بھی ڈھلتی عمر کی نہیں بلکہ چڑھتی عمر کی خاتون دکھائی دیتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ زندہ رہنے کا یہ سلیقہ اس نے مغربی ممالک سے سیکھا تھا جہاں وہ اپنے شوہر کی ملازمت کے سلسلے میں آٹھ دس برس گزار چکی تھی مغربی طرزِ زندگی اور رجحان طبع اختیار کرنا کوئی عیب بھی نہیں۔ اگر وہ اپنی نوک پلک سنوارے رکھتی تھی نوجوان لڑکے لڑکیوں میں اٹھتی بیٹھتی تھی، اور اپنے کو تیس برس سے زیادہ عمر کی کہنے میں عار محسوس کرتی تھی تو یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا جس پر کسی کو انگشت نمائی کا حق حاصل نہیں تھا۔ اگر اس کے دو نوخیز بچے بھی تھے تو بھی کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں تھا کہ اُسے ایسے شوخ و شنگ لباس زیب تن نہیں کرنے چاہئیں یا کُھلے گیسوؤں کو جھٹک جھٹک کر گلی میں سے نہیں گزرنا چاہیئے۔ آپ قدامت پرست ہیں تو شوق سے رہیئے لیکن آزاد فضا میں اڑنے والی چڑیا کے پَر آپ کیوں کترنا چاہتے ہیں۔

یہاں تک تو بات قابلِ برداشت تھی لیکن محلّے کی عدالت میں درخواست دینے کے اس سے زائد الزامات کو آنکھیں بند کر کے رَد نہیں کیا جاسکتا تھا اور الزامات کی سنگینی کے پیشِ نظر میں بھی ان کا ہمنوا تھا۔ اگر ان دونوں امیر گھرانوں کے جوان ہو رہے لڑکے امتحان کے مسائل، کالج میں داخلے، کسی تربیتی نصاب کی تعلیم یا سیر تفریح کے لیے شالنی (جسے وہ شالو بھابھی کہتے تھے) کے پاس آتے جاتے تھے تو اس میں شالو کا زیادہ قصور نہیں تھا لیکن یہ الزام قابلِ غور ضرور تھا کہ لالی اور چنٹو شالو کے بہت قریب آچکے تھے۔ انھیں گھر سے زیادہ شالنی کے کمرے پسند تھے اور ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ مغربی موسیقی کے ریکارڈوں پر شالنی کے ساتھ رقص بھی کرتے تھے۔ وہ انھیں ساتھ لیے گھومتی بھی تھی اور چنٹو جس کے پاس کار بھی تھی شالو بھابھی کو انگریزی فلمیں دکھانے بھی لے جاتا تھا۔ کچی عمر کے بہکے ہوئے یہ لڑکے شالنی کے ساتھ اونچے ہوٹلوں اور ریستوراں میں بھی جاتے تھے اور اس بے شرم عورت نے انھیں ایسی لذت سے آشنا کر دیا تھا کہ وہ گھر کی ہر زنجیر توڑ کر اس کے پاس پہنچ جاتے تھے۔

لیکن اصل فساد کی بنیاد اس دن پڑی جب لالی کی تائی نے شالو کے گھر جا کر جو منہ میں آیا بک دیا تھا۔ شالو نے اپنی بے عزتی کی یہ کہانی چنٹو کو سنائی اور چنٹو نے لالی کو۔ لالی اپنی شالو بھابھی کی یہ بے ادبی برداشت نہیں کر سکا اور اس نے اپنی والدہ کو پیٹ ڈالا اور جب چنٹو کے والد اور والدہ نے شالو کے گھر جا کر اُسے اور اس کے شوہر کو گولی سے اُڑا دینے کی دھمکی دی تو شالو نے گھبرا کر یا ذلت کے احساس سے رات کو نیند کی بہت سی گولیاں نگل لیں۔ جب لالی کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے اپنی والدہ کو سبق سکھانے کے لیے اس کے سامنے کیڑے مار دوائی کی پوری شیشی حلق میں انڈیل لی۔

اس طرح انگشت نمائی اور بہتان تراشی سے خوفزدہ دو انسان نرسنگ ہوم پہنچ گئے۔ شالو دو دن میں گھر لوٹ آئی لیکن لالی ابھی خطرے سے باہر نہیں تھا جس نے اس کے اکلوتے بچے کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

بات کانوں کان بہت سے لوگوں تک جا پہنچی تھی۔ لالی کے گھر کے لوگ شالو کے افرادِ کنبہ کے اخلاق اور کردار کی دھجیاں بکھیر رہے تھے اور کسی کے لیے بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ اس مچھلی نے جل گندہ کر دیا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس



نتیجے پر پہنچا تھا کہ ایسی عورت کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس عمر کی خانہ دار عورت سے کوئی شخص ایسی پستی کی توقع ہی نہیں کر سکتا تھا لیکن جو کچھ ہوا تھا وہ سب کے سامنے تھا مردوں سے زیادہ غصّہ عورتوں میں تھا جو اُسی عورت کو عورت سمجھتی ہیں جو سیتا اور ساوتری کی مانند پاکدامن ہو... وہ شالو کو ایسی صلواتیں سنا رہی تھیں کہ کانوں میں انگلیاں دینے کو جی چاہتا تھا "یہ عورت نہیں جونک ہے جس نے پڑوسیوں کے بچّے چوس لیے ہیں۔ ایسی بدکردار کے لیے محلّے میں جگہ کہاں ہوسکتی ہے۔"

محلّے کے شرفا کی عدالت نے ملزم کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ہی یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اس کنبے کو آج ہی یہ مکان چھوڑ دینا چاہیے۔ ورنہ یہ آگ کئی اور گھروں تک بھی پھیل سکتی ہے۔

ہاں کچھ لوگ اس رائے کے بھی تھے کہ یک طرفہ فیصلہ غلط ہوگا وہ لوگ بھی مکان دار ہیں۔ مکان چھوٹا سہی لیکن کسی مالک مکان کو کان سے پکڑ کر باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ ایک محل نما کوٹھی کے شاندار ڈرائنگ رُوم میں دو امیروں کے لگائے الزامات کی فہرست پر ایک غریب یا متوسط کنبے کو بیدخل کرنے کا حکم کیسے جاری ہو سکتا ہے۔ ان کے خلاف سماجی پابندیاں کیسے عائد کی جا سکتی ہیں۔ کیا قصور صرف آگ کا ہے۔ اس پر ہاتھ تاپنے والے کیسے بری الذمہ ہو سکتے ہیں؟ ہم اندھے نہیں ہیں اپنی اولاد کو الہڑ عمر میں لٹتا نہیں دیکھ سکتے اور ان خطوط کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو لڑکوں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یا جن سے کہا جاتا ہے کہ "بھابھی عمر کا فرق محبت کی راہ میں دیوار نہیں بن سکتا" تو کیا ان پر یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ انھوں نے گناہ کی رسّی کیوں دراز کر رکھی ہے۔ اگر ایک امیر آدمی مکان چھوڑ کر نہیں جا سکتا تو غریب آدمی کو مکان چھوڑ دینے کے لیے کیوں مجبور کیا جائے؟ اور حاضرین میں سے ایک آواز یہ بھی سنائی دی کہ:

"اُس عورت کا بیان سُنے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جانا چاہیے۔"

اتنے میں کمرے کے دروازے سے باہر کسی کو زوردار تھپّڑ لگنے کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو کچھ محلّے دار عورتیں اور مرد شالنی کو پکڑ کر کمرے میں لیے آ رہے تھے اور کمرے سے باہر کھڑی خواتین نے اُس پر تھپّڑوں، گھونسوں اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

زرد رو شالنی اپنے شوہر کے ساتھ جو اس پوری بحث میں خاموش بیٹھا تھا کرسی پر بیٹھی بے تحاشا روئے جا رہی تھی اس کا شوہر شالنی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی کو خواہ مخواہ بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بات کا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے۔ یہ غریب چار دن سے پریشان ہے کچھ کھایا نہیں، فاقے سے غش کھا رہی ہے۔

خود شالو کہہ رہی تھی کہ وہ کبھی کسی کے گھر نہیں گئی دوسرے بچّوں کو بھی اپنے بچّوں کی طرح پیار کرتی ہے۔ اگر کسی نے اسے خط لکھا بھی تو اس نے محض تفریح کے لیے جواب بھی دے دیا اور یہ لوگ اتنی سی بات کو لے اڑے ہیں اور مجھے محلّے بھر میں کسبی، گشتی اور نہ جانے کیا کیا نام دے کر اتنا بدنام کیا ہے کہ میں نے گولیاں کھا کر مرنے کی ٹھان لی تھی۔

لیکن یہ اجلاس بلانے والے اس کی ہر بات کا مذاق اڑا رہے تھے اور چیخ چیخ کر شالو اور اس کے شوہر کو دھمکا رہے تھے۔ اس لیے نقارخانے میں صرف اُن کی آواز ہی سُنی جا رہی تھی اور مطالبہ صرف یہی تھا کہ ان لوگوں سے کہا جائے کہ وہ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ ہمارے بچّے کی جان جائے تو اس کا کون ذمّہ دار ہوگا؟

ایک بزرگ کی رائے تھی کہ جب شالنی اور اس کا شوہر ان الزامات کو بے بنیاد اور بہتان بیان کر رہے ہیں تو بہتر یہی ہوگا کہ سب کی رائے الگ الگ لے لی جائے لیکن پرچی پر ہاں یا نہیں لکھنے والے ذرا اپنی پاکدامنی کو بھی مدِّنظر رکھیں۔

میں محلّے میں اس چھوت کو پھیلنے دینے کے حق میں نہیں تھا۔ اس کنبے کی شرافت کے بارے میں میرے تصوّرات کا آئینہ چُور چُور ہو گیا تھا۔ یہ آگ میرے گھر تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ کئی بار یہ لوگ میرے بہت قریب آ جاتے ہیں اور میں یہ سوچ کر خوفزدہ ہو گیا کہ اگر یہ عورت فی الواقع ویسی ہی ہے جیسی کہ بیان کی جا رہی ہے تو کل لوگ میرے کردار پر بھی چھینٹے اُڑا سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کسی رعایت کی مستحق نہیں ہے۔

اتنے میں صاحبِ خانہ نے سب کے سامنے خالی پرچیاں رکھ دیں جن پر لکھنا تھا کہ نکالا جائے یا نہیں۔ ہاں یا نہیں کا فیصلہ کرنے سے قبل اس بزرگ کے قول کو بھی سامنے رکھنا تھا کہ آپ کتنے پاکدامن ہیں؟

میں تو ایک لحاظ سے پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ قلم ہاتھ میں لیے شالو کے حسین چہرے اور اس کے گرد پریشان گیسوؤں کے جالے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ چہرہ جو زرد چاند کی مانند تھا جس پر کیچڑ تھوپا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار بہہ رہا تھا اور ہونٹ یوں کپکپا رہے تھے گویا شیر کے شکار کے لیے کوئی کٹڑہ درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ اُسے دیکھتے ہوئے مجھے کئی برس پہلے گرمیوں کی ایک دوپہر یاد آ رہی تھی جب میری ایک ہمسایہ لڑکی ش مجھ سے ملنے آئی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی کلاس کے طالب علم تھے اگرچہ ہمارے کالج مختلف تھے وہ انگریزی میں بہت اچھی تھی اور میں ریاضی میں ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ وہ اپنے مسائل لے کر میرے پاس آ جاتی تھی اور میں اس کے ہاں جا کر اُس کی نوٹ بکیں لے آتا تھا دو نوخیز کنوارے ذہن جنھیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں لطف آتا تھا جنھیں ایک دوسرے کے جسم سے اٹھتی حرارت کی لہریں بہت اچھی لگتی تھیں جنھیں ایک دوسرے کے پسینے کی بھاپ کی خوشبو مرغوب تھی۔ لیکن جنھوں نے ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کرنے یا انگریزی ادب کی کتابیں لینے دینے سے آگے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔

"کیا زردہ کھاؤ گے۔ آج ہمارے یہاں پکا ہے۔" ش نے اپنی لمبی چوٹی اپنی اُنگلی کے گرد گھماتے ہوئے پوچھا۔ اس کا چہرہ دھوپ کی تپش سے عنابی ہو رہا تھا۔

"لائی ہو۔"

"اوں ہوں۔ ہمارے ہاں چل کے کھانا ہوگا۔"

میں ش کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ رکابی میں زردہ بھر لائی۔ تپتی دوپہر۔ ہُو کا عالم۔ لُو سے بچنے کے لیے اس نے کواڑ بند کر دیا۔ زردہ جس پر بادام کی سفید گریاں چھڑکی ہوئی تھیں۔ اور جس میں جا بجا کشمش کے گول گول دانے اور بھی لذیذ ہو گئے تھے۔

ش میرے اتنا قریب کھڑی تھی کہ میں زردے سے بھی زیادہ اس کے جسم کی خوشبو سے آشنا ہو رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس تپتی دوپہر میں اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ میں اٹھا تو اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ میں نے بھی اپنے جلتے ہوئے لب ایک لمحے کے لیے اس کی گردن پر رکھ دیئے اور مجھے یوں لگا گویا کشمش کا ایک گول دانہ میرے ہونٹوں میں آ گیا ہو۔

میں بڑی اضطرابی کیفیت میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا اس میں میرا قطعاً کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن مجھے کشمش کے اس دانے کا لطف تو ضرور آیا تھا۔

قلم ہاتھ میں پکڑے پکڑے مجھے یوں محسوس ہوا گویا کشمش کا وہ گول دانہ پھر میرے ہونٹوں میں آ گیا ہو۔

اور میں نے سامنے رکھی پرچی پر لکھ دیا۔

"نہیں۔"

غزل پیرا

کدھر صیاد ہے کس سمت گلچیں یہ خبر رکھیے
پھر ان کی دسترس سے دُور اپنے بال و پر رکھیے

گزر جائے گی شامِ غم چلی جائے گی تاریکی
سحر آئے گی اک دن آپ امیدِ سحر رکھیے

لکھی ہے ہر ورق پر داستاں میری تباہی کی
بکھر جائیں نہ یہ اوراق بھی ان پر نظر رکھیے

نگاہِ برق سے ٹکرائیں گے یہ خار و خس اک دن
بنائے آشیاں رکھیے تو اتنا سوچ کر رکھیے

جہاں کوئی نہ ہو اُس موڑ پر بھی وہ نظر آئیں
نگارِ آرزو کو اس قدر تو معتبر رکھیے

جسارت ہو تو شاہد کوچۂ قاتل میں خود جا کر
کسی تلوار پر سینہ کسی نیزے پہ سر رکھیے

شاہد بھوپالی
انچارج ریڈنگ رُوم، بال وہار، بھوپال

ہمارے جیسا کسی کا تو ہمسفر بھی نہیں
ہمارے ساتھ چلا اور ہمیں خبر بھی نہیں

ہماری سمت سے سورج کا اب گزر بھی نہیں
ہم ایسی شام ہیں جس کی کوئی سحر بھی نہیں

گھروں میں بیٹھ کے سنتے ہیں عالمی خبریں
جنھیں پڑوس کی اپنے کوئی خبر بھی نہیں

عجیب دور ہے اس دور کا خدا حافظ
کسی کے ساتھ کسی کا گزر بسر بھی نہیں

ہمارے سر پہ مسافت سوار ہے لیکن
ہمارے پاؤں میں اب کوئی رہ گزر بھی نہیں

بھروسہ کس پہ کیا جائے اے اسد رضوی
کوئی امیں بھی نہیں کوئی معتبر بھی نہیں

اسد رضوی
اسٹوڈیو رائل، بنارس بینک چوک، چندوارہ، منظفر پور (بہار)

دو تصویریں

دلیپ سنگھ

59/4 اولڈ راجندر نگر، نئی دہلی۔

ہیں آزادی کی قدر و قیمت صرف وہی جان سکتا ہے جس نے غلامی کی اذیتیں اُٹھائی ہوں۔ میں اپنا شمار اُن لوگوں میں تو نہیں کر سکتا جنھوں نے غلامی کے دُکھ جھیلے ہیں کیونکہ میں جنگِ آزادی کی آخری دہائی میں عمر کی اس منزل پر تھا جب اپنے گرد و پیش کا صحیح احساس نہیں ہوتا۔ اُن دنوں میری دُنیا نہایت مختصر تھی۔ ماں کی گود باپ کی محبت اور ننھے دوستوں کے ساتھ گلیوں میں کھیل کود۔ لیکن میری عمر اتنی کم بھی نہ تھی کہ مجھے اپنے اردگرد کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اور پھر عمر کی اس منزل کے نقوش تو بہت گہرے ہوتے ہیں۔

آزادی کی جنگ کے کچھ منظر تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور کچھ واقعات اپنے بزرگوں سے سُنے جو خود اس جنگ میں شریک تھے۔ اب جب آزادی کے پینتالیس سال بعد میں اُن مناظر اور ان واقعات کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں دو نہایت واضح تصویریں اُبھرتی ہیں۔

چونکہ میرا جنم پنجاب کے ایک دُور افتادہ گاؤں میں ہوا اور ملک کی تقسیم تک میری دوڑ دھوپ اپنے ضلع کے باہر نہیں تھی اس لئے جو تصویریں میرے ذہن پر نقش ہیں وہ پنجاب کی ہی ہیں۔ اتنا تب بھی مجھے احساس تھا کہ پورے ملک میں آزادی کی جدوجہد جاری ہے لیکن ذاتی تجربہ میرا اس علاقے تک محدود تھا جس میں میں پل رہا تھا۔

ذہن پر نقش تصاویر میں دو تصویریں ایسی ہیں جو میں زندگی بھر بھول نہیں پاؤں گا۔

ایک تصویر تو ان دو میں سے ایسی ہے جسے دیکھ کر شاید میرے قارئین کو یقین نہ آئے کہ یہ اصلی ہے۔ وہ شاید سمجھیں گے کہ یہ کوئی کیمرہ ٹرک ہے یا پھر میں نے اِدھر اُدھر سے تصاویر اکھٹی کیں اور اُنھیں جوڑ کر ایک تصویر بنالی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک سچّی تصویر ہے اور اس میں کوئی کیمرہ ٹرک نہیں۔ ویسے بھی جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں تب کیمرہ ٹرک تو کیا کیمرے بھی بہت کم دستیاب تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اتنا بڑا کہ دنیا اسے ایک ملک کے بجائے ایک برِّاعظم تصور کرتی ہے۔ اس ملک میں ان گنت بولیاں بولی جاتی ہیں۔ کئی مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور پھر ایک ایک مذہب میں اتنے فرقے ہیں کہ اُن کو گننا مشکل ہو جائے۔ یہ فرقے آج بھی ہیں اور تب بھی تھے جب جنگِ آزادی لڑی جارہی تھی پر پتہ نہیں آزادی کی جنگ میں کیسا نشہ تھا کہ اتنے فرقوں میں بٹے لوگ اپنے آپ ایک ہی لڑی میں پروئے گئے۔

جنگِ آزادی کے ایک خونی باب جلیانوالہ باغ کا ذکر آئے تو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ستیہ پال کا نام ایک ساتھ لیا جاتا ہے۔ شہید بھگت سنگھ کی قربانی کو جب یاد کیا جاتا ہے تو راج گرو اور سکھدیو کے ناموں کے بغیر یوں لگتا ہے جیسے ہم ان کا پورا نام نہیں لے رہے۔ غدار پارٹی کے لیڈروں میں بابا گرمکھ سنگھ، کرتار سنگھ سرابا اور موہن سنگھ بھکنا اتنے ہی معتبر نام ہیں جتنا معتبر نام رحمت علی شاہ کا ہے۔

"اُردو کے اشعار اِن دنوں لوگوں کو فوراً یاد ہو جاتے تھے کیوں کہ پورے ملک میں اُردو نے رابطے کی زبان کا درجہ پالیا تھا لیکن جن نظموں سے اُن دنوں میں متاثر ہوا وہ پنجابی نظمیں تھیں۔ ایک شعر جو اُن دنوں اکثر ہم سُنتے تھے وہ پنجاب کے مقبول کوی شاہ محمد کا تھا۔"

لیڈروں کو تو چھوڑیئے کہ یہ مدبّر لوگ ہم سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے ہیں لیکن ہم جیسے معمولی لوگ بھی ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمارے اسکول کے ہوسٹل میں دو کچن تھے۔ ایک ہندو سکھ بچّوں کے لئے اور دوسرا مسلمانوں کے لئے۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کھانا ایک ہی جگہ پکتا تھا چاہے اُس کچن میں چاہے اِس کچن میں۔ آزاد ہند فوج کے ہیرو سہگل، ڈھلوں اور شاہ نواز نہ صرف میرے ہیرو تھے بلکہ میرے دوست محمد انور بھٹی کے بھی ہیرو تھے۔

میرے ذہن میں جب یہ تصویر اُبھرتی ہے تو مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ آزادی کے پینتالیس سالوں میں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے یہ کیسے ہو گیا کہ مختلف فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کا خون پینے کے خواہش مند ہو گئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بہتر تعلیم سیاسی آزادی اور جمہوری نظام ہمیں راس نہیں آئے۔

جنگ آزادی کے زمانے کی دوسری تصویر جو میرے ذہن پر نقش ہے وہ ہے شاعری کی طاقت۔ سُنا تو ہم نے بہت ہے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے لیکن بس سُنا ہی ہے دیکھا نہیں۔ میرے دوست فکر تونسوی مذاقاً کہا کرتے تھے کہ زندگی میں بہت لکھا ہے لیکن اپنے لکھے پر کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا۔ ہم نے البتہ جنگِ آزادی کے دنوں میں لوگوں کو شاعری پر عمل کرتے دیکھا ہے۔ عام لوگوں کا ذکر تو چھوڑیئے خود انگریز سرکار کو احساس تھا کہ شاعروں کی نظمیں جنگِ آزادی میں تلوار کا کام کر سکتی ہیں اسی لئے انھوں نے بہت سی نظموں کی اشاعت پر پابندی لگادی تھی۔

اُردو میں ایسے بہت سے شاعروں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ جنھوں نے ہندوستانیوں میں انگریزوں کے تئیں نفرت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اُن میں مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر اقبال، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، تلوک چند محروم، اکبر الٰہ آبادی اور محمد علی جوہر کے نام نمایاں ہیں اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار تو ان دنوں ہر شخص کی زباں پر تھے۔

رُلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یا پھر چکبست کی یہ نظم

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سُرمہ اُسے بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد و دُکھ اُٹھائیں گے
یہی پیامِ وفا قوم کو سُنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اور رام پرشاد بسمل کا یہ شعر تو ہر مجاہد کی زبان پر ہوا کرتا

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اس شعر کا استعمال تو میں آج بھی دیکھتا ہوں۔ کئی جلسے جلوسوں میں سُنتا ہوں، ایسے ایسے لیڈروں کے مُنھ سے جنھیں شاید "سرفروشی" کا مطلب بھی معلوم نہیں۔

بسمل کا یہ کلام بھی دیکھئے۔

اُردو کے اشعار اِن دنوں لوگوں کو فوراً یاد ہو جاتے تھے کیونکہ پورے ملک میں اُردو نے رابطے کی زبان کا درجہ پالیا تھا۔ لیکن جن نظموں سے اُن دنوں میں متاثر ہوا وہ پنجابی نظمیں تھیں۔ ایک شعر جو اُن دنوں اکثر سُنتے تھے وہ پنجاب کے مقبول کوی شاہ محمد کا تھا۔

سُکھی رہن ہندو مسلمان دونویں
سِر دو ہاں دے اتے آفات آئی
شاہ محمد اوچ پنجاب دے
جی کوئی نہیں سی تیری ذات آئی

(خدا کرے ہندو مسلمان دونوں سکھی رہیں اور اس آفت سے بچے رہیں جو تیری ذات کی شکل میں ہندوستان میں وارد ہوئی ہے۔)

کرتار سنگھ سرابا جو غدار پارٹی کے لیڈروں میں سے ایک تھا، شاعری بھی کرتا تھا۔ ایک نظم میں وہ آزادی کے پروانوں کو انتباہ دیتا ہے کہ ملک کی خدمت کرنا کوئی آسان کام نہیں اس میں تو کئی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ سرابا لکھتا ہے۔

سیوا دیش دی جندڑیے بڑی اوکھی
گلاں کرنیاں ڈھیر سکھالیاں نیں
سیوا دیش دا جنان لو چاء چڑھیا
اونہاں لکھ مصیبتاں جھالیاں نے

(وطن کی خدمت کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جن لوگوں نے دیش کی خدمت کو اپنا مقدر بنایا ہے اُنھیں لاکھوں مصیبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔)

ایسی نظموں کو سُن کر لوگ وطن کی خدمت سے منہ موڑ لینے کے بجائے اور جوش و خروش کے ساتھ آزادی کی جنگ میں کود پڑتے تھے۔

ویسے تو ایسی بے شمار نظمیں ہیں جنھوں نے جنگِ آزادی کے دلوں میں وطن سے محبت کرنے والوں کے خون کو گرمایا۔ لیکن جو شہرت پنڈت بانکے دیال کے اس گیت کو ملی شاید ہی کسی اور نظم یا گیت کو نصیب ہوئی ہو۔ گیت ہے۔

پگڑی سنبھال جٹا۔ پگڑی سنبھال اوئے
لٹا گیا مال تیرا لٹا گیا مال اوئے

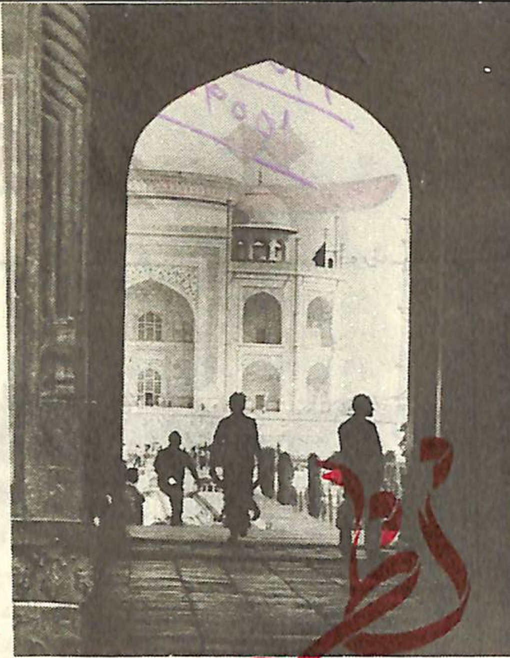
(اے پنجاب کے کسان ہوش میں آ ورنہ دشمن تیرا سب کچھ لوٹ کے لے جائے گا۔)

اس گیت کے خالق پنڈت بانکے دیال کی اپنی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ وہ جھنگ کے رہنے والے تھے اور پولیس میں ملازم تھے ان کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ جلسے جلوسوں میں جاکر سرکار کو ان لیڈروں کی تقریروں کی تفصیل پہنچائیں جو آزادی کے دیوانے سرکار کے خلاف کرتے تھے۔ پنڈت بانکے دیال پر ان تقریروں کا اثر یہ ہوا کہ وہ سرکار کی ملازمت چھوڑ کر خود آزادی کے دیوانوں میں شامل ہو گئے۔ اُن کا یہ گیت شہید بھگت سنگھ کے چاچا سردار اجیت سنگھ جلسوں میں بڑے شوق اور جوش کے ساتھ گایا کرتے تھے۔

ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں کئی "ہتھیار" استعمال کئے گئے۔ ان میں بم بھی تھے اور عدم تشدد بھی۔ بغاوت بھی تھی اور عدم تعاون بھی۔ لیکن اُس وقت کے شعرا کا رول بھی کوئی معمولی نہیں تھا۔

آج جب میں وطن میں مصیبتوں کا طوفان دیکھتا ہوں تو اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ ہمارے ویسے ادیب اور شاعر کہاں گئے جو اپنی تخلیقات سے اہلِ وطن کو ایک نئی راہ دکھا سکنے کی قوت رکھتے تھے۔ کیا اُن کے احساس کے سوتے سوکھ گئے ہیں۔ کیا اب کوئی ایسا شاعر نہیں جو کہہ سکے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں



نظم

ہائے وہ لمحہ میں کس طرح بُھلا پاؤں گی
جب مری کوکھ میں چپکے سے کوئی مہکا تھا
میری دھڑکن میں ہوئی ننھی سی دھڑکن شامل
میرے سپنوں کو جب اک چھوٹا سا آکار مِلا
میرے خوابوں کو نئے حسن کی تعبیر مِلی
اور تعبیر سے وابستہ نئے خواب مِلے

میری سوچیں کبھی گلگشت چمن رہتی تھیں
پھول چُنتیں کبھی کلیاں کبھی رنگوں کے نکھار
ساری خوشبوؤں کو دامن میں سمو لیتی تھیں
روز اُڑتی تھی فضاؤں میں میں تتلی کی طرح
اک نئے نُور کے پنکھوں پہ لیے نقش و نگار
روز جگنو کی طرح شمعیں جلایا کرتی
چاند تاروں سے میں دامن کو سجایا کرتی
میری دُنیا اسی دُنیا میں تھی دُنیا سے الگ

کیسا ہوگا جو میری کوکھ میں رہتا ہے ابھی
بال گھنگرالے ریشم۔ یا کہ سنہری ہوں گے
اس کی پیشانی سے چمکے گا ذہانت کا جمال
شربتی آنکھیں یا نیلی میری جیسی ہوں گی
ناک اُن کی طرح اُونچی یا سبک میری طرح
ہونٹ ہم دونوں میں کس جیسے نظر آئیں گے
اس کی ٹھوڑی میں گڑھا ان کا یا تِل میرا سا
کیسا ہوگا جو نظر آئے گا ہم دونوں سا
جو بھی ہوگا وہ مرے گھر کا اُجالا ہوگا

آخرکار امری گود میں اُترا میرا چاند
میری تقدیر مرے سینے پہ مسکانے لگی
دودھیا نُور کے سوتے مرے سینے سے بہے

اور ان جھرنوں کی دھرتی کا وہ تنہا راجہ
ہر گھڑی اس پہ نظر اس کی ہی باتیں ہر دم
ہر سمے اس کی لگن اس کے خیالوں میں مگن
پھر نئی فکر کہ اب کب کو بڑا ہوگا یہ

کب یہ اسکول کو پڑھنے کے لیے جائے گا
کب میں یہ راہ تکوں گی کہ وہ کب آئے گا
پر بِنا اُس کے وہ دن میرا کٹے گا کیسے؟
وہ بھی دن آگیا اسکول کو وہ جانے لگا
ننھا سا بیگ لیے ہائے وہ کیسا لگتا؟
چھوٹی چھوٹی سی کتابوں نے دشائیں بدلیں

سیڑھیاں چڑھتی وہ کالج کی بلندی پہ گئیں
جب وہ کالج کو چلا جاتا تو لگتا جیسے
گھر کی سب روشنی بھی ساتھ گئی ہو اُس کے
سارا دن میری زباں پر یہ وظیفہ رہتا
میرے اللہ اُسے حفظ و اماں میں رکھنا

اور اک روز مرے شہر کے لوگوں، میرے ہموطنوں نے
کر دیا اس کو بھی بلوے میں ہلاک
سب کو یہ فکر کہ ہندو یا مسلمان مَرا
کس نے پل بھر کو یہ سوچا کہ اک انسان مَرا
کس نے سوچا کہ کسی ماں کی اُجاڑی ہے گود
کس نے سوچا کہ کسی گھر کا اُجالا لُوٹا
کس نے سوچا وہ مرے ملک کا مستقبل تھا
کر دیا قتل جسے آج ہمارا 'کل' تھا

خلیل خاں کشمیری
ٹھوٹھر، رامپور (اُتر پردیش)

تجارت

قاسم خورشید



شہر کے سب سے بڑے تاجر ماتھر صاحب سے کوئی بھی چھوٹا کاروباری بہت قریب رہنا چاہتا تھا لیکن ماتھر صاحب کی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ کوئی بھی ان کے قریب جاکر شاید خود کو زیادہ دیر تک نہیں چھپا سکتا تھا۔ انھیں اپنے لئے بکھرے ہوئے خلوص اور عزت کا پس منظر اچھی طرح معلوم تھا شاید اسی لئے انھوں نے اپنی زندگی کے اس پہلو کو جہاں کسی ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے، بہت سنبھال کر رکھا تھا۔

زندگی نے یوں تو بہت کچھ دیا تھا لیکن ایک گہری خاموشی نہ جانے کس دلدل میں انھیں لئے جا رہی تھی۔

بہت ہی خوبصورت حویلی، آرام و آسائش کا بھرپور نظم ایک آواز پر کئی جھکے ہوئے چہرے۔ لیکن یہ سب ان کے کسی روحانی جذبے کی نشاندہی نہیں کیا کرتے تھے، سب کچھ کاروبار کا ایک حصہ تھا۔

ماتھر صاحب پینتالیس کے ہوئے لیکن اب تک شادی کیوں نہیں کی؛ وہ اس شاندار حویلی میں تنہا کیوں رہتے ہیں۔ جبکہ شہر میں ان کے رشتہ دار بھرے پڑے ہیں۔؟ ان کی ذاتی زندگی سے متعلق سوال کرنے کی کوئی بھی ہمت نہیں کر پاتا تھا، ہاں خوش گپیوں کے لئے یہ سب موضوع بحث ضرور ہوا کرتا کہ شاید انھیں گہری چوٹ لگی ہے۔ ضرور کوئی بھنور میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

میں بھی کئی دنوں سے چاہ رہا تھا کہ ماتھر صاحب سے ملاقات کروں لیکن ان کی شخصیت کے بارعب پہلو سے متعلق جو باتیں سن رکھی تھیں، ان سے میرے بونے قد کا احساس اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ یہ بھی سوچتا کہ ماتھر صاحب اگر نہ بھی مل پائے یا پھر انھوں نے میرے ساتھ بہتر سلوک نہیں بھی کیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟ میری حیثیت میں تو کہیں کوئی تبدیلی نہیں آنے والی۔ شاید یہی سوچ کر میں اپنے گھر سے نکلنا ہی چاہ رہا تھا کہ ٹھیک دروازے سے باہر نکلتے ہی بیوی نے حسب معمول ٹوک دیا۔

"اجی سنتے ہو، یہ تمھاری کیا عادت ہو گئی ہے کہ اب جاتے وقت کہتے بھی نہیں کہ جا رہا ہوں۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے اب جا رہا ہوں، تو جا رہا ہوں، بس....."

"آج سیما کے کالج میں فنکشن ہے اسے لوٹنے میں شام کے چھ بج جائیں گے تم ساتھ لئے آنا....."

میں فرنیچر کی اپنی چھوٹی سی دکان کو بڑا روپ دینے کی کوشش کئی برسوں سے کر رہا تھا جو آج بھی جاری تھی۔ دن بھر کی کڑی محنت کے بعد شام میں سیما کے کالج گیا۔ اسے لیکر ماتھر صاحب کے دفتر پہنچا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ کر شاید اپنی حویلی کی طرف جانے کے لئے تیار تھے، انھیں رخصت کرنے کے لئے کئی لوگ ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

"سر..... مجھے آپ سے ملنا تھا..... ایک دم ذاتی کام تھا سر..... تھوڑا وقت اگر دے سکیں تو......" میں ہمت کر کے ان کے پاس پہونچ گیا۔

"آپ کل دفتر آجائیں۔" ماتھر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہکر ہم دونوں پر مشفقانہ نظر ڈالی۔

"سر..... دفتر کا کام.. نہ..... نہیں تھا سر....." پھر انھوں نے مجھے اپنی کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ میں نے ماتھر صاحب کے دفتر میں ہی اپنا اسکوٹر پارک کیا اور پھر ہم دونوں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"یہ بچی کون ہے؟" انھوں نے منہ ادھر کئے ہی کئے بارعب انداز میں پوچھا۔

"سر.....! یہ..... یہ ہماری بیٹی ہے سیما۔"

پھر کار رینگنے لگی۔ ماتھر صاحب نے پائپ سلگاتے ہوئے چند لمحوں تک میری طرف دیکھا اور پھر باہر کے گزرتے ہوئے مناظر کا جائزہ لینے لگے۔ بات شروع کروں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ماتھر صاحب بول اُٹھے۔

"شری مان جی! آپ نے اپنا پریچے تو دیا ہی نہیں....."

"اوہ..... ہاں سر..... میں ہوں جیتندر پرساد، میرا چھوٹا سا بزنس ہے۔ میں اس شہر میں کئی برسوں سے اسٹرگل کر رہا ہوں۔ فرنیچر کا چھوٹا موٹا کاروبار ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہے تو میں یہ سوچ کر کچھ نروس سا ہونے لگا کہ کہیں وہ ڈرائیور سے گاڑی روک دینے کے لئے نہ کہہ دیں، لیکن انھوں نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد خود ہی سکوت توڑ دیا۔

"کمال ہے..... فرنیچر کے تمام چھوٹے بڑے کاروباری ہمارے پاس آتے رہتے ہیں اور آپ اتنے برس گزر گئے لیکن..."

"انکل......! پاپا آپ کو نہ صرف آئیڈیل مانتے ہیں، بلکہ انھوں نے تو گھر میں آپ کی بڑی سی تصویر بھی لگا رکھی ہے۔" سیما بولنے لگی تو مجھے راحت کا احساس ہوا۔

"ہوں.....! یو آر ویری انٹیلی جنٹ! کہاں پڑھتی ہو.....؟"

"جی سنٹرل کالج میں بی۔ اے فائنل کی اسٹوڈنٹ ہوں....."

"پڑھنے میں بہت تیز ہے سر... گاتی بھی بہت اچھا ہے....."

ماتھر صاحب کے لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ بکھر گئی۔ یقیناً اس کی آواز بھی اچھی ہو گی اور تلفظ بھی، میں نے گفتگو سے اندازہ لگا لیا اسے تو کسی آرٹسٹ کے گھر میں جنم لینا چاہیے تھا۔ یہ ہم جیسے کاروباری لوگوں کے یہاں......"

پھر ماتھر صاحب ہمیں اپنی حویلی میں لے گئے۔ وہ دیر تک شراب نوشی میں مصروف رہے اور ہم ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔

وہ شام اتنی خوبصورت گزری کہ مجھ میں اور اعتماد بھر گیا۔ ماتھر صاحب کے آرٹ سے بے پناہ لگاؤ کے پہلو کو میں نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ میں سیما کی مدد سے ماتھر صاحب کو جب بھی کوئی ایسا تحفہ پیش کیا کرتا جس میں کہیں نہ کہیں آرٹ کی جھلک موجود ہوتو انھیں بیحد خوشی ہوتی۔ قربت کے بعد ان کی زندگی کے تاریک پہلو سے ہمیں بہت ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔

وہ کبھی کبھی موڈ میں ہوتے تو کہہ دیا کرتے کہ شہر کے پہلے آدمی ہو، جس نے میری ذاتی زندگی کو بھی بہت حد تک جان لیا ہے۔ ہم دیر تک گھریلو باتیں کرتے رہتے تو کبھی کبھی وہ معصوم بچوں کی طرح ہم سے پیش آتے، اکثر انھیں جذباتی دیکھ کر میری آنکھیں بھر

آیا کرتیں۔

ایک شام میں ماتھر صاحب کی حویلی میں گیا تو پتہ چلا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر ان کے چیک اپ کے لئے آیا تھا۔ اچانک نبیعت خراب ہوگئی ہے۔ شاید کام کا بوجھ زیادہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انھیں دس پندرہ دنوں تک آرام کرنا چاہیے۔ میں دوڑتا ہوا ان کے کمرے میں پہونچا تو وہ ایک کتاب کے مطالعے میں محو تھے اور غزل سرا کی مدھم سی آواز بھی ان کے کمرے میں گونج رہی تھی۔

"سر ابھی ابھی پتہ چلا کہ ڈاکٹر آپ کے چیک اپ کے بعد ابھی گیا ہے اور اس نے آپ کو دس پندرہ دنوں تک آرام کی ہدایت دی ہے۔"

انھوں نے کتاب کا صفحہ الٹا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ "اوہ جیتندر جی .... ڈاکٹر تو ہمیشہ ہی مجھے ایسی ہدایات دیتے رہتے ہیں۔"

"لیکن سر....."

"میں جانتا ہوں مجھے کچھ نہیں ہوگا.... بہت مضبوط آدمی ہوں میں۔"

"نہیں سر.....! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ پلیز آپ ڈاکٹر کی بات مان لیں....!" میں نے خوشامد کے انداز میں کہا۔ پھر ان سے اپنی اپنائیت کے اظہار کے لئے میں نے فوراً اپنے پڑوسی کے گھر فون کر کے ماتھر صاحب کا دل بہلانے کے لئے سیما اور اپنی پتنی کو بلا لیا اور ساری رات ان کی تیمار داری کرتے رہے۔

"انکل..... آپ کو ڈاکٹر نے ہدایت دی ہے تو آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ میں آج ہی آپ کے کسی ہل اسٹیشن جانے کے لئے انتظام کرواتی ہوں....."

"نہیں سیما...... یہاں تو تم لوگوں نے بہت اپنے پن کے ساتھ خدمت کی ہے۔ وہاں جاؤں گا تو ایک دم اکیلا ہو جاؤں گا، نوکروں سے کہاں دیکھ بھال ہو سکے گی۔"

آپ ہمیں خود سے الگ کیوں سمجھتے ہیں۔ بیٹی سیما آپ کے ساتھ جائے گی۔ یہ آپ کی سیوا کرے گی، اب تو یہ آپ کی بھی بیٹی ہے۔

"ہاں انکل..... میں آپ کی سیوا کروں گی۔"

"نہیں نہیں تم لوگ یہ سب نہ کرو۔" گویا یہ مسٹر ماتھر صاحب کا فیصلہ تھا مگر پھر بھی جب سیما اور میں نے بہت ضد کی تو وہ مان ہی گئے، میں بہت خوش ہوا کہ ماتھر صاحب جیسے سرمایہ دار نے مجھ جیسے معمولی آدمی کو بھی اپنا فیملی ممبر سمجھا۔

دوسری صبح ہم ان دونوں کو جب ایئر پورٹ پر سی آف کرنے گئے تو میں نے ماتھر صاحب سے بہت مؤدبانہ لہجے میں مگر ڈرتے ڈرتے کہا۔

"سر..... مجھے ایک بات....."

"ہاں..... ہاں کہئے..... ارے بولئے بھی...... اب آپ ہمارے لئے غیر تھوڑے ہی ہیں۔"

"سر..... پچھلے دنوں آپ کی کمپنی نے جو ٹنڈر مانگا تھا۔ مجھ جیسے معمولی آدمی نے بھی اسے بھر دیا ہے اگر یہ ٹنڈر مجھے مل جائے تو میں اپنے کاروبار کو فروغ دے سکتا ہوں....."

میرے اتنا کہتے ہی ماتھر صاحب کے چہرے پر اچانک تبدیلی آگئی مگر پھر بھی دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولے ——

"ہوں..... آپ راتوں رات لکھ پتی بننا چاہتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کاروبار میں آج تک میں نے سمجھوتہ نہیں کیا ہے مگر.... آپ نراش نہ ہوں، دیکھوں گا کہ کیا ہو سکتا ہے۔"

ایک ہفتے بعد ہی ماتھر صاحب روبصحت ہو کر شہر لوٹ آئے لیکن سیما مضمحل اور بیمار سی رہنے لگی۔

ماتھر صاحب اپنے کاروبار میں مصروف ہوگئے، سیما کی خاموشی گہری ہوتی گئی، ایسا لگتا کہ اس کے من میں کوئی بات ہے جو وہ ہم سے کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی۔ —— پھر ایک رات اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا، وہ زور زور سے رونے چلانے لگی۔

"اس ماتھر کے بچے کو مت چھوڑنا ممی۔ .... اسے جان سے مار دو ڈیڈی...."

اس کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں پوری تیاری کے ساتھ ماتھر صاحب کی حویلی جا پہنچا میرے اندر جو کچھ ابل رہا تھا اسے ماتھر کا خون ہی شانت کر سکتا تھا۔

میں بغیر اجازت لئے اس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ حسب معمول وہ شراب سے دل بہلا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور شاید میری کیفیت کو محسوس کر لیا۔ پھر اس نے بہت خلوص کے ساتھ مجھ سے کہا۔

"آیئے..... جیتندر پرساد جی....... بہت بہت مبارک باد..... راتوں رات لکھ پتی بننے کا آپ کا خواب پورا ہوگیا۔ میں نے آپ کا ہی ٹنڈر پاس کیا ہے۔ آپ یہی چاہتے تھے نا....."

انھوں نے سوال کیا مگر میرے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

نظمیں



تان کر ہیں سو گئی
خامشی کی اک ردا
اپنے سینے میں چھپا کر
جانے کتنے اضطراب
دلکشی
دل لگی
نغمگی
تازگی
اب کہاں زندگی
خامشی، خامشی
بے کلی، بے کلی
بے بسی، بے بسی
بھول جا زندگی
میں فسردہ ہوئی
آنکھ نم ہو گئی
زندگی سو گئی
خامشی ہو گئی

ڈاکٹر سلمیٰ شاہین
19/A حوض رانی۔ مالویہ نگر، نئی دہلی۔ 17

یہ کس کی محفل سجی ہوئی ہے
یہ کیسی محفل سجی ہوئی ہے
خوشی و غم کے عجیب منظر
یہ آرزوؤں کے سبز جالے
یہ حسرتوں کے اداس پیکر
بنامِ امرتِ محبتوں کے
یہ زہر آلود جام و ساغر
قدم قدم پہ بہکتے جملے
لگاوٹوں کے حریص نشتر
گلابیاں کچھ چھلک رہی ہیں
جوانیاں کچھ بہک رہی ہیں
نگاہوں میں کچھ دہکتے شعلے
دبی نظر میں ہیں سر دلاولے
کہیں یہ ریشم کے پیرہن ہیں
کہیں یہ غربت کے کچھ کفن ہیں
کہیں یہ گدرائے کچھ بدن ہیں
کہیں یہ مدقوق گلبدن ہیں
کہیں یہ غازہ لگے سے چہرے
کہیں مٹے سے بجھے سے چہرے
کسی کی آنکھیں چراغ روشن
کسی کے دیپک بجھے ہوئے سے
یہ کس کی محفل سجی ہوئی ہے
یہ کیسی محفل سجی ہوئی ہے
بنامِ الفت شدید نفرت
نگاہِ جاناں میں بھی ملاوٹ
یہ دوستی میں بھی
سودے بازے
دلوں کے رشتوں میں
بھی بناوٹ
نہ دلنوازی
نہ استواری
یہ عاشقی میں بھی
کچھ گراوٹ
یہ کس کی محفل سجی ہوئی ہے؟
یہ کیسی محفل سجی ہوئی ہے؟

ثریا رحمٰن
S 33۔ گریٹر کیلاش۔ نئی دہلی۔ 48

غزلیں

کیسی چُپ چُپ گزر رہی ہے رات
صبح سے کتنی ڈر رہی ہے رات

گھر سے باہر نہ جایئے صاحب
بن کے خنجر اُتر رہی ہے رات

چار سُو ہے غضب کا سناٹا
یاد بن کر اُبھر رہی ہے رات

آج آنکھوں سے چند خوابوں کا
ذکر تھم تھم کے کر رہی ہے رات

ذہن میں آہٹیں دھڑکتی ہیں
دل کا زینہ اُتر رہی ہے رات

چاند کے ڈوبنے کا اے طارقؔ
کیسا ماتم سا کر رہی ہے رات

ذکی طارقؔ
564 کیلا روڈ، گئوشالہ پھاٹک۔ غازی آباد۔

ہمیں بھی زندگی پیاری بہت ہے
مگر جینے میں دشواری بہت ہے

بلانے کے لیے ہستی کو اپنی
حسد کی ایک چنگاری بہت ہے

گزاری ہیں بہت فرقت کی راتیں
مگر یہ رات تو بھاری بہت ہے

ہر اک جذبہ سے جو عاری ہو چہرہ
اُسے پڑھنے میں دشواری بہت ہے

جہاں تک حرف عزت پر نہ آئے
وہیں تک بس وفاداری بہت ہے

کریں کیا اعتبار اس کا کہ جس میں
حقیقت کم اداکاری بہت ہے

نسیمؔ اس دور میں انساں کے اندر
جو تھوڑی سی ہے خودداری بہت ہے

مختار نسیمؔ رامپوری
71۔ ذخیرہ، بریلی (یو۔پی)

دور تک بے منظری کی دُھند تھی چہرے پہ سب کے
رکھ دیا میں نے خود اپنا چہرہ آئینے پہ سب کے

مجھ میں کتنیں ڈھونڈتے ہیں لوگ یوں اپنے سفر کی
جیسے، سنگِ میل بن کر، ہوں نصب رستے پہ سب کے

ہو کسی کی موت، مر جاتا ہے کچھ اپنا بھی حصّہ
ورنہ میرا نام کیوں تحریر ہے، کتبے پہ سب کے

ہو رہا تھا فتح جب یہ شہر، سب کل مجھن رہے تھے
سُرخ تمغے کی طرح، اک داغ ہے سینے پہ سب کے

ٹھیک ہے سب کچھ یہاں پر، یہ تاثر دے رہا ہوں
ڈال کر اپنے لہو کی چادریں، شعلوں پہ سب کے

مجھ سے کھلنا ہی پڑے گا، ہو وہ چابکدست جتنا
میں ہوں ناخن کی طرح چھایا ہوا عقدے پہ سب کے

ہونٹ لفظوں سے تہی، سینے ہیں آوازوں سے خالی
شہر میں تیرے پکارا آیا ہوں دروازے پہ سب کے

کیا کہوں اس دور کی ہے آگہی کتنی اَدھوری
ایک بامعنی اضافہ ہوں یہاں نکتے پہ سب کے

جس کو دیکھو، لکھ رہا ہے اے فضاؔ میری کہانی
نام میرا ہی رقم ہے، آخری صفحے پہ سب کے

فضاؔ ابن فیضی
جمال پورہ، مئو ناتھ بھنجن (اُتر پردیش)

سامنا کچھ حقیقتوں کا کر
زندگی خواب ہی نہ دیکھا کر

پھر کسک بڑھ گئی تو کیا ہوگا
روح کے زخم مت کریدا کر

ریزہ ریزہ بکھر گیا ہوں میں
آ مجھے پیار سے اکٹھا کر

مشورہ دوستوں کا خوب سہی
اپنے بارے میں آپ سوچا کر

پھر اُبھرنا محال ہو جائے
اتنی گہرائی میں نہ اُترا کر

ہر تعلق تجارتی ہے شادؔ
تو بھی اپنا مفاد سوچا کر

شبّیر شادؔ
نیا بازار۔ سہارنپور، یوپی

اَسیر ہو ہی گیا موجِ آب میں سُورج
رہے نہ کیسے بھلا اضطراب میں سُورج

نگاہ بھر کے تمہیں کون دیکھ سکتا ہے
پگھل گیا ہے تمہارے شباب میں سُورج

بس ایک گھونٹ سے مٹتی ہے دل کی تاریکی
یہ کس نے گھول دیا ہے شراب میں سُورج

مری حیات میں تم اس طرح سے آتے تھے
کہ جیسے آئے کسی پل حُباب میں سُورج

رقم کریں گے فسانہ پھر آج چاہت کا
پھر آج بند کریں گے کتاب میں سُورج

ہے ماہتاب تلاشِ سحر میں سرگرداں
چھپائے بیٹھا ہے کوئی نقاب میں سُورج

کبھی نہ ہو گی شبِ غم کی اب سحر توقیرؔ
کہ ہم نے رات کو دیکھا ہے خواب میں سُورج

توقیرؔ زیدی
بیت الشاکرین، 1/A-52/112، دریاآباد، حیدرآباد۔

سحر کے خواب لُٹا شب کے گھر سے واپس آ
نکل غبارِ طلب سے سفر سے واپس آ

خلوص و خیر کے سکّے کا وزن گھٹنے دے
پیامِ امن بہ لبِ شہرِ شر سے واپس آ

ملے ہیں دستِ مشقّت کو انگنت چھالے
کہ اب تو قصرِ مقدّر کے در سے واپس آ

پلٹ رہے ہیں پرندے بھی دن تمام ہوا
نمودِ شام ہے اب تو سفر سے واپس آ

حقیقتوں کے اُجالے بُلا رہے ہیں تجھے
خیال و خواب کی اندھی ڈگر سے واپس آ

نہ ٹوٹ جائے کسی کا غرورِ تشنہ لبی
سمندر آ! کہ درِ کوزہ گر سے واپس آ

خود آگہی کا جنوں دشت خامشی دے گا
مکانِ ذات کے ویراں کھنڈر سے واپس آ

رئیس الدین رئیس
10/1725 دہلی گیٹ، علی گڑھ (یو۔پی)

چیختا ہے ابھی مرے اندر
ہے جو اک اجنبی مرے اندر

کون ٹوٹا ہے آئینے کی طرح
دیکھیے تو سہی مرے اندر

حسرتیں، خواہشیں، تمنائیں
گھٹ کے مر جائینگی مرے اندر

میرے جیسا ہی ٹوٹا پھوٹا ہے
رہتا ہے جو کوئی مرے اندر

لے کے انگڑائیاں اُٹھا ہے آج
اک نیا آدمی مرے اندر

میرے "میں" کو تلاش کرتی ہے
اب مری شاعری مرے اندر

تسلیم انجم
گاھر نرسنگ ڈاکٹر ڈی۔ٹی۔ روڈ، اورنگ آباد (بہار)

فرشِ احساس کو مخمل نہیں ہونے دیتا
وہ مری سانسوں کو صندل نہیں ہونے دیتا

بھیجتا رہتا ہے ہر شام خیالوں کے سفیر
گھر کے دروازے مقفل نہیں ہونے دیتا

کبھی بچوں کو سلادے کبھی خود سو جائے
وہ کہانی کو مکمل نہیں ہونے دیتا

ایک اک لفظ میں بھر دیتا ہے سو سو معنی
وہ مرے شعر کو مہمل نہیں ہونے دیتا

اس کو دستار بچانے کا ہنر آتا ہے
شمع کو وہ کبھی مشعل نہیں ہونے دیتا

اصل حقدار ہے وہ تمغۂ جاں بازی کا
کبھی سرحد کو جو مقتل نہیں ہونے دیتا

ہر گھڑی رکھتا ہے وہ اک نئے سورج پہ نظر
آج کو گزرا ہوا کل نہیں ہونے دیتا

احمد نثار جونپوری
معرفت احمد حفیظ، خواجگی ٹولہ۔ اسٹیشن روڈ۔ جونپور (یو۔پی)

ہر طرف ایک ماحول تلوار سا
میرا احساس پھر بھی غزل کار سا

مستقل وصل بھی لطف دیتا نہیں
ہجر بھی لگنے لگتا ہے آزار سا

غم دلوں کی حدوں میں بھٹکتا ہوا
ایک بستی میں گمنام فنکار سا

تیرا میرا تعلق بھی کیا خوب ہے
ایک غمخوار سا اک اداکار سا

شہر سارا سمجھنے سے قاصر اُسے
ہر بھلی بات کا وہ طرفدار سا

اینٹ پتھر کی خاطر نہیں سر بکف
مسئلہ ہے بزرگوں کی دستار سا

وقت کا یہ تغیّر بھی کیا خوب ہے
اب میں خود بھی نہیں اپنے افکار سا

انور حسین انور
100، چھتہ علی رضا۔ میرٹھ

دو دن کہیں گزارے تو دو دن کہیں رہے
اب تم بھی اعتبار کے قابل نہیں رہے

میں خود بھی چاہتا ہوں سوالوں میں گم رہوں
لیکن تری نظر کا اُجالا یہیں رہے

آنکھیں کھُلی رہیں ترے دیدار کے لیے
سجدوں کے واسطے یونہی بے کل جبیں رہے

ہو ختم جستجو کا نہ بے سمت سا سفر
تا عمر میرے پیروں کے نیچے زمیں رہے

ناکامیوں کے ذکرِ مکرر سے فائدہ
پتھر جو راستے کے تھے آخر وہیں رہے

شاہد وہ خواہشوں کے پرندے عجیب تھے
چپ چاپ مدتوں مرے دل میں مکیں رہے

شاہد رضا
70۔ مہمند جنگلا، شاہجہانپور۔ (یو۔پی)

خلوص و پیار کا اک آئینہ لگے ہے مجھے
وہ بے وفا ہے مگر باوفا لگے ہے مجھے

نا آپ کہہ کے مخاطب مجھے کیا کیجیے
قریب ہوتے ہوئے فاصلہ لگے ہے مجھے

وہ میرے ساتھ اگر ہو تو یہ جہاں سارا
سرور و کیف میں ڈوبا ہوا لگے ہے مجھے

عجیب چیز ہے احساسِ آدمیت بھی
ہر ایک شخص سے کچھ واسطہ لگے ہے مجھے

تمھارا تذکرہ غیروں کی بزم میں سُن کر
بُرا نہ لگتے ہوئے بھی بُرا لگے ہے مجھے

میں ان کا ہو گیا لیکن وہ میرے ہو نہ سکے
لکھا یہ کاتبِ تقدیر کا لگے ہے مجھے

سراج احمد خاں تابش
108 کٹرہ چاند خاں۔ پرانہ شہر بریلی۔

دشمن کے طنز کو بھی سلیقے سے ٹال دے
اپنے مذاقِ طبع کی ایسی مثال دے

جچتی نہیں نگاہ میں دنیا کی کوئی شے
بندہ تمھارے حسن کی کس سے مثال دے

معیارِ شاعری کا تری کچھ بلند ہو
اپنے سخن کو کوئی اچھوتا خیال دے

بخشے بہار کو جو نہ شائستگی کا رنگ
ایسی ہر ایک شئے کو چمن سے نکال دے

پچھلی رُتوں کے داغ تو سب ماند پڑ گئے
اب کے بہار زخم کوئی لازوال دے

میں بھی تو راہرو ہوں ترا رہگذارِ شوق
تھوڑی سی دھول میری طرف بھی اُچھال دے

معصوم صاف گوئی بڑی چیز ہے مگر
ایسا نہ ہو کہیں یہ مصیبت میں ڈال دے

معصوم شرقی
غفار منزل، 63/2 برئی پاڑہ، پوسٹ آرایل بی لین،
24 پرگنہ (شمالی)، مغربی بنگال

بدروحیں

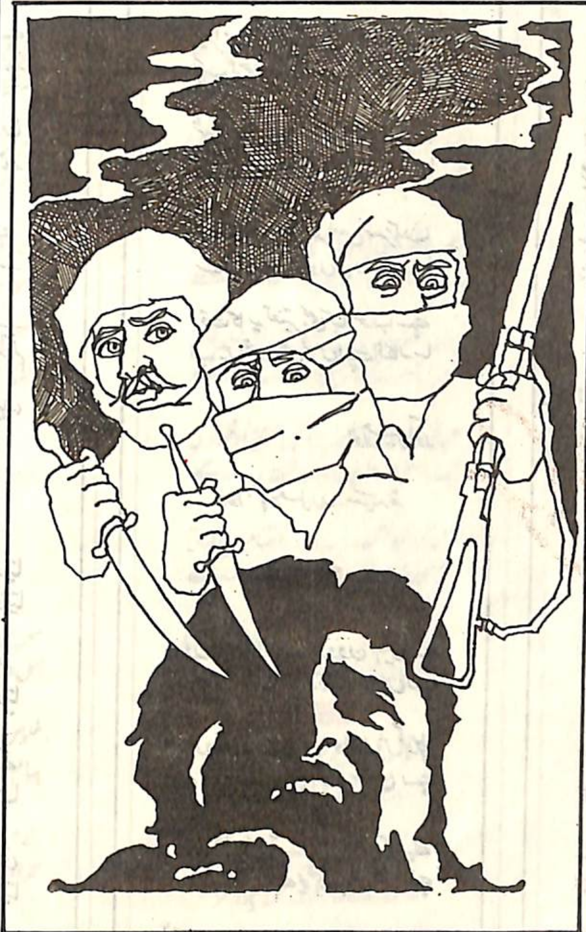
اختر جاوید

چاروں طرف کرفیو کا سناٹا طاری تھا۔ ٹرین چھ بجے ہی بھاگلپور پہنچ گئی تھی اور کرفیو ختم ہونے میں پورے چار گھنٹے باقی تھے۔ اس لئے وہ خاموشی سے ایک کونے میں پڑی بنچ پر بیٹھ گیا۔ لوگوں کے چہرے بدحواس، آنکھیں ویران تھیں۔ وہ سب ایک دوسرے سے خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ ویران نگاہوں میں اَن گنت سوالات تھے مگر ہونٹ کھلتے، تھراتے، پھر خاموش ہوجاتے تھے۔ ماحول پر انتہائی خوفناک سکوت طاری تھا۔ ٹرین کسی شکست خوردہ فوجی جنرل کی طرح ہانپ رہی تھی۔

پلیٹ فارم بیوہ کی مانگ کی طرح سُونا اور ویران تھا۔ ویٹنگ ہال کسی اسپتال کے پوسٹ مارٹم روم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جہاں بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کی لاشوں کے انتظار میں اُداس اور غمزدہ بیٹھے تھے۔ یہ تمام چیزیں اُس کی سوچ اُس کی فکر اور اس کی روح کی انتہائی گہرائی میں اُتر رہی تھیں۔ بہت ساری چیزوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی آواز وہ صاف سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔؟ کیوں ہے؟ کس لئے ہے...؟ ایک کرفیو جسم کی نقل وحرکت پر اور دوسرا روح پر کیوں مسلّط ہے؟ یہ بڑا اذیت ناک ہے۔

اسٹیشن پر موجود لوگ، سہمی سہمی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور پھر باہر سڑک کی جانب جھانکنے لگتے تھے، جہاں صرف پولیس کے جوان یا آوارہ کتّے گھومتے نظر آرہے تھے، اُس کو ایک مکان تلاش کرکے اُس کے مکین کو ایک خط دینا تھا اور اس کام کے لئے اُس کے پاس صرف تین گھنٹے تھے۔ کیوں کہ کرفیو آٹھ بجے صبح سے اُٹھتا اور دن کے گیارہ بجے نافذ ہوتا تھا۔

ٹرین سے اتر کر ویٹنگ روم میں پہنچے ہوئے اسے مشکل سے دس منٹ گزرے تھے مگر پھر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں دس گھنٹوں سے قید ہے، دہشت زدہ چہروں کو کرب وہمدردی کے جذبے سے پڑھنے اور خون روتی ہوئی آنکھوں میں انتہائی شفقت سے جھانکتے رہنے کے بعد جب منظر اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگیا تو وہ اپنا بریف کیس اُٹھا کر تیزی سے باہر نکل



آیا اور پھر اسی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں بی ایس ایف اور پولیس کے جوان رائفلیں سنبھالے فسادیوں کو سزائے موت سے ہمکنار کرنے کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔

سڑک پر آتے ہی کئی رائفلیں اس کی طرف تن گئیں، کئی آوازوں نے اسے للکارا بھی مگر وہ پیش آنے والے خطرات سے بے پروا آگے بڑھتا ہوا اس پولیس افسر کے قریب جاکر رک گیا جو اسے دور سے ہی بری طرح ڈانٹ رہا تھا۔ ایک خط جیب سے نکال کر اسے دکھایا، حالات کی نزاکت کی وجہ سے خط کے لفافہ پر لکھے ہوئے پتہ تک جانے کی اجازت دینے کی التجائیں کیں۔ رویا، گڑگڑایا، رحم کی بھیک مانگی اور جب وہ کسی قیمت پر نہیں مانا تو اُس نے خود اپنی ذمہ داری پر اسے شہر میں جانے کی اجازت دے دی۔

راستے میں اُس نے اُجڑے ہوئے شہر کو دیکھا۔ ویران مکان، سنسان گلیاں، لٹے ہوئے بازار، سڑکوں پر جا بجا خون کے دھبے مضطرب نظروں سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا تو اس نے اجڑے ہوئے شہر کو دیکھا' دور دور تک بکھرے ہوئے کانچ کے ٹکڑے، پتھر اور ٹوٹی ہوئی اینٹیں جگہ جگہ راکھ اور ملبے کے ڈھیر، فضاؤں میں پھیلی ہوئی عجیب سی سڑاہند' دور تا حد نگاہ پھیلا ہوا سناٹا، بڑا بھیانک منظر تھا مگر.... فرض کی پکار اور جذبۂ محبت اسے بڑھائے چلے جارہے تھے۔ مشکل سے دو فرلانگ بھی نہیں پہونچا تھا کہ پولیس کے مسلح دستے نے اسے روک کر بٹھا لیا۔ لاکھ منتیں سماجتیں کرنے کے باوجود بھی اس نے اسے آگے جانے کی اجازت نہیں دی۔ اسے انتہائی اضطراب وبےچینی کے عالم میں اس وقت تک وہاں بیٹھنا پڑا۔ جب تک کہ کرفیو اُٹھائے جانے کا اعلان نہ کر دیا گیا۔

وہ جیسے ہی اس گلی میں داخل ہوا جس کے مکان تک اُسے پہونچنا تھا۔ جلے ہوئے مکانوں سے اُٹھتے دھوئیں، دیواروں، دروازوں اور پردوں کے پیچھے سے گھورتی آنکھیں اُس کی کمر کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ ایک انجانا سا خوف اُس کے وجود پر طاری ہونے لگا۔

غزل

سوادِ تحریر پہ نہ جاؤ جنوں کے قصے لکھا کیے ہیں
قلم پہ جتنے تھے قرض اب تک وہ آج سارے ادا کیے ہیں

ہمیں بچا دے سے ندامت خراجِ گلشن نہ دے سکے ہم
جو چار تنکے تھے آشیاں کے نثارِ موجِ بلا کیے ہیں

ترا تموّن تجھے مبارک، ہمارے دل کو ملال کیوں ہو
ہمیں نے عہدِ وفا کیا تھا ہمیں نے وعدے وفا کیے ہیں

جنوں کی شوریدگی کو دیکھا یہ اہتمامِ وفا نہ دیکھا
جبیں نے سجدے قضا کیے تھے مگر نظر نے ادا کیے ہیں

کوئی بھی سینہ نہیں ہے ایسا جہاں سما جائے درد اپنا
ہمارے لب بند ہی رہیں گے سنا کریں جو سنا کیے ہیں

مغیث الدین فریدی
بی 13، ریڈرس لائنس، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اُس کے قدم بھاری ہونے لگے۔ نیکی، شرافت اور ہمدردی کا جو جذبہ لیکر وہ یہاں آیا تھا اب وہ سب ماند پڑتے جارہے تھے۔ ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُسے بدبو کا اس قدر شدید احساس ہوا کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ قریب تھا کہ وہ چکرا کر گر جاتا کہ اچانک ایک گرجدار آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی "کون ہوتم" تو وہ ایک دم سنبھل گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُن کے ہاتھوں میں رائفل اور بندوقیں ہیں۔ چہروں پر نقاب پڑے ہوئے ہیں۔

"سُنا نہیں کون ہوتم" وہی گرجدار آواز اُس کی سماعت سے پھر ٹکرائی۔ طویل قامت، بھورے بالوں والا ایک شخص بندوق لئے اس کے نزدیک آگیا۔ اُس نے غور سے ہر ایک کی جانب دیکھا۔ اپنے اطراف کی دیواروں، کواڑوں اور پردوں پر نظر ڈالی۔ ان کے پیچھے کی سہمی ہوئی نگاہیں اور لرزتے ہوئے جسم اور بھی سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ نگاہوں میں اس طرح بیچارگی تھی جیسے معافی مانگ رہی ہوں، کہہ رہی ہوں کہ ہم شرمندہ ہیں کہ تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتے۔ ہم تو خود شرمندہ ہیں کہ یہ ہمارے جسم کے ناپاک قطرے ہیں۔

"سالا بہرا ہوگیا ہے کیا۔ سنائی نہیں دیتا۔ کون ہے بے تو؟" بندوقیں، تلواریں اور خنجر اس کے قریب آگئے۔

"میں ایک انسان ہوں اور یہی میری پہچان ہے، تم کون ہو..... کیوں آگ اور خون کی ہولی کھیل کر نسل انسانی کو شرمسار کررہے ہو۔"

"ایسا لگتا ہے یہی ہے ہمارا دشمن سالا" کسی نے حقارت سے کہا۔

"میں تمہارا دشمن کس طرح ہوسکتا ہوں، میں تو تمہیں جانتا تک نہیں اور نہ تم مجھے جانتے ہو۔" وہ لجاجت سے بولا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" کوئی دہاڑا تو وہ نام بتانے پر مجبور ہوگیا۔ پھر کیا تھا، بھالے چمکے، تلواریں لہرائیں، کئی دھماکے ہوئے اور سیاہ سڑک پر سرخ خون کے دھبوں میں ایک کا اور اضافہ ہوگیا۔

انسان نما بھیڑیوں کا لیڈر آگے جھک کر اس کی تلاشی لینے لگا۔ کسی نے بریف کیس جھپٹا کسی نے کلائی کی گھڑی نوچی کوئی اُنگلی سے انگوٹھی کھینچنے لگا۔ دُور آسمان پر اُڑتا ہوا گدھوں کا ایک جھنڈ ادھر بڑھنے لگا۔ اور پھر وہ تمام بدروحیں سیاہ، ویران گلیوں میں گم ہوگئیں۔

پھر یہ تمام بدروحیں ایک نیم تاریک کمرے میں جمع ہوکر دن بھر کے کارنامے فخریہ انداز میں بیان کرنے لگیں۔ لُوٹ کے مال کی تفصیل بیان کی جانے لگی، زمینوں میں دبائے گئے انسانوں پر تبصرے ہونے لگے۔ لوگوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے، بورے میں بھر کر جلانے یا کنوئیں میں پھینکنے کی مشقت اور اُس کے بدلے میں کم معاوضے کا گلہ ہونے لگا۔ لوٹ کے مال کو جمع کرنا، اُن کو ٹرک پر لاد کر گنگا کنارے تک لے جانا، وہاں کشتی میں لاد کر دوسرے کنارے پہنچانا اور پھر وہاں سے بیل گاڑی اور ٹریکٹر کے ذریعہ اپنے اپنے گاؤں لے جانے کی دشواریاں زیر بحث آئیں۔ کسی نے کہا لاشوں سے بڑی بدبو اُٹھ رہی ہے سالے بہت پاپی تھے۔ کوئی بولا فوج نے آکر ہمارے کام میں بڑی دشواری پیدا کردی۔

درندہ صفت انسانوں کے لیڈر نے اس کی جیب سے نکلے ہوئے لفافہ پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس پر خود اس کا اپنا ہی نام و پتہ لکھا ہوا ہے۔

"پچھو..... مجھو تو ذرا یہ اس لفافے پر میرا پتہ کیوں ہے؟" لیڈر بوکھلا سا گیا تو سنسان مکان میں قبرستان جیسا سناٹا ایک بار پھر پھیل گیا۔ اس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور اس کے اندر کا کاغذ کھینچ کر جلدی جلدی پڑھنے لگا۔

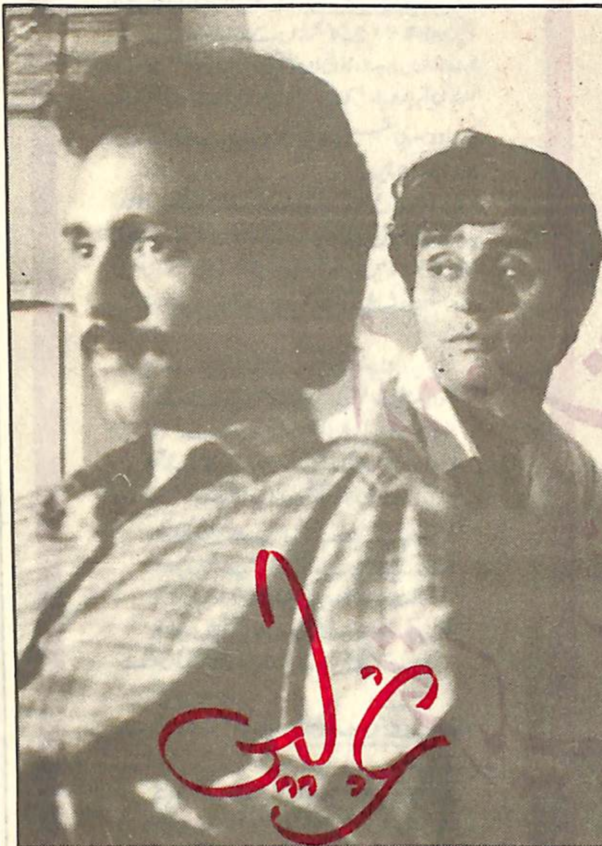
بھیا جی!!

اتنے دنوں تک میں کہاں رہا آپ سوچ رہے ہونگے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ گھر سے بھاگنے کے بعد میں کلکتہ چلا آیا اور مجھے ایک کارخانے میں نوکری مل گئی۔ یہیں میری ملاقات ان سے ہوگئی ہم دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ اس کے گھر کے لوگوں نے مجھے اپنوں جیسا پیار دیا ہے، اس کا گھر اور گھر والے میرے اپنے بن گئے ہیں۔ کارخانہ کی مشین میں آجانے کی وجہ سے میرا ہاتھ کٹ گیا ہے۔ میرا یہ دوست اور اس کے گھر والے ہمارے مذہب کے نہ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ اس طرح پیش آرہے ہیں جیسے میں اُن کا اپنا سگا ہوں۔ اب تو میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ انسانوں کے درمیان سب سے بڑا رشتہ اپنائیت کا ہے۔ آپ اور ماتا جی فوراً اسی کے ساتھ کلکتہ آجائیں۔ آپ لوگوں سے شرمندگی کی وجہ سے تب ہی گھر آؤں گا، جب آپ آکر لے جائیں۔

اس نے گھبرا گھبرا کر خط کو دیکھا، الٹ پلٹ کر نظریں دوڑائیں مگر..... پتہ کہیں نہیں تھا۔ اس نے کاغذ کے پرزے کو توڑ مروڑ کر پیر تلے مسلا، دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دبوچ کر وہیں بیٹھ گیا اور دہاڑیں مار کر رونے لگا۔

کمرے میں موجود بدروحیں اپنے اپنے گھٹنوں پر سر جھکائے اپنے لیڈر کی حالت پر آنسو بہا رہی تھیں۔ اب اس کے ہاتھوں میں لرزہ پیدا ہوگیا تھا۔ کندھے سے لٹکی ہوئی رائفل ڈھلک کر زمین پر آگئی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ بدبدایا۔ "دوستو میری مدد کرو۔ چلو اس گلی میں دوبارہ چلیں۔ اسے اٹھا لائیں وہ میرے بھائی کا دوست ہے میرا اپنا ہے..... مرا اپنا....." وہ بلکا۔

تو کمرے میں موجود تمام بدروحوں نے اپنے اپنے گھٹنوں سے سر اُٹھا لیا۔ اب اُن کے سانس لینے کی آوازیں ایسی تھیں گویا کسی ویرانے میں بھٹکے ہوئے قافلہ کی گریہ وزاری سنائی دے رہی ہو۔



یہ اچانک دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا
تو نے تو چوما تھا لیکن جسم نیلا ہوگیا

دنیاداری کے تقاضے بے جھجھک ٹھکرا دیئے
میں نے اتنا سچ کہا ہر قول جھوٹا ہوگیا

شخصیت اس کی ادھوری تھی، ادھوری ہی رہی
وہ نیا بننے کی لالچ میں پُرانا ہوگیا

مصلحت کی بات اب میری سمجھ میں آگئی
میں ذرا ٹیڑھا ہوا، ہر شخص سیدھا ہوگیا

ہائے مجھ کو مل رہی ہے کن گناہوں کی سزا
میں جواں بھی ہو نہ پایا تھا کہ بوڑھا ہوگیا

خود بخود پھر حوصلے، بونے نظر آنے لگے
قد مگر ناکامیوں کا اور لمبا ہوگیا

اس نے تعریفوں کی ایسی خوش لباسی بھینٹ کی
چند لمحوں کے لیے راشدؔ میں ننگا ہوگیا

راشد انور راشدؔ

اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ چونا بھٹہ، پوسٹ میڈیکل کالج۔ رانچی (بہار)

سب ساتھی ہیں پل دو پل کے
جانا ہوگا تنہا چل کے

چارہ گروں کے روپ میں اکثر
قاتل آیا بھیس بدل کے

سائے ساتھ نہیں میرے بھی
آپ نہ آئیں دھوپ میں چل کے

دِن نکلا ہے سب کہتے ہیں
دیکھ رہا ہوں آنکھیں مَل کے

رونے کے آداب یہی ہیں
دِل زخمی ہو آنکھ نہ چھلکے

زخم ہمارے جتنے ہرے ہیں
اتنے ہی دل کش شعر غزل کے

نام مرا سُن کر وہ بولے
ہم شیدا ہیں اس پاگل کے

— جمیل نظام آبادی

35/2-7-4۔ آعظم روڈ، نظام آباد۔

اردو شاعری
اور
تحریکِ آزادی

رئیس مرزا
7/7۔ سروپریہ وہار۔ دہلی۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں، مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی، کہوں اس پہ کیا کیا جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے، کہا یہ بھی قابل دار ہے

یہ اشعار آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ہیں جنھوں نے اس زمانے کی تصویر کشی کی ہے جب انگریز ہندوستان پر قابض ہو رہے تھے۔ ہم اردو شاعری پر یقیناً فخر کر سکتے ہیں۔ جو صحیح معنوں میں ہندوستانی سیاسی تحریکات کا ایک معتبر تاریخی ذخیرہ ہے اور فنی اعتبار سے بھی بلند مقام کا حامل ہے۔ بقول علی سردار جعفری:

اردو والوں نے آزادی کی جدّوجہد کو قومی دائرے تک ہی محدود نہیں رکھا، اس کے دائرے بین قومیت سے ملائے اور اس طرح ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا۔

یہ ایک کھلی سچائی ہے کہ اردو شاعری نے ہندوستان کی سیاسی تاریخ کو پوری طرح اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو شاعری نے نہ صرف سیاسی واقعات اور حالات کی تصویریں ہی ہمارے سامنے پیش کیں بلکہ دیدی گئیں اشفاق اللّٰہ خاں، انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے فیض آباد جیل میں یہ اشعار کہے تھے:

سبھی سامانِ عشرت تھے مزے سے اپنی کٹتی تھی
وطن کے عشق نے ہم کو ہوا کھلوائی زنداں کی
وہ گلشن جو کبھی آباد تھا گزرے زمانے میں
میں شاخِ خشک ہوں، ہاں ہاں اسی اجڑے گلستاں کی

اسی طرح رام پرشاد بسمل اردو کے ایسے شاعر تھے جن کے اشعار وطن پرستی کے جذبات سے معمور ہیں۔ ان کی غزل اس عہد کی زندہ یادگار ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
وقت آنے پر بتادیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

بلگام کے کانگریس اجلاس (1924) میں مہاتما گاندھی کے یہ الفاظ:

"میں سلطنت کے اندر رہ کر سوراج کے لیے جدوجہد کروں گا۔ لیکن اگر برطانیہ کی غلطی سے ضرورت آپڑی تو میں سلطنت برطانیہ سے تمام تعلقات توڑ لوں گا۔"

بہت معنی خیز تھے۔ 1928 میں سائمن کمیشن کی آمد پر جگہ جگہ اس کا بائیکاٹ کیا گیا، ہمارے شعرا بھی پیچھے نہیں رہے اس موقع پر ظفر علی خاں نے کئی نظمیں لکھیں۔ اپنی نظم "سائمن کمیشن" میں فرماتے ہیں:

سائمن صاحب کے استقبال کا وقت آگیا
جاگ اے لاہور اپنے فرض کو پہچان کر
ہر قدم پر ہو کمیشن کا مکمل بائیکاٹ
طول وعرضِ ملک میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کر

اس موقع پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے بھی ایک نظم "سائمن کمیشن" کہی:

سحر ہوتے ہی مخمورِ شبانہ
کہا یوں چشم ساقی نے فسانہ
لگی ہے گھات میں مدت سے تیری
فرنگی کی نگاہِ جا و دانہ
اگر جینا ہے آزادی سے تجھ کو
سنا دشمن کو بڑھ کر یہ ترانہ
"برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ"

اسی سال کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نے مکمل آزادی کی آواز اٹھائی آخرکار 1930 میں کانگریس کے انتہا پسندوں کی اعتدال پسندوں پر جیت ہوئی اور مکمل آزادی کو کانگریس کا آدرش قرار دیا۔ اسی سال مارچ میں سول نافرمانی کی ایک دوسری نظم میں محروم نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تحریک شروع ہوئی ہزاروں کو جیل بھیجدیا گیا اور ہزاروں گولیوں سے مارے گئے لیکن تحریک جاری رہی۔ اس دور میں اردو شاعری اپنا رول برابر ادا کرتی رہی۔ مشہور شاعر پنڈت تلوک چند محروم نے فرمایا:

دیکھ لینا خونِ ناحق رنگ اک دن لائے گا
خود غرض ظالم کیے پر اپنے خود پچھتائے گا
راہ پر دورِ زماں آخر کبھی تو آئے گا
آسماں اس خاک کی تقدیر کو چمکائے گا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

تو مسلم ہے کہ ہندو ہے غرض اس سے نہیں مجھ کو
محبت ہے وطن سے تجھ کو اتنا ہے یقیں مجھ کو
تری حالت نہ ہو حسرت فضا اس آفریں مجھ کو
اگر مل جائے کچھ اس کا جوابِ دلنشیں مجھ کو
کیا ہے کیا وطن کے واسطے اے نوجواں تو نے

جناب روش صدیقی: اپنی نظم "باردولی" میں فرماتے ہیں:

کچھ نہیں ہے تو نہ ہو ہاں دلِ بے داز تو ہے
ہاتھ خالی ہیں تو کیا صبر کی تلوار تو ہے
حسنِ کردار سے خم ظلم کی دیوار تو ہے
ہیں نہتے مگر امیدِ ظفر رکھتے ہیں!
یہ جری عدم تشدد کی سپر رکھتے ہیں!

نوٹ

قلمکار حضرات اپنی تخلیقات اور ایجنٹ صاحبان اضافے کے آرڈر جلد از جلد روانہ فرمادیں۔

G-4، اندرپرکاش بلڈنگ
بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی

سی 3، سیکٹر 11،
ضلع غازی آباد، نوئیڈہ
(یو۔ پی)

جوش ملیح آبادی: نے اپنی نظم آثار انقلاب میں فرمایا:

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے
اٹھو، وہ صبح کا غرفہ کھلا تو بخیہ شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی
اٹھو، چونکو، بڑھو، منہ ہاتھ دھو آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو

حفیظ جالندھری: نے اپنی نظم "آزادی" میں فرمایا:

جب تک چوروں راہزنوں کا ڈر دنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے جو آزادی کا طالب ہے

جمیل مظہری: نے 'نوائے جرس' میں فرمایا:

بجھے نہ شمعِ دل کہیں، ہوا ہے تیز باغ کی!
اگر اندھیری رات ہے بڑھا دو لو چراغ کی!

پنڈت آنند نرائن مُلّا: نے "محبانِ وطن کا نعرہ" یوں لگایا:

شہیدِ جورِ گلچیں ہیں اسیرِ خستہ تن ہم ہیں
ہمارا جرم اتنا ہے ہوا خواہِ چمن ہم ہیں
سُلائے گی ہمیں خاکِ وطن آغوش میں اپنی
نہ فکرِ گور ہے ہم کو نہ محتاجِ کفن ہم ہیں

آزاد انصاری: "پیغامِ وطن" میں یوں گویا ہوئے:

تم میں سو گُن تم میں لاکھوں رَکھ رَکھاؤ
تم سبھی کچھ ہو مگر یہ تو بتاؤ
لب پہ آہِ سرد بھی ہے یا نہیں
دل میں قومی درد بھی ہے یا نہیں

جعفر علی خاں اثر: "درسِ اتحاد" میں فرماتے ہیں:

کاش ایسی کوئی صورت نکلے
غفلت بیداری سے بدلے
وہ رُوپ سنگار وطن کا ہو
جو نازِ عروسِ چمن کا ہو

احسان دانش: "ناقوسِ بیداری" میں فرماتے ہیں:

جن کی خواہش ہے کہ بجھ جائے اخوت کا چراغ
پیس دے گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے ان کا دماغ

1935 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبوں کو محدود خود مختاری دی گئی۔ لیکن اس سے عوام خوش نہیں تھے تو شعرا کیسے خوش ہو سکتے تھے۔

ظفر علی خاں: نے اپنی نظم میں کچھ یوں فرمایا:

صدرِ اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام
لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیا دیا
کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لیے
اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا

احمق پھپھوندوی: نے "آئینِ جدید" میں کہا:

ہند کے سر پر مسلط ہو گیا آئینِ نو
مکر و استبداد کی چوٹی سے فرما کر نزول
مغربی کاغذ تراشوں نے کم و بیش اک صدی
صرف کی ہے تب بنا پایا ہے یہ خوش رنگ پھول

جوش: نے فرمایا:

اس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نویدِ گُل
اک بے پناہ چُوک ہے، اک سخت بھول ہے

1936 میں رنگون کے ٹاؤن ہال میں کانگریس کے پرچم لہرانے کی ایک تقریب آراستہ کی گئی۔ اس میں ظفر علی خاں نے نظم نویدِ آزادیٔ ہند پڑھی۔

وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستان ہوگا
مبارکباد اس کو دے رہا سارا جہاں ہوگا
علم لہرا رہا ہوگا ہمارا رائے سینا پر
اور اونچا سب نشانوں سے ہمارا یہ نشاں ہوگا

فراق گورکھپوری: نے "زمانے کے چیلنج" میں فرمایا:

عالمِ نزع ہے آئینِ شہنشاہی کا
چارہ گر اب تری بے کار مسیحائی ہے

شورش کاشمیری: بہت اچھے مقرر تھے اور ساتھ ہی شاعر بھی تھے۔ انھوں نے فرمایا:

یہ ملک ہوا جس کے تشدد کا نشانہ
اب اس کی تباہی کا بھی آیا ہے زمانہ
مشرق کے جوانوں کو سنبھلتے ہوئے دیکھوں
یہ ہند کی سرکار بدلتے ہوئے دیکھوں

اسرار الحق مجاز: نے نوجوانوں سے کہا:

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

جاں نثار اختر: نے ساقی سے فرمایا:

اگر ممکن ہو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

مخدوم محی الدین: نے جہانِ نو کی تمنا کرتے ہوئے کہا:

ایسا جہاں کہ جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہاں کہ جس کا اخوّت پیام ہو
ایسا جہاں کہ جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

فیض احمد فیض: نے تسلی دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یوں ہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

علی سردار جعفری: نے وقت کے ترانے میں کہا ہے:

بادباں کھل گئے بغاوت کے
بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے
ایسے جانباز نمازیوں کو سلام

احمد ندیم قاسمی: نے شفق سُرخ کو سلام کرتے ہوئے کہا:

ابنِ آدم تری جھلسی ہوئی شریانوں میں
خونِ تازہ کی نئی لہر ہے چلنے والی
یہ حکومت ہے، یہ قوت ہے سمبھل اور سمبھال
اب نئے رُوپ میں تقدیر ہے ڈھلنے والی

سلام مچھلی شہری: نے سات رنگ کی تصویر کھینچی:

تصویر وہ بناؤں کہ مسحور ہو سکوں
ایسے خطوط کھینچوں کہ مفرور ہو سکوں

ساحر لدھیانوی: بھی اپنے آپ کو ان حالات سے دور نہ رکھ سکے اور گویا ہوئے:

کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دل جبّاروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِ الٰہی، مُنہ اُترے ہیں غدّاروں کے
ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

1939 میں جب دوسری جنگِ عظیم چھڑی اور وائسرائے نے مجلسِ قانون ساز سے مشورے کیے بغیر اعلان کیا کہ ہندوستان جنگ میں شریک ہے۔ جو دراصل دستور کی خلاف ورزی تھی تو کانگریس وزارتوں نے احتجاج کے طور پر استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت حکومت نے تحریر و تقریر پر پابندی لگا دی اور عوام کی آواز کو دبانے کے لیے جیل خانوں کے دروازے کھول دیئے۔ اور تمام بڑے بڑے کانگریسی رہنما گرفتار کر لیے گئے۔

1941 میں ہندوستان کی آزادی کا وعدہ کیا گیا اور گرفتار شدہ رہنما رہا کر دیئے گئے لیکن آزادی کی وضاحت نہیں کی گئی۔ کانگریس نے دوبارہ برطانیہ سے جنگ کے معاملے میں تعاون کرنے سے انکار کیا تو کرپس مشن آیا لیکن ناکام رہا۔ اس کے بعد اگست 1942 میں "ہندوستان چھوڑو" کی تحریک شروع ہوئی۔ تحریک کے شروع ہوتے ہی کانگریس کے سبھی بڑے رہنما گرفتار کر لیے گئے اور قلعہ احمد نگر میں قید کر دیئے گئے۔

کیفی اعظمی: نے "قلعہ احمد نگر" نظم کہی:

یہ بجھی سی شام یہ سہمی ہوئی پرچھائیاں
خونِ دل بھی اس فضا میں رنگ بھر سکتا نہیں
آ اتر آ کانپتے ہونٹوں پہ اے مایوس آہ
سقفِ زنداں پر کوئی پرواز کر سکتا نہیں

جاں نثار اختر: نے اگست 42 کے جانبازوں سے کہا:

آج آپہنچے ہیں یہ کس وادیٔ ظلمت میں ہم
پئے بہ پئے اٹھتے نہیں ہیں کس لیے اپنے قدم
بڑھ گیا کیا اور بھی منزل کا اپنی فاصلہ
ہمرہانِ قافلہ اے ہمرہانِ قافلہ

شمیم کرہانی: نے 1942 میں گاندھی جی کی رات کے وقت ہوئی گرفتاری سے متاثر ہو کر کہا:

تم جبل جیسے لئے جاتے ہو وہ درد کا مارا ہے دیکھو
مظلوم اہنسا کا حامی، بے بس دُکھیارا ہے دیکھو
بے چین سا اس کی آنکھوں میں پچھلے کا تارا ہے دیکھو
کچھ دیر ذرا سو لینے دو

اسرار الحق مجاز: نے انگریز جیسے بدیسی مہمان سے کہا:

مسافر! بھاگ وقتِ بیکسی ہے
ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
نہ دے ظالم فریبِ چارہ سازی
یہ بستی تجھ سے اب تنگ آ چکی ہے

1946 میں جب آزادی کی تحریک اپنی منزل کے قریب پہنچ رہی تھی۔ جہازیوں کی بغاوت سے انگریز اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور انگلستان کے وزیر ایٹلی نے اعلان کیا کہ 1947 میں حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کر دی جائے گی۔

آخر کار وہ پر مسرت لمحہ قریب آگیا جس کے لیے ہزارہا ہندوستانیوں نے اپنی قربانی پیش کی تھی۔ 14، 15 اگست کی درمیانی رات ہندوستانیوں کے لیے سورج سے زیادہ روشن تھی۔ جب آدھی رات کو پنڈت جواہر لال نہرو نے آزادی کا استقبال کیا۔

جاں نثار اختر: نے آزادی کے نشے میں جھوم کر جشنِ آزادی کا اعلان کیا:

سینے سے آدھی رات کے
پھوٹی وہ سورج کی کرن
وہ رقص میں آیا گگن
آئے مبارکباد کو
کتنے شہیدانِ وطن
آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے اپنا وطن
آزاد ہے اپنا وطن

اے اودِ گنگا گیت گا
اٹھلا کے چل موجِ جمن
ہاں، اے ہمالہ جھوم جا
رقصاں ہوا ے دشت و دمن
ہاں، اے ایلورا کے بُتو
نغمہ سرا ہو نغمہ زن
آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے اپنا وطن
آزاد ہے اپنا وطن

اے پرچمِ سہ رنگ تو
اپنے وطن کی آبرو!
تو ہے ہمارا ننگ و نام
ہم تجھ کو کرتے ہیں سلام
زردی سے تیری رُونما
بے لوث خدمت کی لگن
سبزی سے تیری جلوہ گر
ہمت، جوانی، بانکپن
تیری سفیدی سے عیاں
انسانیت، پاکیزہ پن

اے پرچمِ سہ رنگ تو
اپنے وطن کی آبرو!
تو ہے ہمارا ننگ و نام
ہم تجھ کو کرتے ہیں سلام
ہم تجھ کو کرتے ہیں سلام

اور یوں جاں نثار اختر کے بعد اردو شعرا نے دِل کھول کر وطن کی آزادی کے گیت گائے۔

<u>سراج لکھنوی</u>: نے یومِ آزادی کا استقبال کرتے ہوئے کہا:

نظر نواز ہے رنگِ بہارِ آزادی
ہر ایک ذرہ ہے رنگِ بہارِ آزادی
ہے سر زمینِ وطن جلوہ زارِ آزادی
سروں کے ساتھ ہے اب تو وقارِ آزادی
کہاں ہیں آج وہ شمعِ وطن کے پروانے
بنے ہیں آج حقیقت انھیں کے افسانے

<u>اقبال احمد سُہیل</u>: نے مبارکبادِ آزادی یوں پیش کی:

رخصت ہے شب تار غلامی کا اندھیرا
وہ سامنے ہے صبحِ سعادت کا سویرا
بھارت سے بدیشی کا اکھڑنے لگا ڈیرا
لہرائے نہ کیوں عظمتِ قومی کا پھریرا
آزاد ہوا قیدِ غلامی سے وطن آج

<u>مجاز لکھنوی</u>: نے جشنِ آزادی مناتے ہوتے کہا:

بصد غرور، بصد فخر و ناز آزادی
مچل کے کھُل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزل خواں ہے

<u>آنند نرائن ملّا</u>: نے فرمایا:

ایک حقیقت بن کے مِلا خوابِ ارمانِ وطن
اے زہے قسمت کہ اپنے جیتے جی آہی گیا

<u>ساغر نظامی</u>: نے صبحِ وطن کو یوں خوش آمدید کہا:

پربت پربت، ساگر ساگر پرچم اپنا لہراتا ہے
محلوں پر، مِلوں پر، قلعوں پر عظمت کے ترانے گاتا ہے
گُل بار ردائے آزادی، سرشار جوانی کا پرچم
یہ امن کے نغموں کا مطرب، انصاف و صداقت کا یہ علَم
تہذیب کا یہ زرّیں آنچل، تعمیر کا یہ رنگیں دامن
اے صبحِ وطن، اے صبحِ وطن

<u>امین سلونوی</u>: نے اعلانِ آزادی کرتے ہوئے کہا:

آج چھوٹے ہیں طلسمِ قیدِ افرنگی سے ہم
آج اپنی آرزوؤں کی زباں آزاد ہے
خونِ شہیدانِ وطن کا رنگ لاکر ہی رہا
آج یہ جنت نشاں ہندوستاں آزاد ہے

<u>یحییٰ اعظمی</u>: یوں گویا ہوئے:

ایک نیّر نو لبند کو مشرق نے اُچھالا
ہے جس کی شعاعوں سے ہر اک سمت اُجالا
لہرائے گا آزادیٔ کشور کا پھریرا
اب ساحلِ مدراس سے تا کوہِ ہمالہ

<u>کمال احمد صدیقی</u>: نے ہماری کہانی بیان کرتے ہوئے کہا:

آج آزادیٔ جمہور کوئی خواب نہیں
آج آئین ہمارا ہے ہمارا ہے نظام
معتبر آج ہے دنیا میں ہماری آواز
آج چڑھتا ہوا سورج ہمیں کرتا ہے سلام

<u>سکندر علی وجد</u>: نے آفتاب تازہ کا استقبال یوں کیا:

دامانِ چاک اشکِ مسرت سے تر ہے آج
دو سو برس کے بعد طلوعِ سحر ہے آج

یہ اُردو اور اُردو شعرا کی ہمارے ملک ہندوستان سے محبت کی ہلکی سی جھلک پیش کرنے کی معمولی سی کوشش ہے۔ جس سے آج کا قاری جدّو جہد آزادی میں اردو شعرا کی خدمات کا اندازہ کر سکتا ہے۔

جنگ آزادی کے نغمے

جنھیں انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا

پنجاب کا ہتیا کانڈ

وہ شہیدِ تیغِ جفا ہوں میں جسے آسماں نے مٹا دیا
مرے منہ سے نکلی نہ آہ تک مجھے گولیوں سے اڑا دیا

وہ بہائیں خون کی ندیاں کہ پکارا عرش بھی الاماں
وہ پاٹ پاٹ کے ستم کیے کہ ہلاکو خاں بھی بھلا دیا

ہمیں جاں نثار ہیں ہند کے ہمیں دلفگار ہیں ہند کے
ہمیں پاس مہر و وفا کا ہے انھیں جان دے کے دکھا دیا

کوئی بیٹھ کر نہ سنبھل سکا کوئی دوڑ کر نہ اچھل سکا
وہ سپوت پا ٹھے جوان تھے تہِ خاک جن کو سلا دیا

بھلا کون کرتا تھا حق رسی کہ سرہانے روتی تھی بے کسی
جسے چاہا اس کو دبا دیا جسے چاہا اس کو جلا دیا

انھیں یاد رکھنا خلیق تم کہیں دل سے کرنا نہ ان کو گم
یہ شہیدِ قوم کے لال ہیں انھیں حق نے اتنا بڑھا دیا

(آریہ گرنتھ رتناکر شہر بریلی سے ماخوذ)

بھارت نہ رہ سکے گا ہرگز غلام اپنا
آزاد ملک ہوگا آتا ہے وہ زمانہ

اب بھیڑ اور بکری بل کر نہ رہ سکیں گے
کر دیں گے ظالموں کا ہم بند ظلم خانہ

خوں کھولنے لگے گا ہندوستانیوں کا
اس پست ہمتی کا ہوگا کہاں ٹھکانہ

بھارت کے ہم ہیں بچے بھارت ہماری ماتا
اس کے ہی واسطے ہے منظور سر کٹانا

عروج کامیابی پر کبھی ہندوستاں ہوگا
بہار آ جائے گی اس دن جب اپنا باغباں ہوگا

چکھائیں گے مزا بربادیٔ گلشن کا گلچیں کو
جب اپنی ہی زمیں ہوگی اپنا آسماں ہوگا

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پہ مرنے والوں کا یہی نام و نشاں ہوگا

[مقدمہ سازش لاہور کے اسیران کی آواز
پیامِ جنگ لاہور کے آزاد نمبر مورخہ 8 جنوری 1930 سے ماخوذ]

جذباتِ بسمل

ہیں اسیرانِ دامِ غم سب نغمہ سنجانِ بہار
بیکلی ہے ہر کلی کو دل فسردہ ہے ہزار

ہے نسیمِ روح افزا کے عوض بادِ غبار
ہر روشِ صحنِ گلستاں کی ہے دورِ انتشار

باغباں دشمن ہے اپنا بے وفا صیاد ہے
دل میں قاتل کے ابھی تک حسرتِ بیداد ہے

کہہ دو قاتل سے کہ وہ شمشیر اٹھا کر دیکھ لے
خنجرِ بیداد بسمل پر چلا کر دیکھ لے

ذبح کر کے دیکھ لے خوں میں لٹا کر دیکھ لے
جس طرح چاہے ہمیں وہ آزما کر دیکھ لے

آتشِ باراں میں بھی جانباز کیا گھبرائیں گے
موت کے منہ میں بھی ہم ہنستے ہوئے بڑھ جائیں گے

طوقِ آہن کیوں دکھاتے ہو ڈرانے کے لیے
ہم تو پیدا ہی ہوئے تھے جیل جانے کے لیے

[شہیدِ وطن رام پرساد بسمل نے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے سے قبل یہ شعر پڑھا تھا]

اب نہ پچھلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت بس دلِ بسمل میں ہے

شہیدوں کا پیغام

ہم بھی آرام اٹھا سکتے تھے گھر پر رہ کر
ہم کو بھی پالا تھا ماں باپ نے دکھ سہہ سہہ کر
وقتِ رخصت انھیں اتنا بھی نہ آئے کہہ کر
گود میں آنسو کبھی ٹپکے جو رخ سے بہہ کر
طفل ان کو ہی سمجھ لینا جی بہلانے کو

نوجوانو جو طبیعت میں تمھاری کھٹکے
یاد کر لینا کبھی ہم کو بھی بھولے بھٹکے
آپ کے عضوِ بدن ہو ویں جدا کٹ کٹ کے
اور صد چاک ہو ماتا کا کلیجہ پھٹ کے
پر نہ ماتھے پہ شکن آئے قسم کھانے کو

اپنی قسمت میں ازل سے ہی ستم رکھا تھا
رنج رکھا تھا محن رکھا تھا غم رکھا تھا
کس کو پروا تھی اور کس میں یہ دم رکھا تھا
ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

اپنا کچھ غم نہیں لیکن یہ خیال آتا ہے
مادرِ ہند پہ کب تک یہ زوال آتا ہے
دیش آزادی کا کب ہند میں سال آتا ہے
قوم پر اپنی تو رہ رہ کے ملال آتا ہے
منتظر رہتے ہیں ہم خاک میں مل جانے کو

(ماتا کے چار آنسو نامی کتابچہ سے ماخوذ)

ثقافتی سرگرمیاں

اردو اکادمی دھلی

تقریب برائے سالانہ ایوارڈ

16 جولائی 1992 کو دہلی انتظامیہ کے چیف سکریٹری آر۔ کے ٹھکر کی زیر صدارت فکی آڈیٹوریم میں اُردو اکادمی دہلی کی جانب سے سالانہ ایوارڈ برائے 1991 دینے کے لئے ایک تقریب منعقد کی گئی۔ ہر انعام نقد رقم، ایک شال، توصیف نامہ اور ٹرافی پر مشتمل تھا۔ مرکزی وزیر مملکت برائے سول سپلائیز کمال الدین احمد نے انعامات تقسیم کئے۔ سب سے بڑا انعام کُل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (25 ہزار روپے) دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے استاد رشید حسن خاں کو دیا گیا۔ 62 سالہ رشید حسن کے ادبی تحقیق، لغت، املا، قواعد زبان، قواعد شاعری، عروض اور تدوین کے بارے میں متعدد کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ایوارڈ برائے تحقیق وتنقید (پندرہ ہزار روپے) سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر محمد حسن کو نوازا گیا۔ 65 سالہ پروفیسر حسن کی اُردو، ہندی اور انگریزی میں مجموعی طور پر 87 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مشہور طنز نگار دلیپ سنگھ کو انعام برائے تخلیقی ادب (15 ہزار روپے) دیا گیا۔ آپ کی اُردو میں چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایوارڈ برائے اُردو شاعری (15 ہزار روپے) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ڈین فیکلٹی آف ہیومینسی ٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر عنوان چشتی کو دیا گیا۔ آپ ایک ہمہ جہت فنکار ہیں اور آپ کی 18 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے تقریباً ساڑھے تین سو مضامین اور ڈھائی سو کتابوں پر تبصرے بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ 72 سالہ صحافی انور علی دہلوی کو ایوارڈ برائے صحافت (15 ہزار روپے) سے نوازا گیا۔ انور دہلوی "بانو" "چلمن" جیسے ماہناموں ہفت روزہ "محنت"، نیز "اردو بازار"، "داستانِ وطن" جیسے روزناموں کی ادارت کر چکے ہیں اور آجکل روزنامہ "عوام" کے مُدیر ہیں۔ قومی آواز دہلی کے ایڈیٹر موہن چراغی کو ایوارڈ برائے قومی یکجہتی (15 ہزار روپے) دیا گیا۔ بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ نے کشمیر کی ترقی پسند تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ 1980 میں جب روزنامہ "قومی آواز" نئی دہلی سے نکلنا شروع ہوا تو وہ اس اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اب وہ اس اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ خالدہ زاہدی کو ایوارڈ برائے بہترین استاد (15 ہزار روپے) غلام حیدر کو ایوارڈ برائے بچوں کا ادب (5 ہزار ایک سو روپے) محمد خلیق لٹوکی کو ایوارڈ برائے فن خطاطی (5 ہزار ایک سو روپے) اور محمد خلیل ایڈیٹر "سائنس کی دنیا" کو ایوارڈ برائے سائنسی ادب (5 ہزار ایک سو روپے) سے نوازا گیا۔ سکریٹری اردو اکادمی دہلی پروفیسر اشتیاق عابدی نے اُردو زبان اور ان انعامات کی اہمیت وافادیت بیان کی۔ مہمانِ خصوصی اردو اکادمی دہلی کے چیئرمین، دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر پی۔ کے دوے نے اردو کے فروغ کے لیے امداد وتعاون دینے کا اعلان کیا۔ دہلی انتظامیہ کے چیف سکریٹری مسٹر ٹھکر نے اُردو زبان کی شیرینی ولطافت کی ستائش کرتے ہوئے دہلی میں اُردو والوں کے مسائل حل کرنے میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ آخر میں ایوان اُردو کے مدیر جناب مخمور سعیدی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔



(بائیں سے دائیں) پروفیسر محمد حسن، دلیپ سنگھ، انور دہلوی، پروفیسر عنوان چشتی، موہن چراغی، خالدہ زاہدی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی یاد

دلی اُردو اکادمی نے مشہور شاعر آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی یاد میں 24 جولائی 1992 کو غالب اکادمی نئی دہلی میں تعزیتی جلسہ منعقد کیا جس میں پاکستان کے مشہور شاعر قتیل شفائی، ماہرِ غالبیات مالک رام، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر اشتیاق عابدی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شارب ردولوی، مشہور ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں، افسانہ نگار جوگیندر پال معروف شاعر مخمور سعیدی، صاحب طرز ادیب ابوالفیض سحرؔ، مقبول صحافی شمس الزماں، مایہ ناز طنز نگار دلیپ سنگھ محبِ اُردو ثاقی نارنگ، کنور صاحب کے چھوٹے بھائی راجندر سنگھ بیدی، خواجہ حسن ثانی نظامی، ارتمن نیتر ایڈیٹر بیسویں صدی، فلمی ستارے کے مدیر اعلیٰ حاجی انیس دہلوی، جناب ذہین نقوی، بہار الٰہ آبادی، منور امروہوی، رفعت سروش اور راشٹریہ سہارا خاندان کے اراکین نے شرکت کی۔ متین صدیقی نے کنور صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ دلی اُردو اکادمی کے سکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے اعلان کیا کہ ماہنامہ ایوان اُردو کے آئندہ شمارہ کا ایک گوشہ آنجہانی بیدی کے لئے وقف ہوگا۔

صبحِ شبِ انتظار

یہی وہ منزلِ مقصود ہے کہ جس کے لیے
بڑے ہی عزم سے اپنے سفر پہ نکلے تھے
اسی گھڑی کی تمنّا میں جانے کتنے لوگ
جو بے خطا تھے مگر سولیوں پہ لٹکے تھے

یہ سوچتے تھے کہ وہ دن کبھی تو آئے گا
تمام حسرتیں دِل کی نکل ہی جائیں گی
ہمارے پاؤں کی یہ بیڑیاں یہ زنجیریں
کبھی تو موم کی صورت پگھل ہی جائیں گی

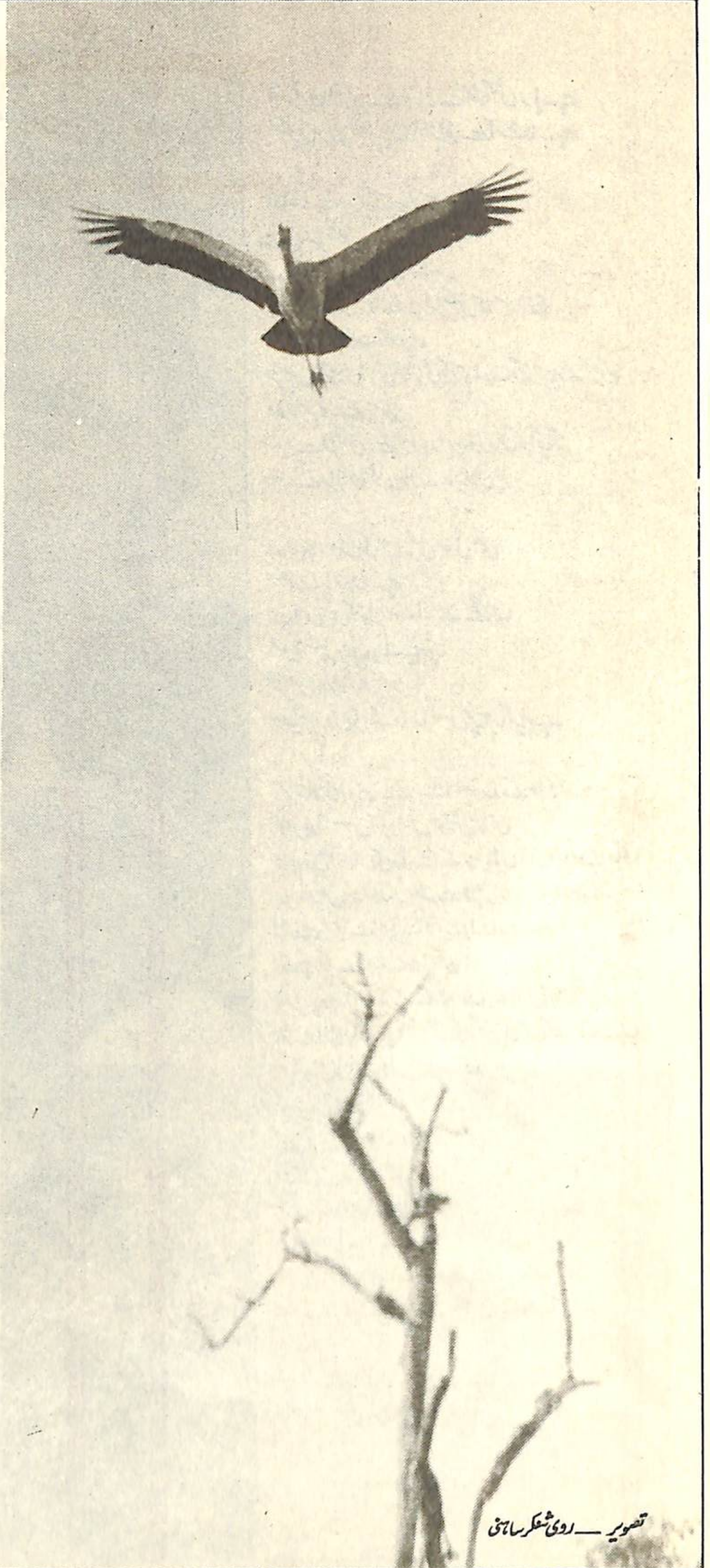
کچھ اس طرح سے بڑھا دِل میں ذوقِ آزادی
کہ رفتہ رفتہ تمنّا جوان ہوتی گئی
کچھ اس طرح سے اُٹھی ہر طرف سے وہ آندھی
جو اُٹھتے اُٹھتے خود اک آسمان ہوتی گئی

نگاہ کو تھی مگر میرِ کارواں کی تلاش
نظر جو اُٹھی تو دیکھا کہ ایک مردِ فقیر
کھڑا ہے حوصلۂ امن و آشتی لے کر
نہ کوئی خول بدن پر نہ ہاتھ میں شمشیر

چراغِ راہ میں اُس کے عمل سے جلنے لگے
لو آج صبحِ شبِ انتظار آ ہی گئی
فضا مہکنے لگی دِل نواز پھولوں سے
دیارِ ہند میں فصلِ بہار آ ہی گئی

جو آنکھ وا ہو تو ہر صاحبِ نظر کے لیے
متاعِ فکر ہے، رعنائیِ بیاں ہے اگست
سفر جو ہم نے ابھی طے کیا ہے مَر مَر کے
اُسی کے جہدِ مسلسل کی داستاں ہے اگست

سیّدہ شانِ معراج
ترن تسکی، نزد موہن نرسنگ ہوم۔ شاہجہانپور (یو۔ پی)



تصویر ــــ روی شنکر ساہنی

نظم



بشر قرن ہا قرن سے مبتلائے کشاکش رہا ہے
حقوق و فرائض کے ٹکراؤ سے آشنا ہے

تقاضا ہے یہ عہدِ نو کا
مقامِ فرائض ہے ارفع
ہے کس کی نظر کا کرشمہ
کہ نورِ دروں، کائناتِ فرائض کا سورج
دلوں میں چمکنے لگا ہے
فرائض کے تئیں ہستیِ اجتماعی کی تہذیب و تزئین کے آئین
مفاہیمِ نو کے پیمبر
کیا ہے فرائض نے حسنِ زمین و زماں کو اُجاگر
ہوئے راز روشن ہمارے دِلوں پر

ادھیکاروں کی جھیل مچلی ہوئی تھی
سکوں پا رہی ہے
اب اس میں کنول مسکرانے لگے ہیں
عمل مشعلِ دل بنا ہے
فرائض کا رخشاں سویرا
ادھیکاروں کی شب نما جھیل پر چھا گیا ہے

ہم ایثار کی ریت کے میت، اہنسا کے حامی،
نہیں راس آتی ہمیں خویش کامی
کہ ہم نوعِ انساں کی چاہت کے رسیا ہیں امن و اماں کے پیامی
ہمارا وطن دولت و عظمتِ فرض کا پاسباں ہے
اخوت، محبت، مروّت کا یہ راز داں ہے
ہے ہر ایک مذہب کا مسکن
بھرا ہے ہر اک طرح کے پھولوں سے اس کا دامن
ہمارے دل و جاں تپ کر لگن کی اگن ہی میں کندن ہوئے ہیں
حیات اپنی خوشدل ہوئی ہے
قریب اپنی منزل ہوئی ہے
مسائل جو راہِ وفا میں تھے حائل
وہ حل ہو رہے ہیں
کہ ہم ارتقا پر ہیں مائل
مفادِ بشر اپنا مشرب
ہمیں فرض کی اہمیت کی خبر ہے کہ ہم نے
تدابیرِ نو سے فراہم کیے ہیں سکوں کے وسائل

فضا اَب درخشندہ تر ہو گئی ہے
فرائض کا اُجلا سویرا ہے رخشاں
کنول مسکرانے لگے ہیں

کرشن موہن
158، پشپانجلی، دہلی

ذائقہ

آلو کے پراٹھے

اُبلے ہوئے آلو ــــ 4 عدد
باریک کتری ہوئی پیاز ــــ ایک عدد
باریک کترا ہوا ہرا دھنیا ــــ ایک ٹیبل اسپون
باریک کتری ہوئی ہری مرچیں ــــ 4 عدد
کھٹائی پسی ہوئی ــــ چائے کے 2 چمچ
پسی ہوئی مرچ ــــ چائے کا آدھا چمچ
ثابت زیرہ ــــ چائے کا ایک چمچ
گھی ــــ ایک ٹیبل اسپون

سب سے پہلے سادہ آٹا گوندھ کر رکھ لیں، آلوؤں کو چھیل کر کچل لیں۔ ایک برتن میں گھی گرم کریں اس میں پیاز اور زیرہ ڈالنے کے بعد کم سے کم تین منٹ تک تلیں پھر باریک کتری ہوئی ہری مرچ ڈالیں اور ایک منٹ تک تل لیں۔

آلو، نمک، ہرا دھنیا پسی ہوئی مرچ اور کھٹائی ڈالیں، اچھی طرح ملائیں، ایک منٹ تک پکائیں اور مکسچر کو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔

اب گندھے ہوئے آٹے کا ایک چھوٹا سا حصہ لیجئے تھوڑا پھیلایئے اور اس کے بیچ میں ایک ٹیبل اسپون آلو کا مرکب رکھئے۔ آٹے کے کناروں کو اوپر کی طرف کھینچ کر ملایئے اور مرکب کو ڈھک دیجئے۔ چکلے پر دبایئے، گولائی میں طشتری جتنا بڑا بیلئے۔ پراٹھے کو گرم توے پر ڈالئے، ایک یا دو منٹ تک سینکئے۔ ایک بار پلٹیں، ایک منٹ بعد کناروں کے چاروں طرف تھوڑا گھی ڈالیں۔ پھر پلٹئے اور دوسری طرف سے سینکئے جب دونوں طرف لال نشان اُبھر آئیں تو سمجھئے پراٹھا تیار ہے۔

باقی آٹے کے پراٹھے بھی اسی طرح تیار کر لیجئے۔

ٹماٹر رسم

ٹماٹر بڑے ــــ 3 عدد
املی کا پانی ــــ 3 ٹیبل اسپون
لیمن جوس ــــ ایک ٹی اسپون
پسی ہوئی ہلدی ــــ چائے کا $\frac{1}{2}$ چمچ
پسا ہوا زیرہ ــــ چائے کا ایک چمچ
پسی ہوئی لال مرچ ــــ چائے کا $\frac{1}{2}$ چمچ
ہینگ ــــ " " $\frac{1}{4}$ چمچ
گھی ــــ ایک ٹیبل اسپون
نمک ــــ ذائقے کے مطابق

پیسنے کے لیے سوکھا مسالہ

ثابت زیرہ ــــ چائے کا ایک چمچ
ثابت سوکھا دھنیا ــــ " " چمچ
ثابت کالی مرچ ــــ 8 دانے

آٹھ گلاس پانی اُبالیں ثابت ٹماٹر، املی کا پانی لیمن جوس، پسی ہوئی ہلدی، پسا ہوا زیرہ، پسی ہوئی لال مرچ ہینگ، نمک اور پسا ہوا سوکھا مسالہ ڈالیں پھر دس منٹ تک اُبالیں۔ ٹماٹروں کو چمچ سے کچلیں پھر دس منٹ تک اُبال کر گھی ڈال دیں۔ □



میرا تجربہ

شمشاد سراج، کلکتہ

مچھلی کے ٹکڑے پکانے سے پہلے اگر ایک گھنٹہ قبل لیموں ملے پانی میں ڈبو کر رکھ دیا جائے، تو تلنے کے بعد اس میں بساہند نہیں رہے گی اور مچھلی کا مزہ بھی بہت اچھا ہو جائے گا۔

○

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ڈیپ فریزر میں برف کے ٹرے چپک جاتے ہیں اور آسانی سے نکلتے نہیں، ایسی حالت میں ٹرے کے نیچے ایک پلاسٹک شیٹ رکھ دینے سے ٹرے چپکتے نہیں اور آسانی سے نکل آتے ہیں۔

○

اگر آپ سلائی مشین کے بابن کے اندر اور باہر دونوں حصوں پر نیل پالش لگا دیں گی، تو بابن کبھی زنگ آلود نہیں ہوگا۔

○

آپ کا بچہ دودھ پینے سے انکار کرتا ہے، تو اس کے سامنے ہی گلاس میں پہلے چاکلیٹ، پھر دودھ ڈالئے اور بچے سے کہئے کہ وہ دودھ پی کر چاکلیٹ نکال سکتا ہے۔ بچہ چاکلیٹ حاصل کرنے کے لالچ میں فوراً دودھ پی لے گا۔ یہ آزمودہ ہے۔

○

فریج کے اندرونی حصے کو صاف کرنے کے لئے سوڈا بائی کارب اور گرم پانی یا پانی اور سرکہ کا استعمال کرنا چاہئے۔ اس سے فریج کے اندر کی بدبو دور ہو جائے گی۔

○

کپڑوں میں بال پین کی روشنائی لگ جائے تو اسے نیل پالش رموور سے صاف کیا جا سکتا ہے۔

○

شیفون کی ساڑی میں تیل کا داغ لگ جائے تو داغ والے حصے میں ٹیلکم پاؤڈر کافی مقدار میں چھڑکنے کے بعد ساڑی کو تہہ کر کے رکھئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ساڑی سے پاؤڈر جھاڑ دیجئے۔ داغ ختم ہو جائے گا۔

چائے اور کافی کے داغ مٹانے کے لئے سب سے پہلے کپڑے کو صابن سے دھو لیجئے پھر دس منٹ تک گلیسرین اور پھر دس منٹ نمک کے پانی میں ڈبوئیے۔ داغ صاف ہو جائیگا ●

خاتون کراٹے فائٹر

سندیپ کنور

پ۔کے۔آریہ

کھینے کو تو عورت اب مردوں کے شانہ بشانہ رہ کر قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہے مگر وہ آج اتنی زیادہ غیر محفوظ بھی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ خواتین آج نہ گھر میں رہ کر محفوظ ہیں نہ باہر نکل کر۔ صبح، دوپہر، شام یا رات کو کبھی بھی اور کہیں بھی وہ غیر سماجی عناصر کی چپیٹ میں آکر اغوا، لوٹ، مار پیٹ اور زنا بالجبر تک کا شکار ہو سکتی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ سے لے کر ان کے استحصال تک کے بڑھتے ہوئے واقعات ہمارے سماج کے اخلاقی زوال کے گواہ ہیں۔

ایسے میں مارشل آرٹ جوڈو کراٹے ایسا ذریعہ ہے جس کے بل بوتے پر اس طرح کے حادثات کو ہونے سے روکنے اور ایک صحت مند سماجی ماحول کو پنپنے دینے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

کراٹے میں ماہر خاتون بغیر کسی ہتھیار کے نہ صرف خود کو بلکہ تمام خاندان والوں کو تحفظ دینے میں مددگار ہوتی ہے۔ جوڈو کراٹے آج کل دنیا بھر میں مقبول ہیں اور اس تنظیم کا ہیڈ آفس نیویارک (لندن) میں ہے۔ دلی میں اس کی پہلی شاخ آریہ سماج مندر گریٹر کیلاش II میں 1986ء میں قائم کی گئی تھی۔ یہاں لڑکیوں کو باقاعدہ طور پر کراٹے کی تربیت دی جاتی ہے اور ان کو تربیت دیتی ہیں محترمہ سندیپ کنور، جو کراٹے میں بلیک بیلٹ ہیں۔

سندیپ صاحبہ کا کہنا ہے کہ جس طرح ایک لڑکی کو اچھی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اسے کراٹے کی تربیت بھی لینی چاہیے۔ ویسے تو جوڈو اور کراٹے دونوں ہی جسمانی عمل کا کرشمہ ہیں لیکن جہاں جوڈو میں دشمن کی طاقت کا اندازہ کر کے اسے پٹخا جاتا ہے، وہیں کراٹے میں تکنیک، دل اور جسم کے یکسوئی کے ساتھ استعمال سے معمولی سے حملے کے ذریعے مخالف کو چوٹ پہنچائی جاتی ہے۔ کراٹے کی ماہر لڑکی اپنے سے دوگنے آدمی کو ایک لمحہ میں زمین سُنگھا سکتی ہے۔ ہتھیاروں سے لیس نہ ہونے پر بھی، بغیر چوٹ کھائے دشمن کو ہرانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ بس آپ کو صرف ایک داؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دشمن آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا۔

کالج کی طالبات اور لڑکیوں کیلئے کراٹے سیکھنا بے حد ضروری ہے۔ نوکری پیشہ لڑکی، ٹیچر، وکیل، صحافی اور اکثر باہر رہنے والی خواتین کے لئے کراٹے کسی نعمت سے کم نہیں۔

کراٹے خود اعتمادی اور انحصاری کا اولین پائیدان ہے۔ کراٹے میں تربیت یافتہ خاتون ناپسندیدہ حادثے کے وقت کسی مرد کی مدد کی محتاج نہیں رہتی بس اس کو کراٹے کے داؤ پیچ سیکھنے اور انھیں وقت پر بے جھجک استعمال کرنے کا گر چاہیے۔

کراٹے کے حملوں کو پانچ درجوں میں رکھا گیا ہے۔ پہلے درجے کے واروں سے آہستہ درد پیدا کر کے مخالف کو پریشان کیا جاتا ہے۔ ضرورت کے تحت تھوڑے سے درد سے مخالف کے حوصلے کو توڑ کر اپنی حفاظت کی جاتی ہے۔ دوسرے درجے کے حملوں سے اتنا درد پیدا کیا جاتا ہے کہ حملہ آور سب کچھ بھول کر جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا اسے لمبے عرصے تک کے لئے بے بس کر دیا جاتا ہے۔ تیسری طرح کے حملے سے مخالف بیہوش ہو سکتا ہے۔ سُن کرنے والے حملے کچھ لمحوں سے لے کر گھنٹوں تک پُر اثر رہتے ہیں۔ سب سے زبردست وار





نلی مارہے جو انسان کو فالج زدہ بنا دیتا ہے۔ پانچواں طریقہ مارنے کا ہے۔

کراٹے کی کھلاڑی خاتون، ماربل اسٹون، لکڑی کے تختے، اینٹیں، برف کی سلی وغیرہ ہاتھ کے حملے سے پل بھر میں توڑ سکتی ہے۔ اس طرح کا اچھا مظاہرہ صرف تربیت کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ جسمانی طور سے کمزور لوگوں میں خود اعتمادی بڑھانے کے لئے ہے۔ اس طرح کے کرتبوں کے لئے ہاتھوں کو سخت مشق کے ذریعہ مضبوط بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ کراٹے لفظ دو لفظوں کو ملانے سے بنا ہے۔ 'کرا' یعنی خالی اور 'ٹے' یعنی ہاتھ۔ مطلب یہ کہ خالی ہاتھوں سے لڑا جانے والا لڑائی کا فن۔ اس کھیل کے کھلاڑی اپنے ہاتھوں پیروں کو ہی مشق کے بعد ہتھیاروں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ڈسپلن، کردار کی تعمیر ذاتی تحفظ اور پوری صحت کے لئے کراٹے بہترین کھیل ہے۔ محترمہ کنور کے مطابق جو بچے کراٹے سیکھ رہے ہیں۔ تعلیم اور ڈسپلن کے معاملے میں اپنے ہم عمر بچوں سے کہیں آگے ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق کھیل میں دلچسپی رکھنے والے بچے، ذہین اور اپنے کاموں کو وقت پر نپٹانے والے ہوتے ہیں۔ کراٹے کے کھلاڑی بچے ہنس مکھ، پرسکون ہوتے ہیں ان میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ کراٹے سیکھنے والی لڑکیاں چڑچڑاہٹ اور غصے سے دور رہتی ہیں۔ یہ ہنر شادی شدہ عورتیں بھی سیکھ سکتی ہیں اس سے گھریلو کاموں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ کام اور اچھے ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ محترمہ سندیپ بتاتی ہیں کہ ان کی شادی کو چھ سال ہو گئے

> کراٹے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے "کرا" یعنی "خالی" اور "ٹے" یعنی "ہاتھ" مطلب یہ کہ خالی ہاتھوں سے لڑا جانے والا لڑائی کا فن۔

ہیں ان کا چار سال کا بچہ بھی جوڈو کراٹے سیکھ رہا ہے۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے صبح اور شام ورزش کرتی ہیں۔ کھانے میں سادہ کھانے یعنی سبزیوں کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ اب تک کئی سو لڑکیوں کو اس میدان میں تربیت دے چکی ہیں۔ مودی نگر، کرناٹک، رشی کیش، اجمیر، شملہ، دہلی، مہاراشٹر، پانڈیچری میں کئی بار اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہیں اور انعام پا چکی ہیں۔ اپاہج، گونگی اور بہری لڑکیاں بھی کراٹے سیکھ سکتی ہیں۔ جو عورت حاملہ ہو اسے کراٹے نہیں کھیلنا چاہیے۔



خواتین کا پسندیدہ زیور

چوڑیاں

نشا شرما

چوڑیاں خواتین کا ایک ایسا زیور ہے جسے صدیوں سے استعمال کیا جارہا ہے دیہی اور قبائلی علاقوں میں تو یہ آرائش و سنگھار کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ اس کا چلن کس نے شروع کیا تاہم یہ سچ ہے کہ اس کا چلن روزافزوں ہے۔

چوڑیاں مختلف طریقوں سے بنائی جاتی ہیں۔ شروع میں ہاتھی دانت کی چوڑیاں بھی بنتی تھیں جو آج کل مشکل سے نظر آتی ہیں کیونکہ ہاتھی دانت بہت مشکل سے ملتا ہے ان دنوں لڑکیوں میں کانچ کی چوڑیوں کا چلن ہے جب کہ خواتین لاکھ کی چوڑیاں جو ان کے سہاگ کی علامت ہے، پہنتی ہیں۔ دولت مند طبقے میں سونے، ہیرے اور موتیوں کی چوڑیوں کا چلن بھی ہے۔

بیشتر کانچ کی چوڑیاں آگرہ کے قریب ایک شہر فیروز آباد میں بنائی جاتی ہیں۔ دلّی میں بھی چوڑیوں کے کارخانے ہیں۔

خواتین چوڑیوں کی پرکھ اس کی کوالٹی سے کرتی ہیں کچے کانچ سے بننے والی چوڑیاں زیادہ مضبوط نہیں ہوتیں لیکن نئے ڈیزائن، ہلکی، پتلی اور مینے کے کام والی چوڑیوں کو شہروں اور قصبوں کی دوشیزائیں اور دلہنیں کچھ زیادہ ہی پسند کرنے لگی ہیں۔ یہ چوڑیاں موٹی و مضبوط چوڑیوں کے مقابلے مہنگی ہوتی ہیں۔ ان دنوں شہروں اور قصبوں میں منیہار کی ہر دکان پر ایسی چوڑیوں کی بہتات ہوتی ہے۔ کوئی بھی عورت ایک درجن چوڑیوں سے کم پہننا پسند نہیں کرتی۔ نوبیاہتا عورتیں تو دونوں کلائیوں میں اُنیس اُنیس چوڑیاں پہن کر اپنے پریتم کے



سامنے آکر کھنکھانے سے نہیں چوکتی ہیں۔

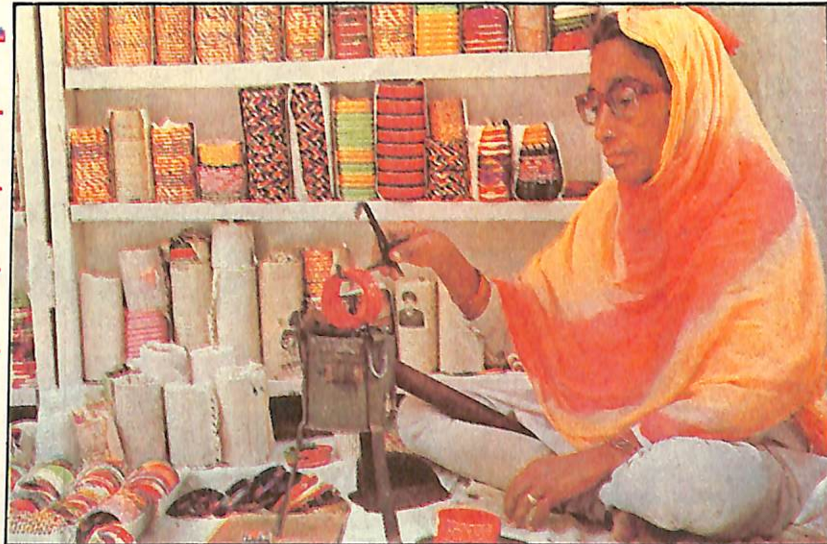
مارواڑی اور قبائلی علاقوں کی عورتیں لاکھ کی چوڑیاں پہنتی ہیں۔ ان علاقوں میں ہی لاکھ کی چوڑیاں بنتی ہیں اور چوڑی سازی یہاں کا ایک روائتی کاروبار ہے یہاں کے چوڑی سازوں کے گھروں کا بچہ بچہ اس کام کو آسانی سے کرلیتا ہے۔ اس کے لیے اُسے کسی طرح کی تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ دن رات اپنے گھر میں یہ کام ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنعت میں لگے ہوئے افراد زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے۔ وہ شروع سے ہی اس دھندے میں لگ جاتے ہیں اور انہیں روزی روٹی کمانے کا ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے ایسی صورت میں والدین بھی ان کی تعلیم پر توجہ نہیں دیتے۔ ان چوڑیوں کی بکری کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ گاؤں کے ہر گھر میں ان کے بغیر عورتوں کا سنگھار ادھورا ہے۔ اس لیے اس صنعت سے وابستہ افراد دیہات میں ہی زیادہ تعداد میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ کمزور طبقے کے ہوتے ہیں گھر کی الماری میں ہی اپنا مال رکھتے ہیں اور گاہک کو دکھلا دیتے ہیں۔

چوڑی صنعت کا مستقبل اچھا ہے کیونکہ اس کی مانگ آئندہ بھی برقرار رہے گی۔ جدید کاری کی وجہ سے چوڑی صنعت مہنگی ضرور ہو سکتی ہے لیکن اس کا چلن بند ہونے والا نہیں ہے۔

بیشتر ریاستی حکومتیں چوڑی صنعت کو چھوٹی صنعت کے زمرہ میں رکھتی ہیں۔ ایسی ریاستوں میں چوڑی کی صنعت شروع کرنے والوں کو بینک سے قرض لینے کی سہولیات بھی دی جاسکتی ہیں۔ تاہم شعبۂ صنعت، اور بینکوں کے افسران نے اس صنعت کی جانب توجہ نہیں دی اور اس میں لگے ہوئے افراد کی ترقی کے بارے میں سوچا تک نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ صنعت بغیر کسی مزاحمت اور خطرے کے پنپ رہی ہے اور تہذیبی وراثت میں اضافہ کر رہی ہے۔

تمام ریاستی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ اس صنعت کے لیے ترقیاتی منصوبے بنائیں، اس صنعت میں لگے خاندانوں کو تعلیم و تربیت دلائیں اور چوڑیوں کی تجارت کے لیے نئے نئے دروازے کھولیں کیونکہ اس صنعت سے غیر ملکی کرنسی بھی حاصل کی جاسکتی ہے اور یہ صنعت ساری دنیا میں مقبولیت حاصل کر کے ہندوستانی زیور یعنی چوڑیوں کو وقار بھی دلا سکتی ہے۔

چوڑیوں کی صنعت میں لگے ہوئے لوگ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے وہ شروع سے ہی اس دھندے میں لگ جاتے ہیں اور انھیں روزی روٹی کمانے کا ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے۔



کفایت سے گرہستی

مسز رمن



مہنگائی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے وہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آمدنی بڑھانا اگر مردوں کا کام ہے تو بڑھتی مہنگائی میں اخراجات میں توازن برقرار رکھنا گرہستن کی ذمہ داری۔

کھانے اور کپڑے کے بعد سب سے زیادہ خرچ یا فضول خرچی ایندھن کی ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر گھڑ عورت کو چاہیے کہ وہ غیر ضروری طور پر گیس نہ جلنے دے اور ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھے کہ ان حساس اور نازک آلات سے کوئی حادثہ نہ ہونے پائے۔ اسٹوو اور گیس کا چولہا صاف رہے اور اس سے کسی قسم کی بدبو نہ پھیلنے پائے۔

آج بھی بہت سے گھروں میں مٹی کے چولہے ہیں تو ایسا انتظام رکھیں کہ جلاتے وقت ان کی حرارت بیکار نہ جانے پائے۔ چولہے کے پیچھے کی جانب ایک چھوٹا سا سوراخ بنالیں جس سے دال و سبزی پکتی رہے اور برتن دھونے کے لیے پانی بھی گرم ہوتا رہے۔ ان دنوں عموماً تمام صوبائی حکومتوں نے ایسے مخصوص چولہوں کو رواج دیا ہے جن میں لکڑی جلانے سے زیادہ کام ہو سکتا ہے۔ ان چولہوں کو بنانے کا طریقہ قریب کے دیہی اصلاح کے محکمے سے سیکھا جا سکتا ہے۔

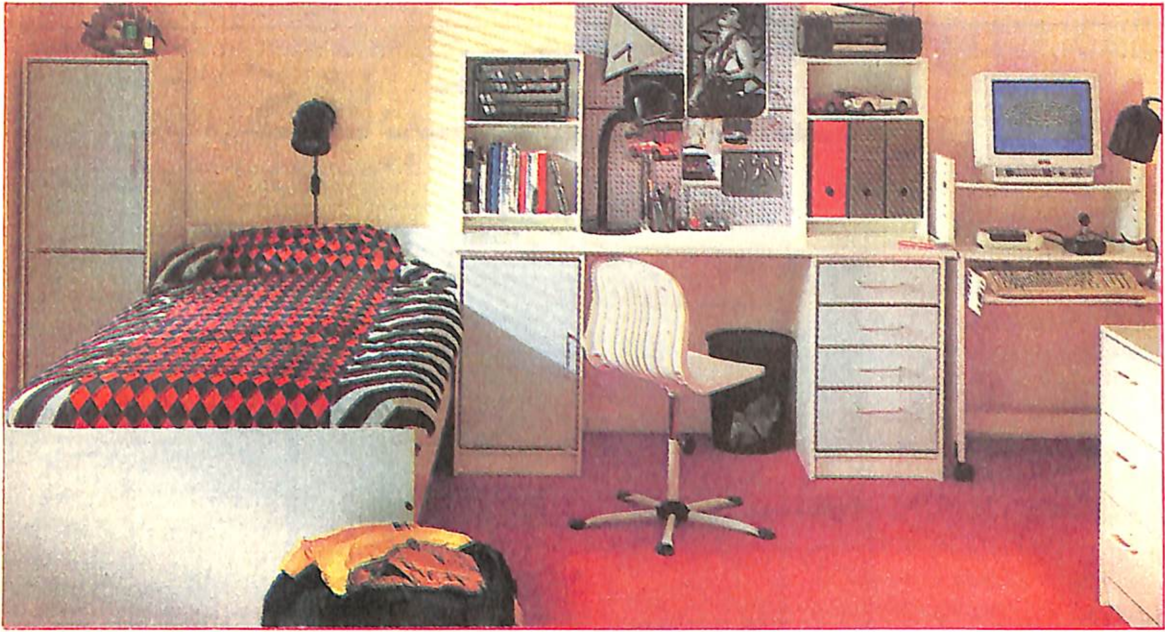
دورِ جدید میں اب کوئی عورت گھر پر ہاتھ کی چکی کا استعمال نہیں کرتی لیکن عورتوں کے لیے ہاتھ کی چکی سے بڑھ کر اور کوئی کسرت نہیں ہو سکتی۔ دو عورتیں مل کر گھر پر چکی پیسیں تو روز کے خرچ کے لیے آٹا آسانی سے پیسا جا سکتا ہے، ساتھ ہی ہاضمہ بھی درست رہے گا اور بغیر تکلیف کے بچے کی پیدائش جیسے فوائد بھی حاصل ہو جائیں گے۔ بازار کے آٹے سے گھر پر پیسا گیا آٹا صحت کے لیے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ بازار کے مسالوں میں ملاوٹ ہوتی ہے لیکن انھیں بھی دھو کر اور سکھا کر چکی پر پیسا جا سکتا ہے اس طرح گھر پر پیسے گئے مسالے جہاں بازاری مسالوں کے مقابلے میں سستے ہوتے ہیں وہیں زیادہ صاف اور اصلی ہوتے ہیں۔

اس زبردست مہنگائی میں بچت کرنے کے لیے کپڑے سینے اور دھونے کا انتظام بھی گھر پر ہی ہونا چاہیے۔ آج کل دھوبی سوڈا، صابن لگانے کے جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے پانی میں تیزاب ڈال کر ہی کپڑے دھوتے ہیں تیز مسالہ اور کھولتے پانی میں بری طرح پٹائی سے کپڑوں کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ گھر پر دھلائی اور پریس کرنے سے کپڑوں کی زندگی تو بڑھتی ہی ہے ساتھ ہی خاصی رقم بھی بچ جاتی ہے۔ اگر رہن سہن سادہ ہو تو گھر پر ہی کام چلاؤ کپڑے بھی سیئے جا سکتے ہیں۔ بچوں کے کپڑے تو نہایت آسانی سے سیئے جا سکتے ہیں۔ بلاؤز، فراک، انڈر ویئر، پیٹی کوٹ، بنیان، کرتا، پاجامہ وغیرہ کی سلائی میں کسی طرح کی دقت نہیں ہوتی۔ بڑے کپڑوں کے پرانے ہو جانے پر ان کا پھٹا ہوا حصہ نکال کر بقیہ حصوں سے کئی طرح کے چھوٹے کپڑے تیار کیے جا سکتے ہیں۔

گھر پر خالی جگہ، چھت پر بڑے گملوں یا ناند وغیرہ میں ہر موسم کی سبزیاں بھی اگائی جا سکتی ہیں۔ بازار میں گندے نالے کی سینچائی کیڑا مار دواؤں اور کیمیاوی کھادوں کی بھرمار سے بازار کی سبزیاں نقصاندہ بن جاتی ہیں۔ اس لیے گھر پر اگائی گئی سبزیاں جہاں سستی پڑتی ہیں وہیں صحت کے لیے بھی فائدے مند ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیکھ بھال اور کھاد و پانی کے انتظام سے گھر پر ہی من پسند موسمی سبزیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح فریج اور مکسی کو استعمال کر کے وقت اور پیسے کی بچت کی جا سکتی ہے۔ فریج میں محفوظ کر کے صبح کا بچا ہوا کھانا رات میں اور رات کا بچا ہوا کھانا صبح کو کھایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سویابین یا تل کو بھگو کر اور پیس چھان کر گھر پر ہی دودھ بنایا جا سکتا ہے جو بازار کے ملاوٹی دودھ کے مقابلے میں زیادہ عمدہ اور سستا پڑتا ہے۔ چنا، گیہوں، بادام اور دالوں کو بھگو کر استعمال کیا جائے تو ان سے زیادہ پروٹین حاصل ہوں گے۔ مکسی تو زیادہ مہنگی نہیں آتی لیکن فریج بہت مہنگا ہوتا ہے اس لیے گھڑے کا استعمال اچھا بھی ہے اور سستا بھی۔ گھڑے کو گیلے کپڑے میں لپیٹ کر کھلی جگہ میں رکھنے سے بھی وہ نصف فریج کا کام کرتا ہے۔

خاندان کے تعلیم یافتہ افراد اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد رات میں یا صبح کو اپنے بچوں کو پڑھا سکتے ہیں۔ اس سے ٹیوشن کے پیسے بچائے جا سکتے ہیں۔ تفریح کے لیے سستا ٹی وی یا ریڈیو خرید کر سینما کے اخراجات بچائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ٹی وی پر کردار کو بگاڑنے والی فلمیں بچوں کو نہ دیکھنے دی جائیں۔



موسم برسات کے خلاف

گھریلو مورچہ

ریکھا سکسینہ

برسات کا سہانا موسم اور رم جھم رم جھم پھواروں کی مدھر موسیقی جہاں ہر شخص کے دل میں مسرت بھر دیتی ہے۔ وہیں گھریلو عورتوں کو اس موسم میں کئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ذرا سی لاپرواہی ہوئی نہیں کہ کوئی چیز خراب ہو جاتی ہے اس لئے پوری طرح چوکس رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور گھریلو سازو سامان کا پورا پورا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔

ایسے موسم میں پیدا ہونے والے عام مسائل کے حل پیش کئے جا رہے ہیں جن کو عمل میں لا کر آپ بھی فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔

- اگر ڈرائنگ روم کی کھڑکی باہر کی طرف کھلتی ہو اور اس راستے بارش کا تھوڑا بہت پانی آنے کے امکانات ہوں تو اپنے قالین وغیرہ کی حفاظت کے لئے اسے تہہ کر کے کسی محفوظ مقام پہ رکھ دیں۔ ورنہ پانی اور سیلن سے وہ خراب ہو سکتا ہے۔ کمرے میں پانی وغیرہ آنے کا ڈر نہ بھی ہو تو بھی قالین کو نیچے کی سیلن سے بچانے کے لئے اخباروں کی دو تین تہیں بچھا دیں۔ زیادہ اچھا تو یہ ہوگا کہ قالین اٹھا دیں کیونکہ گیلے جوتے اور چپلوں وغیرہ سے اس کے خراب ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔
- اونی و ریشمی کپڑوں کو جو عموماً ان دنوں استعمال میں نہیں آتے، کسی الماری یا صندوق میں اس طرح سنبھال کر رکھ دیں کہ ان پر سیلن اثر نہ کرے، صندوق، الماری وغیرہ میں بھی اخباروں کی تہہ بچھا دیں اور کپڑوں کے چاروں طرف کیڑوں سے حفاظت کے لئے نیفتھلین کی گولیاں ڈال دیں۔
- کمروں وغیرہ کو عام دنوں کی بہ نسبت زیادہ دیر تک کھلا رکھیں تاکہ زیادہ دھوپ اور ہوا پہونچے اور سیلن اپنا قبضہ نہ جما سکے۔
- جوتے وغیرہ اگر بارش میں بھیگ جائیں تو انہیں سیدھے دھوپ میں سکھانے کی بھول نہ کریں کیونکہ اس سے ان کی شیپ خراب اور رونق ختم ہو جاتی ہے۔ گیلے جوتوں میں اخبار ٹھونس ٹھونس کر بھر کے کچھ دیر تک انھیں یوں ہی رکھا رہنے دیں۔ کاغذ پوری نمی جذب کر لے گا۔
- چمڑے کی چیزوں اور کتابوں کی اُن جلدوں پر جن پر چمڑے کی جلد چڑھی رہتی ہے ان دنوں اکثر پھپھوندی لگ جاتی ہے۔ اس سے حفاظت کے لئے ویسلین کی ہلکی پالش کر دیجیے۔ ایسی چیزوں پر سے پھپھوندی ہٹانے کے لئے فلالین کے ٹکڑے کو انڈے کی زردی اور دودھ کے مرکب میں بھگو کر پھپھوندی کے اوپر رگڑیں۔ پھپھوندی صاف ہو جائے گی۔
- برسات کے موسم میں نمی کے سبب دروازوں اور کھڑکیوں کے کیواڑ پھول جاتے ہیں اور تھوڑی پریشانی سے بند ہوتے ہیں۔ اس پریشانی سے بچنے کے لئے ان کے سروں پر تھوڑا سا موم رگڑ دیں۔
- لوہے کی بنی ہوئی چیزوں پر ان دنوں بہت جلد زنگ لگ جاتا ہے اس لئے ان پر سرسوں کے تیل کی ہلکی سی تہہ چڑھا دیں۔ زنگ لگ جانے کی صورت میں ان چیزوں کو مٹی کے تیل میں ڈالدیں اور کچھ وقت بعد کسی سوکھے کپڑے سے رگڑ دیں۔ زنگ صاف ہو جائے گا۔
- کپڑے سکھانے کے لئے اگر آپ لوہے کے تار کا استعمال کرتی ہیں تو اسے ہٹا کر وہاں پلاسٹک کی ڈوری باندھیں ورنہ لوہے کے تار پر سکھانے کے لئے ڈالے گئے کپڑوں پر زنگ کے نشان آنے کا خطرہ رہتا ہے۔

بسکٹوں کو سیلن سے بچانے کے لئے انھیں ایئر ٹائٹ ڈبوں میں ہی رکھیں، ڈبوں کے اندر نیچے اور چاروں طرف بلاٹنگ پیپر رکھ دیں۔ اسی طرح نمک کو بھی بند ڈبوں میں رکھ کر تھوڑے سے چاول کے دانے اندر رکھ دیں۔ سیلن سے بچا رہے گا۔

- مسالے، کافی یا اسی طرح کی دوسری چیزیں ٹین کے ڈبے میں نہ رکھیں ورنہ زنگ لگنے کے سبب ان کے خراب ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔ ان کی جگہ پر آپ شیشے کے جار کا استعمال کر سکتی ہیں۔ یا پھر ایسی چیزوں کو پولیتھین کی تھیلیوں میں بھر کر ان ڈبوں کے اندر رکھ دیں۔
- اس موسم میں کچھ دن رکھا رہنے پر سرسوں کے تیل میں ایک عجیب سی بدبو آنے لگتی ہے ایسے تیل کو کڑھائی میں ڈال کر آنچ پر رکھیں، اس میں نمک میں لپٹے املی کے کچھ ٹکڑے ڈال کر ایک دو بار کھولائیں، ٹھنڈا ہونے پر تیل کو چھان لیں۔ تیل میں بدبو نہیں رہے گی۔ اسی طرح دیسی گھی میں دہک آنے پر اسے نیبو کی پتیاں ڈال کر گرم کریں۔

● سوکھے اچاروں کو پھپھوندی سے بچانے کے لئے اس میں ہینگ کی ڈلی رکھدیں، تیل والے اچار کے مرتبان کو تیل سے اوپر تک بھردیں اور ہفتے میں ایک بار دھوپ دکھادیں۔

● پیتل کے برتنوں پر اس موسم میں دھبے پڑ جاتے ہیں اُنھیں دور کرنے کے لئے برتنوں کو نیبو کے چھلکوں سے صاف کر کے سوکھی راکھ سے رگڑیں صاف ہوجائیں گے۔

● خط لیٹر بکس میں ڈالنے سے پہلے پتے کے اوپر موم بتی گھس دیں۔ پتہ بارش میں دھلے گا نہیں۔

ایسے دنوں میں کچن میں اکثر کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہوجاتی ہے۔ پانی میں پھٹکری گھول کر کچن دھوڈالیں۔ کیڑے مکوڑوں سے چھٹکارا ملے گا۔ اگر ایک بار کامیابی نہ ملے تو دو تین دن بعد یہی عمل دوہرائیں۔

● فرش وغیرہ پر کائی جم جانے کی حالت میں تھوڑا سا چونا چھڑک کر رگڑیں۔ کائی صاف ہوجائے گی۔

گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ صحت کی دیکھ بھال بھی انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ برسات کے موسم میں بیماریاں سب سے زیادہ پھیلتی ہیں اور فضا میں درجہ حرارت گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ جس کا براہِ راست اثر جسم پر پڑتا ہے۔ اس موسم میں صحت سے متعلق جو مسائل سامنے آتے ہیں وہ اس طرح ہیں۔ بھوک کم لگنا یا کبھی کبھی بالکل نہ لگنا، گلا خراب ہوجانا، پھوڑے پھنسیاں نکلنا، زکام ہونا، داد کھجلی ہونا، پیچش یا پیٹ خراب ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ وبائی بیماریاں جیسے ہیضہ و ملیریا وغیرہ کے بھی پھیلنے کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی اور متعلقین کی صحت کے تئیں بہت چوکنی رہیں اور خاص کر کھانے پینے کو متوازن رکھتے ہوئے ہوشیاری سے کام لیں۔

یہاں نیچے کچھ ایسے مشورہ پیش کئے جارہے ہیں۔ جنھیں دھیان میں رکھ کر انسان اپنی صحت کی حفاظت کرسکتا ہے۔

● روزانہ کم سے کم ایک نیبو اور لال مرچ کی جگہ کالی اور ہری مرچوں کا استعمال کریں۔

● باسی غذا کا استعمال بھول کر بھی نہ ہو اور نہ ہی کاٹ کر رکھے ہوئے پھل وغیرہ استعمال میں لائے جائیں۔

● تلی ہوئی چیزیں یعنی پکوڑیاں، پوریاں، کچوریاں وغیرہ سے پرہیز کریں اور کوشش کریں کہ غذا زود ہضم ہو۔

● میٹھی چیزوں کی جگہ نمکین چیزوں کو غذا میں اولیت دیں اور پیاز، لہسن، چٹنی، دہی کا رائتہ اور پودینہ وغیرہ کا پابندی سے استعمال کریں۔

● بازار میں تیار کی گئی چیزوں سے پرہیز رکھیں۔

● کھانا ٹھونس، ٹھونس کر نہ کھائیں اور کبھی پیٹ میں کچھ گڑبڑ محسوس ہو تو فاقہ کرلیں۔

باسی اور رکھا ہوا پانی استعمال میں نہ لائیں کیونکہ اس موسم میں پانی جلدی خراب ہوجاتا ہے اور ہینڈپمپ کا پانی بھی استعمال میں نہ لائیں۔ نل کا پانی مہیا نہ ہو تو ہینڈپمپ کا پانی اُبال کر ہی استعمال کریں۔

● اپنے گھر کو مچھروں، مکھیوں اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رکھیں، ضرورت ہو تو جراثیم کش دوا چھڑک کر انھیں ختم کردیں۔

> **برسات کے موسم میں صحت سے متلق جو مسائل سامنے آتے ہیں ان میں بھوک نہ لگنا گلا خراب ہونا، پھوڑے پُھنسیاں نِکلنا، زکام ہونا، داد کھُجلی ہونا، پیچش یا پیٹ خراب ہونا ہیں۔ ہیضہ و ملیریا بھی عام طور پر پھیل جاتا ہے۔**

● ان دنوں سبزیوں میں جراثیم اور کیڑے پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اس لئے سبزی کو کاٹنے کے بعد پوٹاشیم پرمیگنیٹ ملے پانی میں کچھ دیر پڑا رہنے دیں۔ اور پھر اچھی طرح دھوکر پکائیں۔

نہانے کے پانی میں ایک نیبو کا رس ملاکر نہائیں اس سے جسم میں پھرتی پیدا ہوگی اور جلد پر نکھار بھی آئے گا۔

چونکہ ایسے موسم میں صبح گھومنے جانا تو روز ممکن نہیں ہوتا اس لئے گھر پر کسی مناسب مقام پر تھوڑی بہت کسرت پابندی سے کرلیا کریں لیکن جب بارش نہ ہو رہی ہو تب ٹہلنے جایا جاسکتا ہے۔

بھیگے یا سیلے ہوئے کپڑے نہ پہنیں ایسے کپڑوں کو پہنے رہنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس موسم میں کپڑے کچھ موٹے ہی پہنیں۔

● رات کو سوتے وقت کوئی کپڑا ضرور اوڑھ لیں۔

سردی لگ جانے یا زکام کھانسی کی شکایت ہونے پر ادرک کی چائے پئیں۔

نہانے کے لئے نیم والا جراثیم کش صابن استعمال کریں۔ اس سے جلد کی بیماریوں سے حفاظت رہتی ہے۔

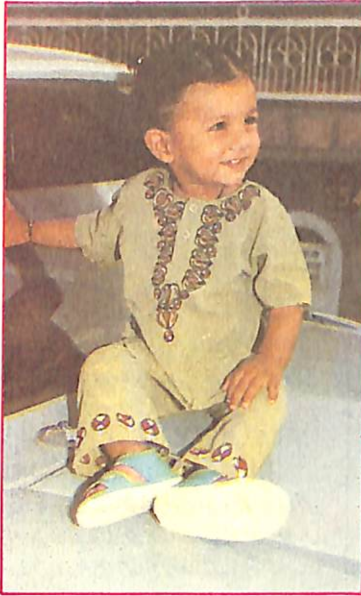
گھر کی صفائی کا دھیان زیادہ رکھیں، غسل خانہ، پائخانہ اور نالیوں وغیرہ کو پابندی سے فنائل سے صاف کرائیں۔

بارش میں بھیگے ہوئے جوتے، چپل نہ پہنے رہیں۔ بلکہ کھلا ہوا سینڈل استعمال کریں۔

● گھر میں اور آس پاس کہیں بھی پانی اکٹھا نہ ہونے دیں۔ ورنہ مچھر پیدا ہوں گے۔

مندرجہ بالا باتوں کا دھیان رکھتے ہوئے اپنی صحت کے تئیں پوری چوکسی کی ضرورت ہے۔





ننّھے منّوں کے کپڑوں پر

خوبصورت ڈیزائن

وینا گپتا

آج کل بچّوں کے کپڑے بازار سے خریدنے جائیں تو زیادہ تر لباس پر فیبرک پینٹ کیا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے کپڑے سادہ ہونے پر بھی بہت خوبصورت لگتے ہیں۔ لیکن ان کی قیمت معلوم ہونے پر عام طور سے جیب خریداری کی اجازت نہیں دیتی۔ لیکن دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں بس تھوڑی سی محنت آپ کے بچّے کے کپڑوں کی کایا ہی پلٹ سکتی ہے آپ کی سہولت اور آسانی کے لیے کچھ نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

سامان

سامان کے نام پر آپ کو صرف مختلف رنگوں میں فیبرک پینٹ اور باریک برشوں کی ضرورت پڑے گی۔ پنسل تو آپ کے پاس ہوگی ہی۔

نمونہ اُتارنے کا طریقہ

مرضی کے کپڑے پر سب سے پہلے آپ پنسل کے ذریعے اپنی پسند کا کوئی نمونہ اُتار لیں ایسا کرنا مشکل لگتا ہو تو کسی سے بنوالیں یا پھر ٹریسنگ پیپر کی مدد سے چھاپ لیں۔

رومپر پر بیٹھی ہوئی بلّی

لال چیک کے یوک اور جیبوں والے اس سفید رومپر پر بنی بلّی سے اس کی خوبصورتی دوگنی ہو گئی ہے آپ تصویر کی مدد سے یوک کے بیچوں بیچ پنسل سے بلّی چھاپ لیں جس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی $13\frac{1}{2}$ اور اونچائی 7 سینٹی میٹر ہو۔

بلّی کے چہرے، اگلے اور پچھلے حصّے کو سفید رنگ سے بھریں، منہ لال اور آنکھیں کالے رنگ سے بنائیں پچھلے حصّے میں بنی گول شکل کو لال، درمیان میں بندھے ہوئے کپڑے کو ہرے رنگ سے بھریں۔ اس کے اوپر بنی "بو" کے درمیان کے چوکور کو لال اور دونوں طرف کے حصّے کو ہرے رنگ سے بھریں۔ بھرے ہوئے تمام حصوں کی آؤٹ لائن کالے سے بنائیں۔ مونچھوں کے بال بھی کالے رنگ سے بنائیں دونوں جیبوں پر بلّی کا صرف چہرہ بنالیں۔

کُرتے پاجامے پر بیل

خاکی رنگ کے کرتے پاجامے پر بیل کا نمونہ پینٹ کرنے سے اس کی خوبصورتی بڑھ گئی ہے۔ کرتے پر پتّوں اور دائروں والی بیل چھاپی گئی ہے اور پائنچوں پر صرف دائرے بنائے گئے ہیں۔ اس کو چھاپنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی گتّے یا موٹے کاغذ پر پسند کے مطابق ناپ کے پتّے اور دائرے بنا کر کاٹ لیں۔ پہلے کرتے کے گلے اور پٹّی کے ساتھ ساتھ پتّے اور پھر تصویر کی مدد سے گولے چھاپ لیں۔

ہر ایک پتّے کے درمیان کالے رنگ سے پتّی کی تصویر بنائیں۔ درمیان میں لال لکیر کھینچ کر اس کی آؤٹ لائن کالے رنگ کی بنا کر اس کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف سفید اور لال لکیریں کھینچیں۔ گولوں کو لال رنگ سے چار حصّوں میں تقسیم کریں۔ دو حصوں میں سفید رنگ سے اور ایک ایک حصّے کو لال اور زعفرانی رنگ سے بھریں۔ باہری لائن کالے رنگ سے بنائیں۔ پائجامے پر بنائے گئے دائروں کو کالے رنگ سے چار حصّوں میں تقسیم کر کے آمنے سامنے کے دو حصّے سفید اور دو حصّے لال رنگ سے پُر کریں... آؤٹ لائن کالے رنگ سے بھریں۔



ٹی شرٹ پر کھیلتے بچّے

اس نمونے کو صرف لکیروں کے ذریعے ہی بنایا جا سکتا ہے۔ نمونے کو چھاپ کر الگ الگ حصّوں کو خواہش کے مطابق تقسیم کر کے لکیروں سے پینٹ کریں۔ بالوں کو کالے رنگ سے بھر دیں، بیلٹ، جوتے، موزے وغیرہ بھی مختلف رنگوں سے بھر کر بنائیں۔ نمونے کی خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے نیچے کی طرف اور ہرے رنگ کی باریک لکیروں سے گھاس کی شکل دے دیں۔ سامنے سے دائیں طرف اور اُوپری حصّے میں آسمانی باریک لکیروں سے پٹّیاں بنائیں۔ سامنے کی پٹّی کو بائیں طرف کاٹتے ہوئے اسی طرح ایک پٹّی اور بنائیں باریک لکیروں کے درمیان میں ایک موٹی لکیر لال رنگ سے بنائیں۔



خواتین اور ہماری جنگ آزادی

ڈاکٹر رضیہ حامد



سروجنی نائیڈو



راجکماری امرت کور



کملا نہرو



میڈم بھیکاجی کاما



اینی بیسنٹ

اس روئے زمین پر انسانی تہذیب کے ارتقائ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ہمارا ملک ان چند ملکوں میں سے ایک ہے جو آج سے پانچ۔ چھ ہزار سال پہلے علوم وفنون، فلسفہ اور روحانیت کے مرکز تھے۔ سرزمینِ ہند کی آغوش میں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب نے جنم لیا جو اس بات کا مظہر ہے کہ ہندوستان آدمی اور خدا کے درمیان مخلوق اور خالق کے درمیان کے رشتے کو معلوم کرنے کی دھن میں شروع سے ہی رہا ہے۔ ہندوستان کی دیو مالا اس امر کی شاہد ہے کہ یہاں مرد اور عورت کی عظمت برابر ہے۔ شوجی کے ساتھ پاروتی اور لکشمی وسرسوتی جیسی دیویوں کا اساطیری وجود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ہندوستانی فلسفہ نے عورت کو بہت بڑا درجہ دیا اور اسی مناسبت سے سرزمینِ وطن کو ماں کہا گیا ہے —— مادرِ ہند —— بھارت ماتا اور ہندوستان کی تاریخ کے اہم نام چاہے وہ اشوک ہوں یا ہرش وردھن، اکبر ہوں یا شیواجی، اورنگ زیب ہوں یا مہارانا پرتاپ، گاندھی جی ہوں یا کہ جواہر لال نہرو۔ سب کو تعظیم کے ساتھ ہم بھارت ماں کے 'سپوت' کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جو سرزمین خود ماں کہلائے اس کی نہان 'سپتریاں' نہ ہوں موضوعِ سخن بہت طویل ہے لیکن میں تاریخ کے اس جھروکے میں جھانک کر دیکھتی ہوں جب بھارت ماتا کو باہری لوگوں نے غلام بنایا اور اس کی سنتان تلملا اٹھی، غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے۔ آزادی کی اس جنگ میں عورت مرد کی شریکِ کار رہی۔ تجزیہ کیا جائے تو ہر بہادر مرد کی بہادری میں اس کی ماں کی تربیت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن اس عمومی تجزیے سے قطع نظر اس وقت میں چند ایسی خواتین کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو اپنے بے مثال کارناموں کے باعث جنگِ آزادی کی تاریخ کے صفحات پر اس طرح ابھریں کہ امر ہو گئیں۔

1857 کی جنگِ آزادی ہماری تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے اور یہیں سے میں اپنی بات شروع کرتی ہوں۔۔۔۔ 1857 کے ساتھ جس بہادر عورت کا نام سامنے آتا ہے وہ ہے جھانسی کی مہارانی لکشمی بائی ——

لکشمی بائی مہاراشٹر کی رہنے والی تھیں اور ان کے پتا نے انھیں شروع سے گھوڑ سواری، تیغ زنی، تیر اندازی اور دوسرے فنونِ جنگ سکھائے۔ مشہور مجاہدِ آزادی

نانا صاحب کے ساتھ وہ فنونِ جنگ کی تربیت حاصل کرتی تھیں اس وقت انگریزوں نے ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنی حکمتِ عملی سے کٹھ پتلی بنا لیا تھا۔ جس کو چاہے گدی پر بٹھاتے جس کو چاہتے بے دخل کر دیتے۔ مہارانی لکشمی بائی کے شوہر کی موت کے بعد ان کے کمسن بچہ کو حکومت کا حق پہنچتا تھا مگر یہ انگریزوں کے مفاد میں نہ تھا اس لیے انھوں نے لکشمی بائی کی مخالفت کی مگر وہ حق پر اڑی رہیں اور انھوں نے اپنے بیٹے کے اتالیق کی حیثیت سے راج گدی کا کام سنبھالا۔ لکشمی بائی کی فوج میں باقاعدہ تربیت یافتہ خواتین کا دستہ بھی تھا جس پر انھیں بہت اعتماد تھا۔ جب 1857 میں میرٹھ سے مجاہدینِ آزادی کا کارواں دہلی پہنچا اور انھوں نے آخری مغل تاجدار بہادر

شاہ ظفر کو اپنا کماندار بنایا اور اعلان کیا کہ ان کے پرچم تلے ہندوستان کی جنگِ آزادی لڑی جائے گی تو انگریزی فوج میں کھلبلی مچ گئی زور کا رن پڑا اور ملک کے مختلف حصوں میں ریاستوں اور علاقوں کے حکمرانوں نے تحریکِ آزادی کا استقبال کیا اور بہادر شاہ ظفر کی سرپرستی منظور کی۔ مہارانی لکشمی بائی جنہیں تاریخ جھانسی کی رانی کے نام سے جانتی ہے اُن وطن پرستوں میں سے ایک تھیں جو انگریز کو ہر قیمت پر ہندوستان سے نکال دینا چاہتے تھے۔ لڑائی ہوئی "لکشمی بائی نے مورچہ سنبھالا، لڑتے لڑتے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان قربان کردی اور امر ہوگئیں۔ آج بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو منہ سے نکلتا ہے:

خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی

اسی زمانے میں نواب واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے خلاف مورچہ بنایا اور جنگِ آزادی میں اپنا نام روشن کر گئیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ 1857 میں مجاہدینِ آزادی کو جہاں جہاں شکست کا منہ دیکھنا پڑا وہاں غدارِ وطن آستینوں کے سانپ کی طرح موجود تھے۔

اپنی حکمتِ عملی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر چل کر انگریزوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ جما لیا، ان نوابوں اور راجاؤں کو مراعات دیں جو یا تو اس جنگِ آزادی میں غیر جانبدار رہے یا انگریز کے وفادار۔ یہ ریاستیں 1857 سے 1947 تک گندہ مواد بھرے ہوئے پھوڑوں کی طرح مادرِ ہند کے جسم پر باقی رہیں نوے سالہ غلامی کے اس عرصہ میں تحریکِ آزادی جدید تقاضوں کے ساتھ پھر اُبھری، آخرکار اس جنگ نے اپنا تاریخی رول پورا کیا اور آج ہندوستان آزاد ہے ——— آزادی کے اس سورج کو طلوع کرنے میں جن خواتین رہنماؤں کا قابلِ قدر حصہ ہے ان کی قربانیوں کو یاد کرنا ایک آزاد قوم کا فریضہ ہے۔ سب سے پہلا نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہے اینی بیسنٹ کا، جو اگرچہ غیر ملکی تھیں مگر پھر بھی اس ملک کو انھوں نے عظمت کی نظر سے دیکھا اور انگریز کے خلاف سینہ سپر ہوئیں۔ ہماری جنگِ آزادی آئینی جنگ کی طرح لڑی گئی۔ ہتھیاروں اور تشدد کا استعمال ہندوستانیوں نے نہیں کیا کیونکہ اس وقت انگریز قوم آدھی دنیا پر حاوی تھی اور اس کی طاقت کا مقابلہ عدم تشدد سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ 1857 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس پارٹی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اینی بیسنٹ، ایک انگریز خاتون بھی اس کی صدر رہیں۔ جن کی رہنمائی میں قافلۂ آزادی آگے بڑھا۔

ایک اور اہم نام ہے بلبلِ ہند مسز سروجنی نائڈو جو ایک بلند آہنگ شاعرہ اور شعلہ بیان مقرر تھیں۔ انھوں نے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے دوش بدوش رہ کر آزادی کے لیے کام کیا 1947 میں جب ہندوستان نے آزادی حاصل کی تو عروسِ آزادی کا استقبال کرنے کے لیے سروجنی نائڈو حیات تھیں اور ان کے نغمے اور ان کی تقریریں پورے ملک میں گونج رہی تھیں۔ یہ وہی مجاہدۂ آزادی ہیں کہ جب 8 اگست 1942 کو بمبئی میں گوالیا ٹینک کے میدان میں



وجے لکشمی پنڈت

کانگریس نے متفقہ فیصلہ کیا اور انگریز کو للکار کر کہا کہ ہندوستان فوراً چھوڑ دو تو اس وقت یہ کانگریس کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں اور اس فیصلے میں ان کی گرجدار آواز بھی شامل تھی 9 اگست 1947 کو سورج نکلنے سے پہلے ہی جب انگریزی حکومت کی پولیس نے کانگریسی رہنماؤں کی قیام گاہ پر چھاپا مارا تو بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔ سروجنی نائڈو نہا دھو کر اس طرح تیار بیٹھی تھیں جیسے انھیں پہلے ہی سے معلوم ہو کہ اس وقت گرفتاری عمل میں آئے گی۔ مولانا آزاد نے "غبارِ خاطر" میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عورت میں ایک چھٹی حس ہوتی ہے سروجنی نائڈو نے قید و بند کی سختیوں کو سہا اور پھر آزادی کا استقبال کیا۔ آزاد ہندوستان کی وہ پہلی خاتون تھیں جو ایک صوبہ کی گورنر بنائی گئیں۔ اتر پردیش کی گورنر کی حیثیت سے ان کے کارنامے بے مثال ہیں وہ ایک آزاد ذہن اور ترقی پسند خیالات کی حامل خاتون تھیں شاعری اور سیاست کا جیسا امتزاج سروجنی نائڈو کی شکل میں ملتا ہے وہ تاریخ کے لیے مثال ہے۔ آزادی کے چند سال بعد وہ فوت ہوگئیں۔ لیکن ان کی قومی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں اور ان کی شاعری زندہ جاوید ہے۔

پنڈت موتی لال نہرو ایک ایسے محبِ وطن تھے جن کے گھر کا بچہ بچہ ہندوستان کی تاریخ آزادی کا سنہرا باب ہے وہ مغربی طرز کی اعلیٰ زندگی گزارتے تھے لیکن مشرقی طرز کی حب الوطنی ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی طرز پر انھوں نے اپنی اولاد کی پرورش کی اگر ان کے بیٹے پنڈت جواہر لال نہرو نے بڑھ چڑھ کر آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا اور ہندوستان کو بامِ عروج تک پہنچایا تو ان کی بیٹیوں، بہو اور پوتی نے بھی اس عظیم روایت کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ تاریخ کے صفحات پر اپنی انفرادیت کے روشن نقوش بھی چھوڑے۔

پنڈت موتی لال نہرو کی دونوں بیٹیاں وجے لکشمی پنڈت اور کرشنا ہیتھی سنگھ کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا خاص طور پر وجے لکشمی پنڈت نہایت بُردبار، بااصول، بارعب اور اپنی بات کی دھنی تھیں اور ان کی تقریر سننے والوں پر جادو کا اثر کرتی تھی اپنے بھائی کے دوش بدوش انھوں نے برابر کام کیا اور کانگریس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہیں۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنھیں آزادی کے بعد امریکہ جیسے عظیم ملک میں ہندوستان کا سفیر مقرر کیا گیا۔ عہدۂ سفارت سے سبکدوش ہوئیں تو مہاراشٹر اسٹیٹ کی گورنر کی حیثیت سے انھوں نے اس عہدہ کی شان میں اضافہ کیا اور اپنے بھائی جواہر لال نہرو کی موت کے بعد ان کے انتخابی حلقے پھولپور سے لوک سبھا کے لیے باقاعدہ الکشن لڑ کر منتخب ہوئیں۔ ہندوستان کا وہ دور عجیب تھا جب انڈین نیشنل کانگریس اندرونی خلفشار کا شکار تھی۔ مرارجی ڈیسائی اور اندرا گاندھی میں طاقت کی رسہ کشی تھی۔ وجے لکشمی پنڈت ایک بااصول خاتون تھیں اس نازک موقع پر انھوں نے اپنے وقار کو برقرار رکھا اور لوک سبھا کی سیٹ سے استعفیٰ دے کر انھوں نے اپنی عظمت اور وقار کا ایک اور ثبوت دیا۔ باقی عمر رفاہِ عام کے کاموں میں گزار دی۔ چند سال پہلے ان کی موت سے ہندوستان ایک قابلِ فخر مجاہدۂ آزادی سے محروم ہوگیا۔

ہندوستان ہی نہیں دنیا کے عظیم رہنماؤں اور امنِ عالم کا پیغام عام کرنے والے پنڈت جواہر لال نہرو کی نصف بہتر تھیں ان کی اہلیہ کملا نہرو۔ ایک کم سخن خاتون مگر اپنے ارادے کی پکی، اپنی بات پر اٹل۔ وہ اپنے خسر موتی لال نہرو کی بڑی لاڈلی اور اپنے شوہر جواہر لال کو آزادیٔ وطن کے قافلے کی رہنمائی کرنے میں معاون تھیں انھوں نے طبقۂ نسواں میں بہت کام کیا اور توہم پرستی، فضول رسم و رواج اور دیگر سماجی خرابیوں کو ہندوستانی سماج سے دور کرنے کی کوشش کی ہمیشہ کھدر پہنا، اپنے آپ کو ہندوستان کے غریب عوام کا ایک حصہ سمجھا اور سب سے بڑا کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ پریہ درشنی بیٹی کی پرورش کی اور ایک مثالی عورت کے جوہر اس کے دل میں پیوست کر دیئے۔ عمر نے وفا نہ کی۔ کملا نہرو تپِ دق جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر اپنی طبعی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ مگر اپنے اخلاق، اصولوں اور مزید خصوصیات کا پیکر اندرا گاندھی کی شکل میں چھوڑ گئیں۔

پریہ درشنی اندرا بچپن سے ہی ایک غیر معمولی ذہن کی مالک تھیں اور اس پر طرۂ امتیاز موتی لال نہرو کی شفقت جواہر لال نہرو کی محبت اور کملا نہرو کی تربیت۔ انھوں نے بچپن میں ہی آزادی کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا اور بہت جلد انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر نمایاں حیثیت حاصل کی تھی۔ گاندھی جی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ 1947 کے خوں آشام دور میں اندرا گاندھی نے باپو کے دوش بدوش فرقہ وارانہ فسادات کے متاثرین کے لیے کام کیا۔ انھوں نے اپنے والد کا آخری دم تک ساتھ دیا اور سائے کی طرح ان کے ساتھ رہیں۔ 1947 سے 1964 تک کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ ان کے شوہر فیروز گاندھی ایک اعلیٰ درجے کے سیاست داں تھے۔ بحیثیت ماں کے پریہ درشنی اندرا گاندھی نے دو تابناک موتی راجیو گاندھی اور سنجے گاندھی کی شکل میں ہندوستان کو دیئے۔

اندرا گاندھی نے اپنے والد کی موت کے بعد عملی سیاست میں قدم رکھا۔ پہلے کچھ ماہ وزیرِ اطلاعات و نشریات رہیں پھر وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری کی موت کے

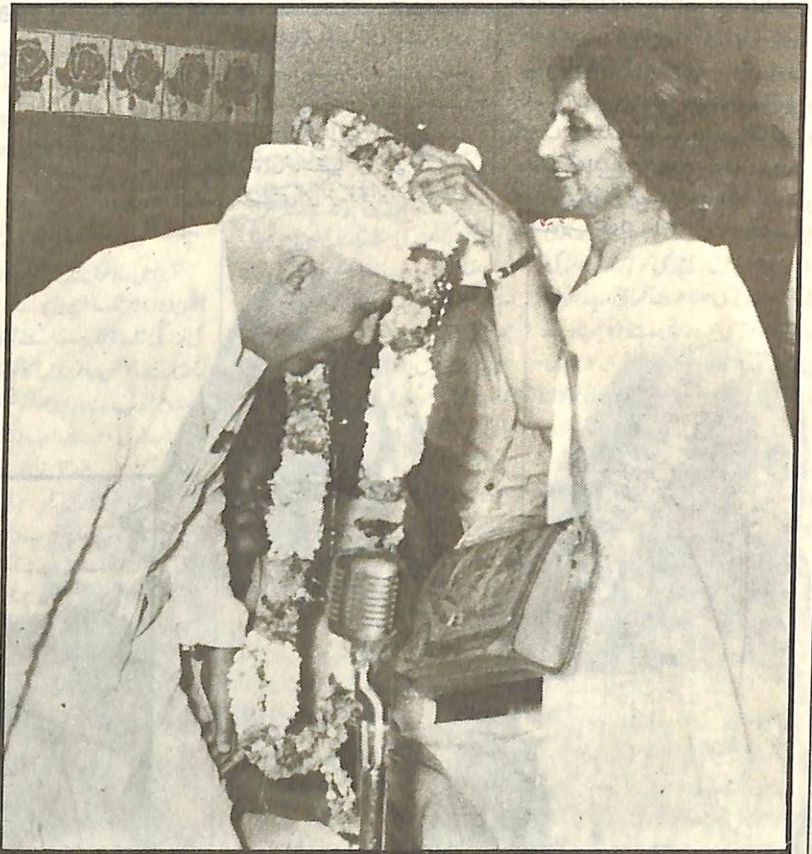
بعد برسرِاقتدار پارٹی نے انھیں وزیرِاعظم چُنا اور اس حیثیت سے وہ دنیا کی تاریخ میں اپنا نام کر گئیں، ان کو ملک کے سب سے بڑے اعزاز بھارت رتن سے نوازا گیا اور جس طرح ایک گمراہ شخص نے مہاتما گاندھی کا خون بہایا تھا اسی طرح اندرا گاندھی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے والے بھی اپنے ہی ملک کے گمراہ نوجوان تھے۔

آزادی کی جدوجہد کا زمانہ ہو یا آزادی کے بعد ملک کی تعمیرِ نو اور اس کو مستحکم کرنے کا مسئلہ اندرا گاندھی کا نام تاریخ کے اوراق پر سنہرے حروف سے مرقوم ہے

ہماری جنگِ آزادی ملک کی عورتوں اور مردوں نے دوش بدوش لڑی ہے، ہر گاؤں ہر قصبہ اور ہر شہر میں سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں عورتوں نے آزادی کے مختلف مورچوں پر اپنے اپنے انداز سے کام کیا لیکن 9 اگست 1942 کو جب صفِ اوّل کے بڑے رہنما جیلوں میں بھر دیئے گئے تو دوسری اور تیسری صف کے رہنماؤں نے جس جی داری اور بے مثال ہمت سے کام کیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی محبانِ وطن کے اس ہجوم میں ایک ستارہ آسمانِ وطن پر اس طرح چمکا کہ ملک بھر کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں اور وہ تھیں مسز ارونا آصف علی ان کے شوہر بیرسٹر آصف علی گرفتار ہو گئے تھے اور انھوں نے ہندوستان چھوڑو تحریک کی رہنمائی اپنے سر لے لی تھی۔ ان کی دھواں دھار اور شعلہ بار تقریروں نے وطن کے نوجوانوں کے دلوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ 1942 کے انقلابی اقدام کے نتیجے میں ہی 1947 میں آزادی نصیب ہوئی . . . .

آزادی کی مختلف تحریکیں اُبھریں پہلی جنگِ آزادی کے بعد "خلافت تحریک" ظہور میں آئی۔

ارونا آصف علی ایک بے باک مقرر بے لاگ قلمکار ہیں مصلحتوں سے آزاد جوڑ توڑ کی پالیسی سے متنفر، خود پرستی اور خود غرضی سے ماورا۔ اسی لیے انھوں نے آزادی کے بعد نہ کوئی عہدہ قبول کیا نہ اپنی ساکھ اور خلوص کو داؤں پر لگایا ان کی قدر و منزلت ان کے دل میں بھی ہے جو ان سے سیاسی اختلاف رکھتے ہیں۔



بی اماں: یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جنگِ آزادی میں جن خواتین نے حصہ لیا وہ نام و نمود کی خاطر نہیں بلکہ ملک کی آزادی کے لیے تھا۔ آزادی کی مختلف تحریکیں ابھریں پہلی جنگِ عظیم کے بعد خلافت تحریک ظہور میں آئی۔ خلافت تحریک نے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیسے دو بھائی جنگِ آزادی میں اہم رول ادا کرنے کے لیے پیدا کیے۔ ان دونوں محبانِ وطن بھائیوں کو جس آغوش نے پالا اس کا نام فخر سے ہماری تاریخ میں 'بی اماں' کے طور پر جانا جاتا ہے۔ خلافت تحریک کے دوران اور اس کے بعد بھی یہ نغمہ ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھا:

"بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو"

اس شیر دل خاتون کو اس موقع پر یاد نہ کرنا تاریخی غلطی ہوگی۔

جنگِ آزادی کے ابتدائی ایام میں جو خواتین گاندھی جی سے قریب رہیں ان میں ایک نمایاں نام **سبھدرا جوشی** کا ہے وہ ابھی حیات ہیں اور فعال بھی۔ انھوں نے اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اور قلم قومی یکجہتی کے لیے وقف کر دیا اب وہ 'سیکولر ڈیموکریسی' (پندرہ روزہ) اردو رسالہ نکالتی ہیں۔ آج کے نازک دور میں وہ 'سامپرداکتا ورودھی آندولن' (فرقہ پرستی مخالف تحریک) چلاتی ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا ہموار کرنا ان کا ایسا کارنامہ ہے جس کے ذریعے وہ گاندھی جی کے خواب کو پورا کرنے کی کوشش میں لگی ہیں۔

راج کماری امرت کور کا نام بھی محبِ وطن خواتین کی فہرست میں نمایاں ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد وہ پنڈت جواہر لال نہرو کی کیبنٹ کی رکن رہیں۔

گاندھی جی ہندوستانی کے قائل تھے اردو ہندی کے جھگڑے کو مٹانے کے لیے انھوں نے آسان زبان کا یہ نسخہ دریافت کیا تھا۔ محترمہ کلثوم سیانی گاندھی جی کے اصولوں کی روشنی میں مدتوں 'رہبر' نام کا ایک ہفتہ وار اخبار بمبئی سے نکالتی رہیں جو ہندوستانی زبان کا علم بردار تھا اور بیک وقت دیوناگری، گجراتی اور فارسی رسم الخط میں چھپتا تھا۔ یعنی مضمون ایک۔ زبان ایک — پڑھنے والا چاہے جس رسم الخط میں پڑھے۔

غرض ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ کے ہر صفحہ پر مردوں کے دوش بدوش عورتوں کے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں آزادیٔ وطن کے لیے مردوں کی قربانیاں تو ناقابلِ فراموش ہیں ہی مگر سلام ہے ان خواتین کو جنھوں نے صنفِ نازک کے لیبل کو ہٹا کر الگ رکھ دیا اور انگریز سامراجیوں کے مقابلے میں فولاد کی ایسی دیوار بن گئیں جن سے ٹکرا کر اس کا اقتدار پاش پاش ہوگیا۔

تھارو قبیلہ

رانا ٹھاکروں کی ایک نسل

اُتر پردیش کی پانچ شیڈیولڈ ٹرائبس (درج فہرست قبائل) بھوٹیا، بُھکسا، راجی (یا بن راوت) جونساری اور تھارو ــــ اس خطّہ کے قدیمی باشندے یا آدی واسی ہیں۔ ان کی اپنی الگ ایک تہذیب ہے اور الگ رسم و رواج ہیں۔ اتر پردیش کے ترائی کے علاقے میں جنگلوں کے کنارے کنارے بسا ہوا قدیم قبیلہ تھارو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دراصل یہ راجستھان کے "تھار" علاقے سے چل کر ترائی کے جنگلوں میں پھیل گئے اور اپنے وطن کے نام سے اپنی شناخت قائم کرلی۔ یہ زمانہ قدیم سے اپنے آپ کو تھارو کہتے آئے ہیں۔ ان کے بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ لوگ رانا پرتاپ اور اسی کی نسل کے راجاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مغلوں کے حملے کے وقت راجاؤں نے متحد ہوکر بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن مغلوں کی پیش رفت جاری رہی یہاں تک کہ رانا ٹھاکروں نے "تھارو ایک گربسن جیسا بنالیا۔ سمجھدار ٹھاکر یہ سمجھ چکے تھے کہ مغلوں کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی ہوں گے اور پھر مغل فوج کے جوانوں کا جو بھی سلوک ہو، وہ برداشت کرنا پڑے گا۔ لہٰذا سبھی رانا ٹھاکروں نے ایک خفیہ جلسہ میں یہ فیصلہ کیا کہ گھر کی ناموس یعنی رانیوں کو جنگل کے راستے علاقے سے باہر نکال دیا جائے۔ چنانچہ راتوں رات جتنی بھی بیل گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں تیار ہوسکیں ان میں مع ضروری سامان کے رانیوں کو نوکروں کی حفاظت میں جنگل کے راستے نامعلوم منزل کی طرف بھیج دیا گیا۔ جب عرصہ تک رانا ٹھاکروں میں سے کوئی واپس نہیں لوٹا تب رانیوں نے اپنے نوکروں اور محافظوں کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کرلئے۔ یہی نسل "تھارو" کہلاتی ہے۔ یہ منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

اتر پردیش میں نینی تال کی ترائی میں کھٹیما، باز پور اور ستار گنج، لکھیم پور کھیری کے پلیا کلاں میں دودھوا نیشنل پارک سے متصل پٹّی میں تھارو آباد ہیں۔ بہرائچ کے چھوٹے سے حصے ہیں اور پھر اس سے زیادہ تھاروں کی آبادی گونڈہ ضلع کے بچپیڑوہ اور گیسری بلاکوں میں ہے۔ یہ بہت ایماندار اور سادہ لوح قوم ہے۔ عورتیں مردوں سے زیادہ محنتی اور فعال ہوتی ہیں۔ تھاروؤں کی خاصی آبادی نیپال میں بھی ہے اور ہندوستانی تھاروؤں کی سگی رشتہ داری نیپال سے جُڑی ہوئی ہے

رھائشی اطوار

تھاروؤں میں یک جہتی بہت زیادہ ہے۔ وہ سب ایک ہی جگہ پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ کہیں اکیلا کنبہ کسی جنگلی درندے کا شکار نہ بن جائے یا کسی منفرد جگہ پر رہنے والے کسی بھی کنبہ کو ڈاکو آسانی کے ساتھ لوٹ سکتے ہیں۔ اب سے قبل جب تھارو کہیں بستی بساتے تھے تو پہلے تو درخت، ٹیلے و غار وغیرہ کاٹنا یا پاٹنا پڑتے تھے اس کے بعد جنگل سے کاٹ کر لائے گئے درختوں، بانسوں، جنگلی گھاس اور پھوس کی مدد سے یہ لوگ مکان بنایا کرتے تھے جس میں آمد و رفت کا صرف ایک دروازہ ہوتا تھا لیکن دروازہ بند کرلینے پر اندر گھٹن نہ ہونے پائے، اس غرض سے یہ لوگ دیواروں میں تقریباً 4-4 انچ قطر کے سوراخ بنالیا کرتے تھے۔ اب بھی یہی کرتے ہیں۔ گاؤں میں کئی کئی مکانوں کا ایک ایک بلاک ساز (CLUSTER) ہوتا ہے۔ ان سب مکانوں کی عقبی دیواریں اس طرح آپس میں ملی ہوتی ہیں کہ بلاک کے اندر آنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے جہاں نگرانی کے لئے کتّے ٹہلتے رہتے ہیں۔ دیواریں پہلے لمبی قسم کی جنگلی گھاس سے بنائی جاتی ہیں اور بیچ بیچ میں بانس یا پیڑ کی سیدھی لکڑی کی تقویت دیتے ہوئے، 25 سے 30 فٹ یا کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ لمبائی میں بنائی جاتی ہے۔ یہ سب کام بَلّیوں کا ایک بڑا ڈھانچہ کھڑا کرنے کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔ تینوں دیواریں بن جانے کے بعد تھارو مردوں کا کام آدھا ختم ہوجاتا ہے۔ اب مرد و عورتیں مل کر پھوس سے چھت بناتے ہیں اور دروازہ لگا لیتے ہیں۔ اس چھپر کی دیواروں کے آگے و پیچھے تھارو عورتیں مٹّی اور گوبر کا پلاسٹر کرتی ہیں۔ فرش کو بھی مسطح کرکے اس کو بھی گوبر اور مٹی سے لیپ لیتی ہیں۔ اس طرح تین طرف



مکانات بن جاتے ہیں اور بیچ کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ اس مشترکہ جگہ کو برابر کرنے، لیپنے اور پوتنے کی ذمہ داری عورتوں کی ہوتی ہے۔ یہ اس کامن لان کو کافی صاف رکھتی ہیں۔ یہیں تھاروؤں کی پنچایت ہوتی ہے اور یہیں ایک طرف دیوتا کا مندر بھی بنا ہوا ہوتا ہے۔ یہ مندر ایک چاروں طرف سے کھلی ہوئی چھوٹی سی جھونپڑی اور اس کے بیچو بیچ رکھے ہوئے ایک مٹی کے پنڈ پر مشتمل ہوتا ہے۔

سماجی نظام

تھارو عموماً مشترکہ کنبہ بنا کر رہتے ہیں منگنی بچپن میں ہی کر دی جاتی ہے لیکن گونہ 14۔15 سال میں ہو جاتا ہے۔ عموماً ایک لڑکی ایک دو بار بھاگ لینے کے بعد ہی اپنی اصلی سسرال پہونچتی ہے۔ عورتیں اپنا سنگھار کرنے کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ یہ ایک گھاگھرا، بلاؤز اور سر پر اوڑھنی پہنتی ہیں ان کپڑوں پر وہ خود نہایت خوبصورت کشیدہ کاری اور کڑھائی کا کام کرتی ہیں۔ سستے قسم کا میک اپ کرنا بھی عام ہے۔ یہ اپنے بالوں کو خوب گھسیٹ کر سر کے اوپر جوڑہ باندھتی ہیں کانوں میں بڑے بڑے بالے ہاتھوں میں کسکوٹ (ایک دھات) کے کڑے اور لاکھ کی چوڑیاں پہنتی ہیں۔ پیروں میں بھی موٹے موٹے کڑے پہنے جاتے ہیں۔

عموماً جب فصل پک جاتی ہے تو اس کی رکھوالی اور نگرانی کے لئے کھیت کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی عارضی جھونپڑی بنا دی جاتی ہے جس میں کنبے کی کوئی جوان لڑکی بیٹھ کر کھیتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ جب تک یہ جھونپڑی میں رہتی ہے وہ اپنے ساتھ اپنے سنگھار کا سامان اور بیڑی کا بنڈل بھی رکھتی ہے۔ اس کی پسند کا کوئی نوجوان (تھارو) جب قریب کی پگڈنڈی سے گزرتا ہے تو لڑکی اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے آئینہ کو دھوپ میں اس طرح چمکاتی ہے کہ اس کا عکس اس تھارو نوجوان پر پڑتا ہے اور وہ اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس جھونپڑی میں چلا جاتا ہے۔ لڑکی سب سے پہلے اس کی طرف بیڑی جس کو مقامی زبان میں "گجٹر" کہتے ہیں، پیش کرتی ہے۔ اس طرح فصل کٹنے تک یہ رومانی ملاقاتیں روزانہ ہی ہوتی رہتی ہیں اور ایک خوشگوار صبح جب لڑکی کے گھر والے سو کر اُٹھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ لڑکی غائب ہو چکی ہے۔ لڑکی کی تلاش میں کوئی بہت زیادہ کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تھارو یہ جانتے ہیں کہ لڑکی کسی غیر تھارو کے ساتھ نہیں بھاگی ہوگی

لڑکی جس تھارو لڑکے کے ساتھ بھاگتی ہے اس لڑکے کے گھر والوں کا یہ سماجی فرض ہوتا ہے کہ وہ لڑکی کے گھر والوں کو اس کی اطلاع کرا دے۔ اطلاع کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ لڑکے کے گھر کا کوئی شخص لڑکی کے گھر پر جا کر یہ الفاظ ادا کرتا ہے۔ "تمھارا سامان ہمارے گھر پہونچ گیا ہے۔ پنچایت کر لو۔" چنانچہ پنچایت کی جاتی ہے جس میں لڑکی کے بچپن کے منگیتر کو اور اس کے باپ کو بھی بلایا جاتا ہے۔ منگیتر کا باپ لڑکی کے باپ پر جرمانہ عائد کرتا ہے۔ اسی طرح لڑکی کا باپ اس لڑکے پر جرمانہ بولتا ہے جس کے گھر وہ بھاگ کر جاتی ہے۔ اس کے بعد پنچایت کو کھانا دینا پڑتا ہے جس میں مقامی شراب اور مچھلی

> **تھارو قبیلے کے لوگ اپنے آپ کو رانا پرتاپ اور اسی کی نسل کے راجاؤں کی اولادوں میں سے مانتے ہیں۔**

ضرور ہوتی ہیں۔ اس طرح لڑکی اس لڑکے کی باقاعدہ بیوی بن جاتی ہے ضروری نہیں کہ بھاگنے کا سلسلہ بس یہیں پر ختم ہو جائے۔ اس کے بعد بھی عورت کی مرضی پر ہے کہ وہ کتنی بار گھر بدلتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ تھارو قبیلہ کے اندر ہی ہوتا ہے اس میں باہری کسی شخص کی شرکت قطعی نہیں ہوتی۔

تھارو کی مرغوب غذا مچھلی اور چاول (بھات) ہے۔ عورتیں و مرد صبح کھا پی کر اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے مچھلی پکڑنے کے جال لیکر نکل پڑتے ہیں اور تالابوں یا سڑک کے کنارے گڈھوں میں بھرے ہوئے برساتی پانی میں اتر جاتے ہیں۔ اپنے جال سے مچھلی پکڑ پکڑ کر یہ ایک سوکھی اور کھوکھلی لوکی میں ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ لوکی ایک تونبی کی شکل کی ہوتی ہے جس کو یہ رسی سے باندھ کر اپنی کمر میں باندھ لیتے ہیں اس سلسلے میں میں نے جب ڈاکٹر امیر حسن آئی اے ایس سے بات کی تو انھوں نے زور دے کر کہا کہ تھارو ضرورتاً مچھلی نہیں پکڑتے بلکہ یہ ان کے "اسپورٹس" کا ایک حصہ ہے۔ گو کہ ان کے پاس زرعی زمین اچھی خاصی ہے لیکن اس میں پیداوار بہت ہی کم ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ تھارو اچھا بیج، کیمیائی کھاد اور جراثیم کش دواؤں کا استعمال نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے کھیت جل جاتا ہے، پھر اس میں فصل نہیں ہوتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

جب میں چندن چوکی کے قبائیلی علاقے میں بحیثیت پروجیکٹ آفیسر تعینات تھا تو گاؤں والوں سے کھیتوں میں کھاد کے استعمال کے لئے کہا تھا۔ کئی گاؤں میں پنچایت کی اور کھاد و دواؤں کے فوائد بتائے لیکن تھارو کسی طرح بھی اپنے کھیتوں میں کھاد چھڑکنے پر تیار نہیں ہوئے۔ مجبوراً میں اپنی ٹیم کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ لیکن واپس آکر میں نے ایک اسٹاف میٹنگ کی اور رات کے لئے پروگرام طے کر لیا۔ چنانچہ رات دس بجے کے قریب میں اپنی پوری ٹیم کے ساتھ ایک تھارو کھیت میں گیا اور پورے کھیت میں کیمائی کھاد چھڑک دی۔ ظاہر ہے کھاد ملنے کے بعد کھیت میں فصل بھی بہت اچھی ہوئی۔ تب تھارو گاؤں میں میٹنگ کر کے ان کو بتایا گیا کہ اس کھیت میں دوسرے کھیتوں کی بہ نسبت فصل تین یا چار گنی کیسے ہو گئی۔ اس طرح ان کو کھاد، بیج اور دواؤں کے استعمال کی ترغیب دی گئی۔

جنگلی جانور اور جنگل

قبائیلی علاقوں میں جنگلی جانوروں اور جنگل دور دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ تھارو کی زندگی میں جنگل سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جنگلی جانوروں کا گوشت انھیں بہت مرغوب ہے۔ ددھوا نیشنل پارک بن جانے کی وجہ سے اب وہاں پر جانوروں کے شکار پر مکمل پابندی عائد ہے۔ لیکن تھارو اب بھی چوری چھپے ہرن، چیتل، سانبھر، نیل گائے، اینٹلوپ وغیرہ مار کر کھا لیتے ہیں۔ پتہ لگ جانے پر محکمۂ جنگلات کے افسران پورے گاؤں پر جرمانہ کر دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جرمانے کی رقم صرف ایک ہی گاؤں ادا نہیں کرتا بلکہ پورے "تھرواٹ" یعنی سارے تھارو گاؤں سے چندہ اکٹھا کر کے جرمانے کی رقم، جو کبھی کبھی پچاس پچاس ہزار روپیہ ہوتی ہے، بھر دی جاتی ہے۔ 1955ء میں شروع ہوتے "فاریسٹ پلانٹیشن آپریشن" کے بعد جنگلات سے لکڑی کاٹنا بھی بند کر دیا گیا تھا لیکن پھر بھی سال میں دو بار انھیں جنگل سے "معافی" ملتی ہے یعنی تھارو اپنی اپنی بیل گاڑیاں لیکر

جنگلوں میں جاتے ہیں اور اپنی ضرورت بھر کی لکڑی جو چھ ماہ کے لئے کافی ہو لے آتے ہیں۔ لیکن یہ لکڑی نیچے گری ہوئی ہونی چاہیے کاٹی نہیں جانی چاہیے انھیں اپنے مویشیوں کے لئے جنگل سے چارہ بھی مل جاتا ہے۔ جن جنگلی جانوروں کی یہاں بہتات ہے ان میں چیتل، ہرن، اینٹلوپ، بارہ سنگھا، سانبھر، بلیک بک (کالا ہرن) شیر، چیتا، تیندوا، بلیک پینتھر، ہاتھی، گینڈا، ریچھ، جنگلی سور، جنگلی کتیاں، جنگلی بھینسا اور دیگر چھوٹے قسم کے جانور جیسے بھیڑیا، سیار، لکڑ بگھا، خرگوش، سیہی وغیرہ شامل ہیں۔ حال ہی میں اس علاقے (ددھوا) میں "پروجیکٹ ٹائیگر" اور گینڈہ پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے تاکہ ان کی معدوم ہوتی ہوئی نسل کی افزائش ہو سکے۔

تھاروؤں میں صرف تین ضمنی نسلیں ہیں۔ رانا، کٹھیریا اور ڈنگورا۔ یہ سب ایک ساتھ مل کر رہتے ہیں لیکن شادی بیاہ اپنے ہی ضمنی قبیلے میں کرتے ہیں۔ مرد عموماً زیادہ فعال نہیں ہوتے بلکہ اگر کاہل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عورتیں کافی محنتی ہوتی ہیں اور یہ اپنے گھروں اور مکانوں کے بیچ کے پلیٹ فارم کو گوبر اور مٹی سے لیپ کر خوب صاف رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں مردوں کے مقابلے احساس برتری زیادہ ہوتا ہے۔ تھارو عورت خود تو چوکے میں بیٹھ کر کھانا کھاتی ہے لیکن تھارو مرد چوکے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ تھارو شوہر کو اس کی بیوی دروازے کے باہر کھانا لا کر دیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شوہر کے سامنے کھانے کی تھالی رکھ کر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر اپنے پیر سے تھالی کو اپنے شوہر کی طرف سرکا دیتی ہے جب کہیں تھارو شوہر کھانا کھاتا ہے۔ خاندانی امور میں تھارو عورت کی ہی بالادستی رہتی ہے۔

تہذیب و تمدن اور خواندگی

کسی بھی معاشرے کے کلچر کو کسی دوسرے معاشرے کے کلچر سے اچھا یا بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کلچر ایک سیکھا ہوا برتاؤ (LEARNED BEHAVIOR) ہے۔ تھارو بھی اپنے قبائیلی کلچر سے پیار کرتے ہیں۔ رات میں کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد یہ لوگ گاؤں کے بیچ میں بنے ہوئے پلیٹ فارم پر آ بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی ایک تھارو اپنی قبائیلی بھاشا میں کوئی گیت شروع کر دیتا ہے۔ تھارو عورتیں بھی اس وقت تک اپنی خانہ ساز شراب پی کر مست

باقی صفحہ 87 پر





بچوں کو اپنا دوست بنائیے

شیام لتا لالے

سبھی بچے ابتدا میں اسکول جاتے وقت پریشان کرتے ہیں۔ لیکن اگر بڑا بھائی یا بہن اسکول جاتا ہو تو یہ مسئلہ کم ہی سامنے آتا ہے یا پھر اس بات کا انحصار اس پر بھی ہے کہ آپ نے اپنے بچے کو اسکول جانے کے لئے کس طرح تیار کیا ہے۔ ماں باپ بچوں کی تمام ضدیں پوری نہ کریں اس کی حوصلہ افزائی کریں کہ اسکول جائے گا تو وہ چیز تبھی اسے ملے گی وہ جس کا طالب ہے تب بچے نہ صرف ضد کرنا چھوڑ دیں گے بلکہ وقت پر اسکول کا کام کرنے اور اسکول جانے میں بھی شوق کا مظاہرہ کریں گے۔ جیسے بچہ اگر آئس کریم کے لئے ضد کر رہا ہو تو کہئے اسکول جاؤ گے تو تم کو آئس کریم ملے گی اور پھر آپ بچوں کے اسکول سے آنے سے پہلے ہی آئس کریم لاکر گھر میں رکھ دیں یا بنالیں۔ اسی طرح اگر بچہ کسی چیز کے لئے ضد کر رہا ہے تو کہئے اچھے نمبر لاؤ گے تو یہ چیز بھی لادیں گے اس سے بچہ پڑھائی دل لگا کر کرے گا۔

بچوں میں اچھی عادت پیدا کرنے کے لئے پہلے خود بھی ویسا ہی کر کے دکھانا چاہیے۔ مثلاً صبح جلدی اٹھنا۔ اُٹھ کر پہلے بالوں میں کنگھی کر کے ڈریس اپ ہو جائیں۔ پھر بچوں سے کہیں کہ صبح اُٹھو منہ ہاتھ دھو کر اسکول جانے کی تیاری کرو یا پھر پڑھنے بیٹھو۔ اسکول بیگ وغیرہ رات کو سونے سے پہلے ہی تیار کر کے رکھ دینا چاہیے۔ اگر بچہ چھوٹا ہو تو آپ اس کام میں اس کی مدد کریں۔ جوتا یا تو خود ہی پالش کر کے رکھ دیا کریں یا پھر بچوں کو ایسا کرنے کی عادت ڈالیں۔

آپ کپڑے دھونے بیٹھیں تو اپنی بٹیا کو اپنے ساتھ کپڑے دھونے کے لئے بیٹھالیں اور اس سے رومال موزے وغیرہ دھونے کو کہیں اگر وہ گندے بھی دھوئے تو اس کی تعریف کریں کہ اس نے کپڑے بہت اچھی طرح دھوئے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد دوبارہ خود صاف کر کے دھو دیں۔

بچے کا ٹفن جب تیار کریں تو اس سے اس کی پسند ضرور پوچھیں۔ اس کی پسند کی ہی چیزیں بنا کر دیں۔ جب صفائی وغیرہ کریں تو بچوں سے کہیں چلو تم بھی اپنی اپنی چیزیں صاف کرو۔ ہفتہ میں ایک دن صفائی کا بھی رکھیں۔ تمام کتابیں، کپڑے، جوتے، کھلونے الگ الگ جگہوں پر رکھیں۔ بچوں کو سمجھائیں کہ جہاں سے جو چیز لیں استعمال کے بعد اسی جگہ پر واپس رکھ دیں۔ میلے کپڑوں کو بھی تہہ کر کے رکھیں اور ان سے کہیں کہ وہ کپڑے اتار کر ادھر اُدھر نہ ڈالیں۔ ایسا کرنے پر جب آپ کپڑے دھونے بیٹھیں گی تو کپڑے اجلے دھلیں گے۔ آپ کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔

تمام کام ختم کرنے کے بعد کھانا کھائیں اور بچوں کو بھی کھلائیں بچوں کے اسکول سے آنے کے بعد آپ گھر پر ہی رہیں۔ جس وقت وہ پڑھائی کر رہے ہوں تب آپ بھی کچھ نہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرنے بیٹھ جائیں۔ پہلے بچے کا ہوم ورک ختم کرائیں پھر جو اسکول میں پڑھایا گیا ہو اس کے بارے میں سوال کریں۔

چھٹی کے دن گھر کو سجانے کے لئے کہئے کہ آج مہمان آئیں گے۔ گھر کی صفائی کروا اور تعریف کر کے اس کا حوصلہ بڑھاتی جائیں کھانے کی میز لگوائیں آہستہ آہستہ اس میں کام کرنے کی عادت پیدا ہو جائے گی۔ بچوں کے دوستوں کو تحفہ وغیرہ دینا ہو تو شاپنگ بھی ان ہی سے کرائیں اس سے ان کے اندر خریداری کی سوجھ بوجھ پیدا ہو جائے گی۔ بچوں کو خوب بولنے کا موقع دیں ان کے اور ان کے دوستوں کے کھیل کے درمیان دخل اندازی کبھی نہ کریں۔ ان کو سکھائیں کہ دوستوں کا خیر مقدم کس طرح کیا جاتا ہے۔

اسکول سے آنے پر کھانے کی میز پر سبھی لوگ ایک ساتھ بیٹھیں اور دوسرے بھائی بہن کا انتظار کریں۔ اس سے محبت بڑھتی ہے پھر کھانا شروع کریں ساتھ میں ہنسی مذاق کریں اور دن بھر کے کاموں کے بارے میں ایک دوسرے کو بتائیں۔ بچوں کی کمزوریوں کو سمجھنے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان میں یقین پیدا کریں تاکہ وہ اچھی بری تمام باتیں آپ کو بتا دیا کریں۔

اسکول میں بچوں کی ٹیچر سے ضرور ملنے جائیں۔ بچے جس مضمون میں کمزور ہوں اس میں ان کے اور ٹیچر دونوں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کو ان کی کمزوریوں کیلئے ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ان میں احساس کمتری کا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔

بچوں کے دوستوں پر بھی نگاہ رکھیں۔ ان کی باتوں میں کچھ دیر کے لئے آپ بھی شامل ہوں اس سے ان کے عادات واطوار کا پتہ چلے گا۔ بچوں پر صحبت کا اثر بہت جلد پڑتا ہے چاہے وہ اچھی ہو یا بُری۔

گھر میں تھوڑا بہت اختلاف رائے تو ہوتا ہی ہے اور اس سے تناؤ کا ماحول بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اب یہ والدین کا فرض ہے کہ وہ اس کا اظہار بچوں کے سامنے نہ کریں۔ اس سے ان پر غلط اثر پڑتا ہے۔ تناؤ زدہ ماحول بچوں کے سامنے نہ لائیں خود آپسی بات چیت سے ماحول ٹھیک کرلیں۔

میاں بیوی ایک دوسرے کی بُرائی بچوں کے سامنے نہ کریں ہمیشہ بڑوں کا احترام کریں، ان سے محبت سے پیش آئیں ان کی خدمت کریں۔ جب آپ کے بچے بڑے ہوں گے تو دن رات ایک کر کے آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ بھی آپ کی اسی طرح دیکھ بھال کریں گے۔ آپسی مسئلے میاں بیوی بات چیت کے ذریعے مل کر حل کریں۔ جب میاں بیوی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بچوں کا مشورہ لیتے ہیں تو وہ انجانے میں ہی ایسے عناصر کو دعوت دیتے ہیں کہ جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اس لئے بچے کو اپنا دوست اور ہمسفر بنائیں پھر دیکھئے آپ کو اپنا گھر جنت جیسا محسوس ہوگا۔

چوروں سے گھر کی حفاظت

ثمینہ خان

1۔ چوری کی وارداتوں میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کالونیوں اور دور دراز علاقوں میں دن دہاڑے ڈاکہ زنی اور قتل کی وارداتوں کی خبریں آئے دن اخبارات کے صفحات کی زینت بنی رہتی ہیں۔ پڑھنے اور سننے میں یہ بھی آتا ہے کہ راہ چلتی عورتوں کے گلے سے چین یا کانوں سے بالیاں نوچ لی گئیں اور تو اور اچکے سر راہ چلتے چلتے پرس چھین کر بھاگ جاتے ہیں اور بے چاری عورت دم بخود کھڑی سوچتی رہ جاتی ہے کہ اس کے ساتھ یہ کیا حادثہ پیش آگیا۔

2۔ اگر ہم کچھ باتوں پر عمل کریں تو آئے دن ہونے والی افسوسناک وارداتوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں مختلف گھروں میں مختلف احتیاطی تدابیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان کی تعمیر کے طریقے پر منحصر ہے کہ چور کو اپنا کام کرنے میں کس طرف سے مدد ملتی ہے اگر حالات اجازت دیتے ہیں تو آپ گھر میں ایسی جگہوں پر الارم فٹ کرا دیں جہاں سے چوری کا خطرہ ہو۔

3۔ سب سے پہلے تو یہ کریں کہ جب آپ کہیں باہر نکلیں یا کسی تقریب وغیرہ میں جانا ہو تو زیادہ بھاری زیورات پہن کر نہ جائیں اگر کبھی ایسی ضرورت پڑ بھی جائے تو پہن کر جانے کی بجائے کسی چیز میں احتیاط سے چھپا کر لے جائیں اور تقریب کی جگہ پر علیحدگی میں پہن لیں۔

4۔ کچھ چور تاڑ لیتے ہیں کہ گھر والے کتنے لاپرواہ ہیں وہ ان کی کمزوریوں کو بھانپ کر ہی اپنے عزائم کی تکمیل کرتے ہیں اور پہلے سے تیار کیے گئے منصوبے کے مطابق اپنے ارادہ میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ گھر سے ٹی۔ وی سے ٹیپ ریکارڈر، گھڑیاں، ٹرانسسٹر نقدی اور زیورات وغیرہ باآسانی اڑا کر لے جاتے ہیں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کبھی بھی سامنے والا دروازہ کھلا نہ چھوڑیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دودھ والے یا دھوبی وغیرہ کے جانے کے بعد آپ بے دھیانی میں دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور چور کو آپ کی اس غلطی کا علم ہوگیا تو جب آپ کچن میں کھانا تیار کر رہی ہوں گی تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب، ہو کر رفو چکر ہو چکا ہوگا۔ اس لئے جب آپ کھانا تیار کر رہی ہوں، پڑوسن سے محو گفتگو ہوں، یا گھر کی اوپر والی منزل پر ہوں تو نیچے کا دروازہ اندر سے بند کر لیں۔ زیادہ نقدی یا زیورات لاپرواہی سے نہ ڈالیں انہیں ہمیشہ ایسی محفوظ جگہ پر رکھیں، جہاں چور کی نگاہ نہ پہنچ سکے اور نہ اس کے دل میں یہ خیال آ سکے کہ سامان یہیں کہیں رکھا ہوگا۔

تشہیر مت کیجیے

آپ جب کبھی گھر سے باہر جائیں تو دروازہ پر کبھی لکھ کر نہ چھوڑیں کہ ہم گھر پر نہیں ہیں۔ اس لئے کل سے دودھ یا اخبار والا اتنے دنوں تک نہ آئے کیونکہ یہ تو چور کو اندر آنے کی جان بوجھ کر دعوت ہے کہ آؤ ہم گھر پر نہیں ہیں تم اپنا مقصد پورا کر لو جب بھی گھر سے باہر جانا ہو تو دودھ اور اخبار والے کو ایک دن پہلے ہی بتا دیں۔ لیکن گھر سے باہر جانے کا اچانک موقع آجائے تو آپ انہیں فون پر بتا دیں، یا گھر کے کسی فرد سے کہیں کہ وہ دکان پر جا کر منع کر آئے۔ دروازے کی چابی کبھی بھی دروازے کے آس پاس نہ چھوڑیں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ دروازہ لاک کرنے کے بعد چابی آس پاس گملے یا لیٹر بکس میں ہی چھپا دی جاتی ہے ظاہر ہے کہ یہ طریقہ غلط بھی ہے خطرناک بھی اور چور کو جان بوجھ کر آسانی سے اندر گھسنے کا موقع عطا کرنا بھی۔

ایسا ظاہر کریں

لمبے وقفے کے لئے جب بھی گھر سے باہر جانا ہو تو ایک آدھ ہلکی لائٹ کھلی چھوڑ دیں تاکہ یہ تاثر پیدا ہو کہ گھر میں کوئی نہ کوئی موجود ہے۔ یا ڈور بیل کے ساتھ ایسا انتظام کرالیں کہ گھنٹی بجنے پر لگے کہ اندر سے کتا بھونک رہا ہے۔

دروازے کھڑکیاں مضبوط ہوں

دروازہ اور کھڑکیاں چوروں کے اندر آنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ ان میں مضبوط لوہے کی جالیاں یا سریے لگوائیں تاکہ چور آسانی سے انہیں نکال نہ سکیں۔

قیمتی چیزیں تالے میں رکھیں

جتنی زیادہ نقدی یا زیورات گھر میں رکھیں گے اتنا ہی زیادہ خطرہ پیدا ہوگا۔ گھر میں ضرورت کے حساب سے ہی پیسے رکھیں باقی رقم بینک میں جمع کرا دیں۔ مہنگے و قیمتی زیورات بنک لاکر میں رکھیں تاکہ وہ پوری طرح محفوظ رہیں۔ نوکروں وغیرہ کے سامنے قیمتی چیزیں نہ نکالیں اور نہ رکھیں۔ روزمرہ کے استعمال میں آنے والی قیمتی اشیا یا روپیہ پیسہ نوکروں یا آنے جانے والے لوگوں کی نگاہوں سے بچا کر رکھیں۔ ایک چھوٹی سی تجوری گھر میں خفیہ جگہ پر نصب کرالیں اور اسی میں قیمتی سامان رکھیں۔ یہ تجوری کسی ایسے کمرے میں بالکل نہ لگوائیں۔ جہاں وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنے۔

اگر ان تمام باتوں کے سلسلے میں احتیاط سے کام لیا جائے تو ہونے والے نقصانات سے بھی بچا جا سکتا ہے گھر سے باہر چند روز رہ کر بھی آپ کو واپسی پر کسی طرح کی پریشانی کا احساس بھی نہیں ہوگا اور روزانہ چین کی نیند بھی سو سکیں گے۔

بقیہ: تھارو قبیلہ

ہو چکی ہوتی ہیں۔ ایک مرد تھارو گلے میں جنگلی جانوروں کی کھال کا منڈھا ہوا بڑا سا ڈھول ٹانگ کر ایک چھڑی سے اسس کو بجاتا ہے اور باقی سارے مرد و عورتیں ڈھول کی تھاپ اور گانے والے کی لے پر ناچنے لگتے ہیں یہ ناچ ایک دائرے کی شکل میں ہوتا ہے اور کافی دیر تک چلتا رہتا ہے۔ لیکن بچوں کی تفریح الگ ہی ہوتی ہے۔ کوئی بھی بزرگ تھارو ایک چارپائی کے قریب حقہ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے اسس کے ارد گرد گاؤں کے بچے اکٹھے ہو کر زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور بزرگ تھارو انھیں جنگلوں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی کہانیاں سناتا ہے۔

اب سے قبل تھاروؤں میں خواندگی نام کو نہیں تھی لیکن جب سے سرکاری ایجنسیاں اور رضاکار تنظیمیں قبائیلی علاقوں میں کام کرنے لگیں تب سے ان میں شعور جاگا ہے۔ اب تو تقریباً ہر گاؤں میں پرائمری اسکول ہیں اور دھیرے دھیرے ان میں تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ چندن چوکی اور کھٹیما کے کئی لڑکے انٹر کالجوں میں بھی پڑھ رہے ہیں۔

تھارو گاؤوں میں مویشیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہر گاؤں میں ضرورت کے اعتبار سے دو یا تین باڑے بنا لئے جاتے ہیں جس میں سارے گاؤں کے مویشی رہتے ہیں۔ مویشیوں میں بھینسوں اور بکریوں کی تعداد تو نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ ان جانوروں کو تو وہ اپنی خوراک بنا لیتے ہیں لیکن گائے اور بیلوں کی بہتات ہے۔ ایک ایک گاؤں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو یا دو دو سو تک گائے و بیل ہوتے ہیں لیکن یہ سب اچھی نسل کے نہیں ہوتے۔ گائے کا دودھ بھی یہ لوگ نہیں نکالتے۔ ان مویشیوں کو صرف بیل حاصل کرنے کے لئے پالا جاتا ہے تاکہ ان سے زرعی کام لیا جا سکے۔ گاؤ کشی تھارو قبیلہ میں بھی ممنوع ہے۔ تھارو گاؤوں میں مرغیاں سب سے زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔

بھلائے نہ بنے

میری زندگی میں جو ٹریجڈی ہوئی ہے اس کی ٹیسیں میرے ذہن و ضمیر کو بے چین کیے رہتی ہیں۔ لاکھ چاہتی ہوں کہ ماضی کی ان تلخ یادوں، اپنی نادانیوں اور ایک قریبی سہیلی کی خود غرضیوں کو فراموش کر دوں مگر ایسا کرنا شاید میرے بس میں نہیں ہے۔

میں اور میری عزیز سہیلی رخسانہ نویں کلاس سے بی اے تک ساتھ رہے۔ حصولِ تعلیم اور گھریلو حالات کے چکر میں ہم دونوں کی عمریں کچھ زیادہ ہو گئیں، رخسانہ چوں کہ بے حد خوبصورت، ذہین اور اسمارٹ تھی اس لیے اس کی شادی کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہیں تھا۔ البتہ میرے والدین میری شادی کی طرف سے اس قدر فکرمند و پریشان تھے کہ انھوں نے میرے ارمانوں، میری آرزوؤں اور میرے جذبات کی پروا کیے بغیر میرے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کر لیا جو بہت بڑی دولت و جائداد کا مالک تھا مگر اس کی عمر بھی مجھ سے کافی زیادہ تھی اور وہ اپنی بیوی کو اس وجہ سے طلاق دے چکا تھا کہ بارہ برس تک اولاد کی دولت سے اس نے اپنے گھر کو محروم رکھا تھا۔

وہ مرد کچھ تو خود مجھے ہی پسند نہیں تھا، کچھ اس کو میرے دل سے اتارنے میں میری سہیلی رخسانہ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس نے میرے اس قدر کان بھرے کہ میں نے اپنے شوہر کو منہ نہ لگانا اپنا شیوہ بنا لیا۔ ہماری ازدواجی زندگی دوزخ تو بن ہی چکی تھی اس کی حدّت اس وجہ سے اور بڑھ گئی کہ تین برس تک میرے یہاں بھی اولاد نہیں ہوئی اور میں نے اس کے لیے اپنے شوہر کو موردِ الزام قرار دینا شروع کر دیا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ پہلے تو میں اپنے میکے میں بیٹھی رہی اور پھر خالد سے وہ بندھن ہمیشہ کے لیے توڑ لیے جن میں میرے بزرگوں نے مجھے جکڑا تھا۔

میں یہ سوچ کر مطمئن اور پُرسکون تھی کہ میرا فیصلہ قطعی صحیح اور درست تھا، اکثر یہ سوچ کر مجھے خود پر غصہ بھی آتا تھا کہ اس قدر بدشکل مرد کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے تین قیمتی سال کیوں گزارے، میں مشکور تھی کہ اپنی سہیلی رخسانہ کی جو مجھے خالد سے تمام رشتے منقطع کر لینے کے مشورے اکثر دیتی رہتی تھی مگر ——— اسوقت میری حیرت، تعجب اور افسوس کی کوئی انتہا نہ رہی جب میری طلاق کے چند ماہ کے اندر ہی رخسانہ، خالد کے اس قدر قریب آئی کہ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ اب کبھی وہ مجھے ملتی ہے تو طنزیہ نگاہوں سے دیکھ کر اس طرح مسکراتی رہتی ہے جیسے کہہ رہی ہو "تم نے مجھ پر بھروسہ کرنے کی بیوقوفی ہی کیوں کی، تم نے مجھے مخلص اور ہمدرد ہی کیوں جانا۔ میرے ورغلانے میں آ کر سر کے جس تاج کو تم پیر کی جوتی سمجھنے لگی تھیں اس کی قدر و قیمت میں سمجھ رہی تھی، تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو اور شرمندہ رہو گی، مگر ——— میں خوش ہوں، بہت خوش"۔

سوچتی ہوں کہ شہر چھوڑ کر کہیں دور، بہت دور چلی جاؤں، اتنی دور کہ جہاں رخسانہ کی یاد تک نہ پہنچ سکے مگر ——— ایسا ممکن نہیں ہے، نہ میں اسے بھول سکتی ہوں، نہ اپنی تباہی کی داستان کو اور نہ ان غلطیوں کو جو رخسانہ کو اپنا سمجھنے کے سلسلے میں مجھ سے سرزد ہوئیں۔

شاہدہ شیخ، بمبئی

قدامت پرست خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ملازمت کر کے بھی ان کا بوجھ کم نہیں کر سکتیں۔ جی میں آتا ہے خودکشی کر لیں۔ مگر ایسا بھی نہیں کر سکتیں کیوں کہ ایسا کرنا مذہبًا حرام ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ ہم کیا کریں؟

——— ناصرہ، صابرہ، شاکرہ (دہلی)

ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ جہیز کی لعنت نے بہت حد تک معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے لیکن اگر آپ جیسی تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی محض خاندان کی جھوٹی شان بنائے رکھنے کے لیے اپنے اور اپنے خاندان کے تمام افراد کے لیے پریشانی کا باعث بن جائیں گی تو یہ مسئلہ اور بھی مشکل ہو جائے گا آپ کو تو چاہیے کہ ان بہنوں کے لیے ایک مثال بنیں جو غیر تعلیم یافتہ خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور خود بھی تعلیم حاصل نہیں کر پاتیں۔ ویسے تو نوکری کرنے میں بھی کوئی برائی نہیں لیکن اگر یہ ممکن نہیں تو ایسے بہت سے کام ہیں جنھیں گھر بیٹھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف ایک آمدنی کا ذریعہ پیدا ہو گا بلکہ خود اعتمادی بھی حاصل ہو گی۔

س: میری عمر زیادہ ہو گئی تھی، صورت شکل کے معمولی ہونے کی وجہ سے کوئی مناسب رشتہ نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے میرے چچا نے اپنے بھائی سے ہمدردی کے طور پر اپنے بیٹے سے میری شادی کرا دی۔ مگر میری بدقسمتی کہ وہ مجھ سے عمر میں تقریبًا سات برس چھوٹے ہیں قبول صورت بھی ہیں اور تعلیم یافتہ بھی۔

ظاہر ہے کہ ان کے لیے مجھے یوں آسانی سے قبول کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ لہٰذا وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ شادی کے پہلے دن سے آج تک انھیں مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ بتایئے میں کیا کروں؟

——— ش۔ ا، گونڈہ (دہلی)

ج: عورت کی خوبصورتی محض اس کے حسن اور عمر تک محدود نہیں ہے۔ آپ اپنی ظاہری صورت پر زیادہ توجہ نہ دے کر باطنی شخصیت پر دھیان دیں اور اپنے عمل سے اپنے خاوند کے دل میں اپنے تئیں پیار پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن غیر ممکن نہیں۔ آپ اور آپ کے خاوند اسلام سے وابستہ ہیں جس کے آخری رسولؐ نے اپنی عمر سے تقریبًا پندرہ برس بڑی خاتون (خدیجۃ الکبریٰ) سے شادی کی اور ان ہی کو تمام ازواجِ مطہرات میں فوقیت حاصل تھی آپ اپنے سامنے ان کا مثالی کردار رکھیں اور خود کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لیں کہ آپ کے خاوند صرف اور صرف آپ ہی سے محبت کریں۔

میری الجھن

س: میں جس دفتر میں کام کرتی ہوں وہ میرے گھر سے کافی دور ہے، آنے جانے میں پریشانی کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی پریشانی بس کے سفر میں مردوں کا بیہودہ رویہ ہے، بتایئے میں کیا کروں؟

——— شگفتہ۔ دربھنگہ

ج: جب آپ روزانہ بس کے ذریعے دفتر جاتی ہیں تو یقینًا بہت سے ایسے بھی لوگ آپ کے ساتھ جاتے ہوں گے جو آپ ہی کی طرح روز اسی بس سے سفر کرتے ہوں، انھیں اپنی پریشانی کے بارے میں بتا کر ہمدردی حاصل کیجیے اور ایسے لوگوں کی بے خوف ہو کر مقابلے کی عادت ڈالیے جن سے آپ ڈر محسوس کرتی ہیں۔

س: ہم چھ بہنیں ہیں۔ ہمارے والد ایماندار ریٹائرڈ پولیس افسر ہیں انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہماری تین بہنوں کی شادی کر دی تھی مگر ہم تین بہنیں تعلیم یافتہ اور قبول صورت ہونے کے باوجود محض اس وجہ سے ابھی تک کنواری ہیں کیوں کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے یہاں سے انھیں مناسب جہیز نہیں مل سکے گا۔ ہم لوگوں کی عمریں جیسے جیسے گزرتی جا رہی ہیں۔ ہمارا یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ ہم والدین پر بوجھ ہیں۔ ہم

حُسن سے صحت کا رشتہ

عظیم اقبال

مُصوّر رنگوں سے اور شاعر لفظوں سے حسن کا پیکر تراشتا ہے۔ بقول فانی:

گلِ تر، سروِ رواں، نرگسِ شہلا ئے چمن
صدقے آنکھوں کے، فدا قد پہ، نثارِ عارض

خوبصورتی سب کو بھاتی ہے، لیکن ممکنہ طور پر یہ علم آپ کو نہیں ہوگا کہ خوبصورتی کا صحت سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔

امریکہ کے جامعہ کنیکٹی کٹ، (CONNECTICUT UNIVERSITY) کی ڈاکٹر امیریگو فیرنیا، اور معالجاتی نفسیات داں، ڈاکٹر ایڈورڈ فیشر نے کچھ خوبصورت خواتین کو لے کر اپنی تحقیق مکمل کی ہے۔ اپنے تین برسوں کی جانفشانی کے بعد تیار تحقیقی مقالوں میں ان لوگوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ پُرکشش شخصیت صحت مند جسم کی بنیاد ہوتی ہے۔ عام طور پر خوبصورت خواتین کم بیمار ہوتی ہیں اور اگر بیمار ہو بھی جائیں تو کم خوبصورت خواتین کی بہ نسبت جلد صحت یاب ہو جاتی ہیں۔ یعنی پُرکشش شخصیت کا ذہن اور جسمانی صحت سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔

خوبصورتی کے معاملے میں 'پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا' کی بات نے خاصی پریشانی پیدا کی۔ مطالعہ کے آغاز میں ڈاکٹر فیرنیا اور ڈاکٹر فیشر کو اس بات نے الجھایا کہ آخر خوبصورت کہا کسے جائے۔ ہر معاشرہ میں خوبصورتی کے کچھ مخصوص اور متعین معیار ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک دہقانی دوشیزہ جتنی اچھی ایک دہقانی نوجوان کو لگے گی، اتنی شہری نوجوان کو نہیں لگے گی۔ ٹھیک اسی طرح میک اپ میں سجی دھجی 'جدید پوشاک میں ملبوس شہری دوشیزہ' شہری نوجوان کو جتنا بھائے گی، اتنی گاؤں کے نوجوان کو نہیں۔ مطالعہ میں ایک ہی شہر کے دو معاشروں میں بھی خوبصورتی کی پرکھ کرنے والوں کی الگ الگ رائے پائی گئی۔ آخرکار 'خوبصورتی' کا معیار تلاش کرنے کا راستہ ڈھونڈھ ہی لیا گیا۔ محققین نے پہلے اپنی ہی سُوجھ بُوجھ کی بنیاد پر پُرکشش خواتین کا انتخاب کیا۔ ان میں کچھ ملازمت پیشہ کچھ طالبات اور کچھ گھریلو خواتین تھیں۔ ان سبھی خواتین میں یکسانیت یہ تھی کہ وہ پُرکشش اور من موہک جسمانی ساخت کی مالک تھیں۔ محققین نے ان تمام خواتین کے الگ الگ فوٹو کھنچوائے اور اچل بڑے خوبصورتی کی پیمائش کی تلاش میں خواتین کی ان تصویروں کو کئی مردوں کو دِکھلایا گیا، اور ان کی رائے زنی کی بنیاد پر ایک ماسٹر لسٹ (MASTER LIST) تیار کی گئی۔ اپنی اس مہم میں محققین نے پایا کہ مردوں نے اپنا فیصلہ بڑا ہی درست دیا۔ پرکھ کرنے والوں نے ذہنی نقطۂ نگاہ سے صحت مند عورتوں کو خوبصورت بتایا، جبکہ ذہنی طور پر بیمار خواتین کی تصویر دیکھ کر انھوں نے عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔

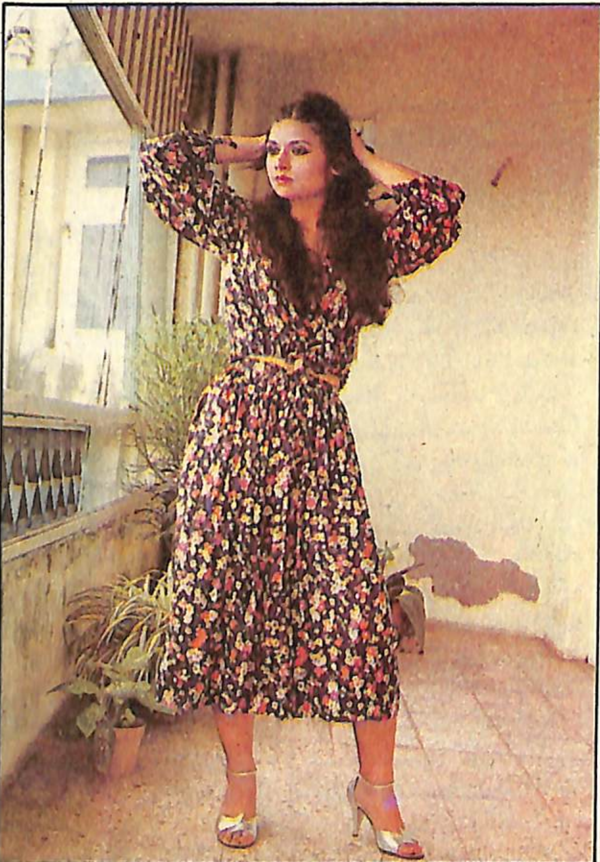
محققین نے اپنے مطالعہ کو دو مخصوص سوالوں میں تقسیم کر دیا۔ اوّل، کیا عام عورت کے مقابلتاً زندگی میں بے ضابطہ رہنے والی خواتین جسمانی نقطۂ نگاہ سے کم پُرکشش ہوتی ہیں؟ اور دوئم، کیا ذہنی امراض کے اداروں میں جسمانی نقطۂ نظر سے پُرکشش دکھائی دینے والے لوگوں کے درمیان رہنے والی مریض خواتین پر خوبصورتی کے نقطۂ نظر سے کچھ اثر پڑتا ہے؟

اپنے پہلے سوال کا جواب تو محققین کو خواتین کی تصویروں کے ذریعے ہی مِل گیا مگر دوسرے سوال کے لیے ان محققین نے ذہنی امراض کے شفاخانے کا انتخاب کیا۔ یہاں خاتون مریضوں کے ہمراہ شفا خانے کے ماحول سے لے کر عملے کے لوگوں کے رویے تک کا مطالعہ کیا گیا۔

ڈاکٹر فیرنیا نے اپنے مطالعے میں پایا کہ عورتوں کی خوبصورتی پر شفا خانے کے ماحول کا خاص اثر پڑتا ہے۔ اپنی تحقیق میں انھوں نے پایا کہ جو بیمار خواتین خوبصورت تھیں وہ جلد ہی ٹھیک ہو کر شفا خانے سے رُخصت ہو گئیں جبکہ وہ جو خوبصورت نہ تھیں دیر تک شفا خانے میں رہیں۔

بقول شخصے:

اچھے ہوتے زمانے کے بیمار سیکڑوں
دل وہ مریض ہے کہ ابھی زیرِ غور ہے



اب جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آخر خوبصورت مریض خواتین جلد ٹھیک کیوں ہو جاتی ہیں اور جو خوبصورت نہیں ہوتیں، دیر تک مریض کیوں بنی رہتی ہیں؟ دراصل ایسی مریضائیں جو خوبصورت نہیں ہوتیں ان میں خود کے لیے کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ یعنی وہ خود کو کمتر سمجھتی ہیں اور چڑچڑی بنی رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان سے مِلنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ ان کے دوست بھی کم ہوتے ہیں۔

بقول میر:

جبر ہے، قہر ہے، قیامت ہے
دِل جو بے اختیار ہوتا ہے

سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ اپنے آپ کو کسی سے کم نہ سمجھیے۔ اپنے اندر سے احساس کمتری کو نکال لیے۔ یہ سوچ کر چپ مت بیٹھ جائیے کہ ارے وہ تو ہم سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یا پھر وہ زیادہ ہوشیار ہے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کیجیے۔ جھجھک نکال لیے کھل کر بات کیجیے، ہنس کر بات کیجیے۔ اس کے علاوہ جس سے آپ جیسا برتاؤ چاہتی ہیں اس سے بھی ویسا ہی برتاؤ کیجیے۔

ڈاکٹر فیرنیا نے اپنے مطالعے میں پایا کہ بد صورت اور چڑچڑی خواتین کے ساتھ شفا خانے کے عملے کا سلوک بھی بہت رُسوا کن رہا ہے۔ وہ ایسے مریضوں سے نالاں رہتے ہیں اور ان کے کام میں ٹال مٹول کرتے ہیں، جبکہ خوبصورت خواتین کے ساتھ عملے کے لوگوں کا سلوک کافی خوشگوار رہتا ہے۔ وہ ان کی صحت کے متعلق پوچھ گچھ کرتے رہتے ہیں اور ان کے جلد صحت یاب ہونے کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فیرنیا کا خیال ہے کہ اگر بدصورت خواتین کسی خوبصورت ماہر سے مل کر اپنے روپ پر خاص دھیان دیں، ساتھ ہی اپنی گفتگو کے ڈھنگ اور رویے میں تبدیلی لائیں تو ان کے ذہنی عدم توازن میں اصلاح ہوگی۔ اور ذہنی صحت میں سدھار ہوگا۔

اگر آپ خوبصورت نہیں تو دل چھوٹا نہ کیجیے۔ خوب سیرت بنیئے۔ آپ کی خوب سیرتی آپ کی عدم خوبصورتی پر غلبہ پالے گی۔ جو آخرکار آپ کی ذہنی و جسمانی صحت کی ضامن بن جائے گی۔ بقول شاعر:

حسنِ صورت کے لیے خوبیٔ سیرت ہے ضرور
گُل وہی، جس میں کہ خوشبو بھی ہو رنگت کے سوا

تربیت یافتہ کتے

ڈاکٹر نُدرت حُسین



پچھلے دنوں اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ بنگلہ دیش سے لگی مُلک کی مشرقی سرحد کی حفاظت کے لئے نادیا اور ضلع مُرشد آباد میں تربیت یافتہ کُتّے تعینات کئے گئے ہیں، انسان کی کتّوں سے دوستی اور تعلق کی یہ کہانی بہت پُرانی ہے، جب انسان غاروں میں رہا کرتا تھا تب سے یہ دوستی قائم ہے، دُنیا کے مختلف علاقوں میں کتّوں کا الگ الگ طریقے سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ افریقہ میں شکاری کُتّے، شیر کو شکار کے لئے گھیرنے کے کام لائے جاتے ہیں تو آسٹریلیا میں چرواہے بھیڑوں کی نگرانی کے لئے کُتّوں سے مدد لیتے ہیں یا سائبیریا وغیرہ کے برفیلے علاقوں میں کتّوں سے گاڑی (سلیج) کھینچنے کا کام لیا جاتا ہے اور گھر کی پہرے داری کے لئے تو کتے کا استعمال بہت ہی عام بات ہے،

> **کتے کلر "بلائنڈ" ہوتے ہیں یعنی مختلف رنگوں کو پہچاننے کی صلاحیت ان میں بالکل نہیں ہوتی۔**

آیئے آج آپ کو ایسے اسکول کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں جہاں کتوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے اور پھر یہ تربیت یافتہ کُتّے مختلف طریقوں سے ہمارا ہاتھ بٹاتے ہیں، یہ غیر ملکی جاسوسوں اسمگلروں اور دشمنوں سے ملک کی سرحد کی حفاظت کرتے ہیں اور اندرونِ ملک دہشت گردوں، مجرموں اور لٹیروں کو پکڑنے اور اُن کے ہتھیاروں کے خُفیہ ذخیروں کو تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

مدھیہ پردیش میں گوالیار سے 35 کلو میٹر دور، گوالیار، جھانسی شاہراہ پر ٹیکن پور بہت ہی پُر فضا، ہرے بھرے جنگلوں اور اُونچی نیچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ایک خوبصورت مقام ہے، اسی ٹیکن پور میں کتوں کا یہ اسکول واقع ہے اور اس کا نام ہے "نیشنل ٹریننگ سینٹر فار ڈوگس" یعنی "کتوں کی تربیت کا قومی ادارہ"۔۔۔ یہ ادارہ 1965 میں قائم کیا گیا تھا اور بارڈر سیکیورٹی فورس کی نگرانی میں چلایا جا رہا ہے، یہاں کتوں کی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ اُن کے نگراں ملازموں یعنی "ہنڈلروں" کو بھی ٹریننگ دی جاتی ہے، یہاں بی، ایس، ایف کے علاوہ ریاستی اور مرکزی پولس کے لئے بھی کتّوں کو تربیت دی جاتی ہے۔

یہاں ہر سال سو کتوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ اور یہ تربیتی کورس سال میں چار مرتبہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شروع کئے جاتے ہیں۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ کُتّے میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اسے جاسوسی اور تلاشی کے کام کے لئے چُنا گیا، مختلف تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ کُتّے "کلر بلائنڈ" ہوتے ہیں یعنی مختلف رنگوں کو پہچاننے کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی لیکن دوسری طرف قدرت نے کتّوں کو سننے اور سونگھنے کی بے انتہا صلاحیت دی ہوئی ہے، مناسب سائنٹفک تربیت کے ذریعہ کتّوں کی اس صلاحیت سے جرائم کی تحقیقات اور مجرموں کی تلاش میں مدد لی جاتی ہے۔

ویسے تو کتّوں کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن جاسوسی کے لئے عموماً تین نسلوں کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ (۱) اَلسیشین (۲) لے بَراڈور (۳) ڈوبرمین ان تین نسلوں میں سونگھنے کی صلاحیت دوسرے کتوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ جاسوسی کے لئے موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ جن کتّوں کو تربیت کے لئے چُنا جاتا ہے اُن کی صحت کا شروع ہی سے خیال رکھا جاتا ہے۔ روزانہ صبح ½8 سے 9 بجے تک کتّوں کی صفائی کی جاتی ہے پھر ایک گھنٹہ آرام کا موقع دیا جاتا ہے اس کے بعد ناشتہ کرایا جاتا ہے جس میں دودھ، انڈے اور روٹی شامل ہوتی ہے، شام کے کھانے میں گوشت، چاول اور روٹی کا اہتمام کیا جاتا ہے، ہر دوسرے دن، اُن کے رہنے کی جگہ کو جراثیم کش دواؤں سے دھو کر صاف کیا جاتا ہے، لگنے والی بیماریوں سے حفاظت کے لئے کتّوں کو ہر سال اے، آر، وی اور ڈی، ایچ، ایل وغیرہ کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں کُتّے کی تربیت 6 ماہ کی عمر سے ہی شروع کر دی جاتی ہے، ہر کُتّے کے لئے ایک علاحدہ نگراں (ہنڈلر) ہوتا ہے، کامیاب تربیت کے لئے نگراں کو کُتّے کا اعتماد اور محبت حاصل کر لینا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ کتا صرف اُسی کے اشاروں پر کام کرتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے لہٰذا تربیت کا پہلا قدم یہی ہوتا ہے۔ جب نگراں کُتّے کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو تربیت کا اگلا دور شروع ہوتا ہے، اس میں حکم سمجھنا اور اُسے ماننا سکھایا جاتا ہے، صبح 6 سے ½8 بجے تک کتّوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے اس میں بیٹھو، اُٹھو رسّی لگا کر بائیں چلو، بغیر رسّی لگائے بائیں جانب چلو، کسی اجنبی کے ذریعے دیے گئے کھانے کو نہ کھاؤ وغیرہ احکامات سمجھائے جاتے ہیں اور اس میں عام طور پر 3 ماہ کا وقت لگتا ہے۔

اب ہوتا ہے کتّوں کا امتحان کہ اس 3 ماہ کی ٹریننگ میں کیا سیکھا، جو کُتّے اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں صرف انھیں ہی آئندہ، اسپیشل ٹریننگ کے لئے چُنا جاتا ہے، اس میں مجرموں کی تلاش، آتش گیر مادّوں کی تلاش نشہ آور اشیاء کی جستجو، مختلف قسم کی رکاوٹوں کو پار کرنا، اسمگلروں اور چوری چُھپے سرحد میں گھسنے والوں پر نظر رکھنا اور پہرے داری وغیرہ کی خصوصی طور پر تربیت دی جاتی ہے، اس اسپیشل ٹریننگ کی مدّت تقریباً 9 ماہ ہے اس طرح ایک کُتّے کی پوری تربیت ایک سال میں مکمّل ہوتی ہے ۔۔ عموماً کتوں کو دن میں ڈیوٹی دینے کے لئے تربیت دی جاتی ہے مگر

> **مجرموں کی تلاش، آتش گیر مادوں کی تلاش، نشہ آور اشیا کی جستجو وغیرہ کے کتوں کو خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔**

بعض خاص مواقع کے لئے جیسے اسمگلروں یا دہشت گردوں کے سرحد میں داخلے کو روکنے کے لئے رات کے وقت بھی ڈیوٹی دینے کے لئے کچھ کتّوں کو خصوصی تربیت دی جاتی ہے اور پھر یہ تربیت یافتہ کتّے بی، ایس، ایف اور ریاستی یا مرکزی پولیس کو اُن کی ضروریات کے اعتبار سے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ زندگی کے رُخ کو بدلنے کے لئے مناسب تربیت کس قدر اہم ہے، آیئے ہم بھی عہد کریں کہ اپنے ماں باپ، استادوں اور بڑے لوگوں کے بتائے ہوئے صحیح راستے پر چلیں گے پھر انشاء اللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔

ان کے جذبات کو نظرانداز نہ کریں

راج جین

کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جو بچوں کے دلوں میں جوش و ولولہ بھر دیتی ہیں۔ اکثر گھر کے بڑے یا سرپرست ان باتوں کو یا تو نظرانداز کر دیتے ہیں یا پھر انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔



بچوں میں جلن کا مادہ، ضدی پن جیسے جذبے آپ کے تفریق بھرے برتاؤ سے ہی پنپتے ہیں۔ گھر میں جتنے بچے ہیں ان سب سے ایک جیسا برتاؤ کیجیے۔ پڑھنے میں تیز، خوبصورت اسمارٹ بچے پر زیادہ دھیان دینا دوسرے بچوں کی نگاہوں سے چھپا نہیں رہے گا۔ اسی طرح لڑکے کو زیادہ پیار و محبت دینا لڑکی کے دل میں تلخی کے بیج بو دے گا۔ بچوں کے دلوں میں کسی طرح کا غلط جذبہ پیدا نہ ہو اس کے لئے آپ کو چاہیے کہ اپنے پیار کو برابر سے تقسیم کریں تبھی سب بچوں کا جسمانی اور ذہنی ارتقاء ہو پائے گا۔ ہر بچے کا سوچنے کا انداز اور شوق مختلف ہوتے ہیں اگر آپ ایک کی پسند دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کریں گے تو بچے کی شخصیت اور ذاتی ارتقاء رک جائے گا۔ ہر وقت کی فرمائش پوری نہ کرتے ہوئے سبھی کے شوق کو سلسلہ وار پورا کیجئے تو بچے آپ سے زیادہ خوش رہیں گے۔

غلطیاں ہونا فطری ہے۔ بچوں میں بھی خودداری ہوتی ہے۔ دوسروں کے سامنے ڈانٹ سننے پر بچے اپنے آپ کو زیادہ بے عزت محسوس کریں گے اور ایسے وقت میں ان کے دل میں آپ کے لئے مخالف ردعمل پیدا ہوگا، غصے اور نفرت کا جذبہ ان میں پنپے گا۔ غلطی پر ڈانٹئے سمجھایئے لیکن سب کے سامنے نہیں۔ اکیلے میں اور وہ بھی پیار سے اس طرح بچہ آپ کی بات کا برا نہیں مانے گا اور وہ دوبارہ ایسی کوئی غلطی بھی نہیں کرے گا جس کے لئے آپ نے اُسے نصیحت کی ہے۔

بچوں کے لئے ہر چیز نئی ہوتی ہے، اس نئی چیز کے بارے میں جاننے کی اسے خواہش بھی رہتی ہے۔ ایسے میں کچھ پوچھنے پر اسے ٹالنے اور جھڑکنے کی بہ نسبت اطمینان سے سنئے اور سیدھی سادی زبان میں اس کا حل بھی نکالئے۔ اس سے بچے کا ذہنی ارتقاء ہوگا۔ جنرل نالج تو بڑھے گی ہی ساتھ ہی وہ اپنا ہر مسئلہ تجسس اور گتھی کو سلجھانے میں آپ کے پاس آنے میں ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں کرے گا۔ آپ کے ساتھ نہ دینے پر وہ اپنے دل میں اُلٹا سیدھا سوچے گا۔ مطمئن نہ ہونے پر طرح طرح کی غلط باتیں اس کے دل میں پنپتی رہیں گی جو یقیناً اس کے مستقبل کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔

بچوں کی اچھی عادتوں میں دلچسپی لیجئے اس کے یوم پیدائش یا کسی اور پارٹی میں آپ بھی خوشی خوشی شامل ہوں۔ اس کی کسی بھی بات پر اسے حکم نہیں مشورہ دیں۔ پابندی لگانے کی بہ نسبت خود ہی اس کا ساتھ دیں۔

خالی وقت میں جب بچے کھیل رہے ہوں تو آپ بھی ان کے ساتھ بچہ بن کر کھیلئے۔ یہ سب معمولی سی باتیں ہیں مگر ان کی کمی کے سبب بچوں کی خوداعتمادی ڈگمگا جاتی ہے اور ان کی شخصیت کا پوری طرح ارتقاء نہیں ہو پاتا۔ چونکہ آپ کے اپنے برتاؤ پر بچوں کا مستقبل منحصر ہے۔ اس لئے ہر قدم پر ہمیشہ ان کا ساتھ دیں، ان سے پیار اور محبت سے پیش آئیں۔

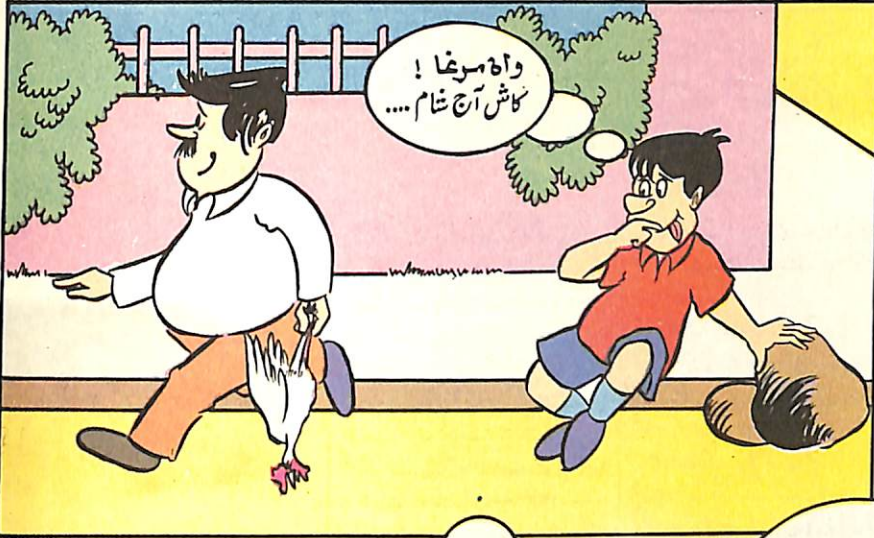


عامر

تصویری کہانی : او پی شرما

مرغ کی چوری



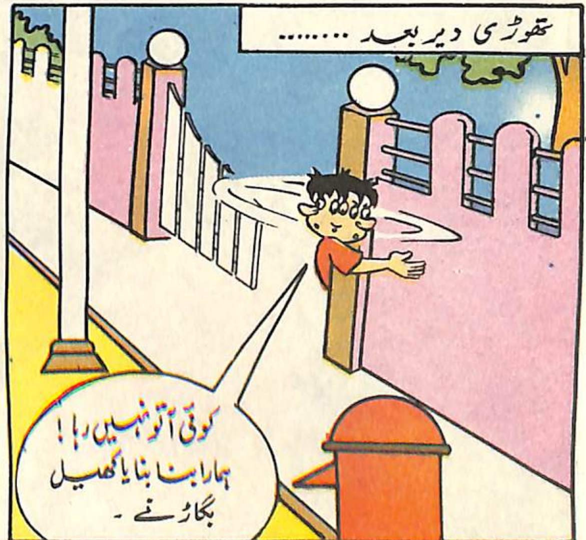




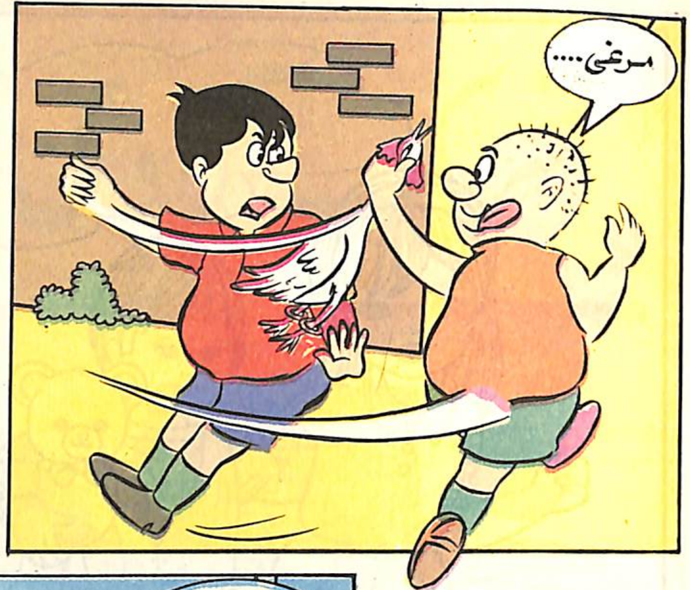






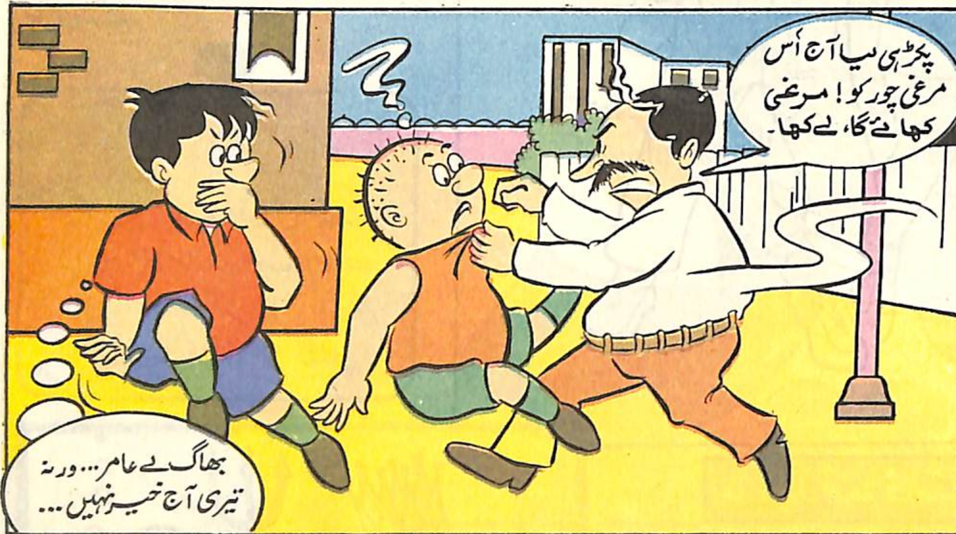





مرغی....


دیکھ کالو میری مرغی
مجھے واپس لوٹا دے
نہیں تو.......


غصّہ مت کر یار!
تو تو جانتا ہے کہ میں کتنا اچھا چکن
بناتا ہوں۔ چل آج تیری
مرغی میرے گھر ہی سہی۔


پکڑ ہی لیا آج اُس
مرغی چور کو! مرغی
کھائے گا، لے کھا۔
بھاگ لے عامر... ورنہ
تیری آج خیر نہیں...


چٹاخ
ڈھشم
بچاؤ
مار ڈالا
دھڑام
تاڑ


گھبرا کیوں رہے ہو
عامر! تمہاری وجہ سے ہی تو یہ
مرغی چور آج میری پکڑ میں آیا ہے
اس لئے یہ مرغی تم انعام میں رکھ لو۔


لیکن انکل آپ نے اپنی
مرغی پہچانی کیسے؟
ان چھلّوں سے
ختم شد

رنگ بھرو انعامی مقابلہ 8

بچوں کے لیے رنگ بھرو کے عنوان سے جاری انعامی مقابلے میں شرکا کی تعداد چونکہ کافی ہے۔ اس لیے ادارے کے فیصلے کے مطابق سب سے خوبصورت اور صاف ستھرے خاکے پر پہلا انعام، 100 روپے، دوسرا انعام 50 روپے اور تیسرا انعام 25 روپے دیا جائے گا۔ رنگ بھرو مقابلہ نمبر 8 میں شرکت کی آخری تاریخ 10 ستمبر ہے۔ اس مقابلے میں انعام پانے والوں کے نام 15 اکتوبر کے شمارے میں شائع کیے جائیں گے۔

پتہ

رنگ بھرو انعامی مقابلہ
ماہنامہ "راشٹریہ سہارا" (اردو)
سی 3، سیکٹر 11، نوئیڈہ
ضلع غازی آباد (یو۔ پی)

نتیجہ انعامی مقابلہ نمبر 6



پہلا انعام

فیروز بابر
معرفت زینت صاحبہ، نزد شیر خاں اسکول،
صوفی ٹولہ، بریلی (یو پی)



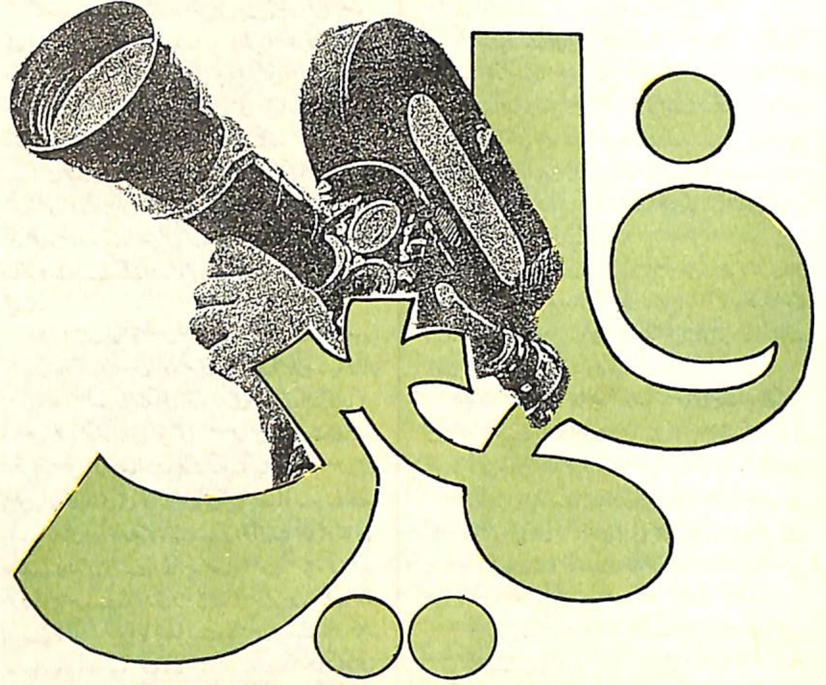
دوسرا انعام

محمد ضیاء الدین شاکر
مکان نمبر 122۔11۔3 محلہ مکہ مسجد،
محبوب نگر 509001 (اے۔ پی)

تیسرا انعام

خالد اُمِ (مُنّا)
معرفت غلام رسول، چندوارہ، مقرتی، مظفر پور۔ 842001 (بہار)

تحریک آزادی اور



نند کشور وکرم

سودیشی تحریک، اچھوت اُدھار، دیہی بدحالی، بیوہ کی شادی، زمینداری نظام کے خلاف جیسے موضوعات پر بھی بہت سی فلمیں بنیں۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں نمایاں رول ادا کرنے والی سیاسی اہم جماعت انڈین نیشنل کانگریس اور سنیما کی تاریخ لگ بھگ ایک ساتھ ہی شروع ہوتی ہے 1885 میں اے۔او۔ہیوم نے مختلف قومی رہنماؤں کے اشتراک سے ڈبلیو سی بینرجی کی صدارت میں اس پارٹی کی بنیاد رکھی تھی اور اسی سال مشہور سائنس دان مائی برج نے فلم دکھانے کے آلے "پروجیکٹر" کی ایجاد کی تھی اور اس کے ذریعہ فلم کو پردے پر چلتے پھرتے دکھایا تھا۔ تاہم ہندوستان میں سنیماٹوگراف کی پہلی نمائش 7 جولائی 1896 کو فرانس کے لومیر برادران کے ذریعہ بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں ہوئی اور پھر ملک کے مختلف شہروں میں فلموں کے شو ہونے لگے جن کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہندوستان میں بھی فلمیں بننے لگیں۔ یہ وہ عہد تھا جب ہمارے ملک میں سیاسی اور سماجی تحریکات زوروں پر تھیں لہٰذا فلمیں بھی ان سے غیر متاثر نہ رہ سکیں اور ہندو مسلم اتحاد، سودیشی تحریک، اچھوت اُدّھار، دیہی بدحالی، بیوہ کی شادی، زمینداری نظام کے خلاف بغاوت جیسے امور پر بھی فلموں کی تخلیق کی گئی۔ چونکہ ان دنوں گاندھی جی کی شخصیت اور کردار و گفتار سے ہر فرد متاثر تھا اس لئے فلمی دُنیا بھی اُن سے بے نیاز نہ رہ سکی۔ فلموں میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ گاندھی جی کے خیالات و افکار اور آزادی و حریت کی تبلیغ و تشہیر کی جانے لگی۔

گو خاموش فلموں کے دور میں گونگے کرداروں کی وجہ سے کسی فکر و نظریہ کی تبلیغ انتہائی مشکل کام تھا تاہم اس دور میں بھی گاندھی واد اور آزادیٔ وطن کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کے لئے فلمسازوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور اس سلسلے میں انگریزی سرکار کے عتاب کا شکار ہوئے نیز اُن کی فلموں کے متعدد

> ان دنوں انگریز گاندھی جی سے اتنے خوفزدہ تھے کہ فلم "مہاتما" پر اعتراض کیا تب مجبوراً اس فلم کا نام بدل کر "دھرماتما" کر دیا گیا۔

حصے سینسر کی قینچی کی نذر ہو گئے۔

تیسرے دہے کے آغاز میں خاموش دور کے مشہور ہدایت کار ڈین این سمیت نے جو فرینڈز اینڈ کمپنی کے حصہ دار بھی تھے گاندھی جی کے کردار و شخصیت سے متاثر ہو کر "بھگت وِدُر" نامی فلم تیار کی اور اس میں وِدُر کا رول خود ادا کیا۔ اسی طرح جب ملک میں باردولی تحریک زوروں پر تھی تو اس سے متاثر ہو کر جینت ڈیسائی نے اپنی فلم "امر کیرتن" میں مذکورہ تحریک کے کئی مناظر بھی پیش کئے جس پر برطانوی حکومت نے اسکی نمائش کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

تیسرے دہے کے اواخر میں جب کیتھرائن میئو کی ہندوستان دشمن تصنیف 'مدر انڈیا' منظرِ عام پر آئی تو ملک کے عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور اس کے ردِ عمل میں فلم 'ہندوستان کی بیٹی' تیار کی گئی جس کے ہدایت کار این ڈی داورے تھے۔

اسی عہد کی ایک اور قابلِ ذکر فلم تھی۔ "بم" جس میں ملکی اور غیر ملکی حکمرانوں کے اقتدار کی کشمکش دکھائی گئی تھی۔ سینسر کے اعتراض کرنے پر اس کے بہت سے مناظر کاٹ دیے گئے اور نام بدل کر "وسنت بنگال" کر دیا گیا۔

1930 میں خاموش فلموں کے دور کے مشہور ہدایت کار آر۔ ایس۔ چودھری کی تہلکہ آمیز سیاسی فلم "دی ریتھ" منظرِ عام پر آئی جو گاندھی جی کے آدرشوں کو پیشِ نظر رکھ کر بنائی گئی تھی اس میں چھوت چھات، فرقہ پرستی اور جہالت پر وار کیا گیا تھا۔ اس میں پہلی بار گاندھی جی کو پیش کیا گیا تھا اور یہ رول ایک پارسی اداکار میکاندے نے ادا کیا تھا جو کافی حد تک گاندھی جی سے مشابہہ تھا۔ انگریز سرکار کو اس فلم کی نمائش سے آزادی و حریت کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے کا خدشہ نظر آیا لہٰذا اسے پاس کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر جب اس میں سے عوامی بیداری کے کئی منظر حذف کر دیے گئے اور نام بھی بدل کر "خدا کی شان" کر دیا گیا۔ تب جاکر اسے کہیں نمائش کی اجازت ملی۔

اُسی سال ہدایت کار شانتارام نے بھی لوکمانیہ تلک کے ملک گیر نعرے "سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے" کو فلم بین طبقے تک پہنچانے کے لئے "سوراجیہ ترن" بنائی لیکن سینسر بورڈ کو اس میں لوکمانیہ تلک کے نظریات کی تبلیغ و تشہیر نظر آئی لہٰذا اُس نے اسکی نمائش کی اجازت دینے سے منع کر دیا۔ بعد ازاں فلم کے کچھ سین کاٹ دیے گئے اور نام بدل کر "اودے کال" کر دیا گیا۔

اُن دنوں سرکار گاندھی جی کے نام سے ہی اتنی خوفزدہ تھی کہ جب وی شانتارام نے چھوت چھات سے متعلق سنت ایک ناتھ کی زندگی پر مبنی فلم 'مہاتما' بنائی تو سرکار نے اس کے نام پر اعتراض کر دیا کیونکہ اس کے خیال میں مہاتما سے مراد گاندھی جی تھا لہٰذا فلم کا نام مہاتما سے "دھرماتما" کر دیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ خاموش فلموں کے دور کی متعدد فلموں میں تحریکِ آزادی اور گاندھی جی کے خیالات و افکار کی عکاسی کی گئی تھی لیکن فلموں کے گونگے پن کی وجہ سے پوری طرح سے نظریات و مقاصد کی ترجمانی نہیں ہو پائی تھی تاہم جب 1931 میں متکلم فلموں کا دور شروع ہوا اور گونگے کرداروں کو زبان مل گئی تو سینما عوامی رابطے کا ایک اہم وسیلہ بن گیا۔ فلموں میں گیت و نغمہ نگاری اور مکالمہ نویسی کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔

1936 میں جب اچھوت اُدھار تحریک سے متاثر ہو کر بمبئی ٹاکیز نے اشوک کمار اور دیویکا رانی کو لے کر ایک براہمن لڑکے اور ہریجن لڑکی کی داستانِ محبت کو "اچھوت کنیا" کے نام سے فلمایا تو اسی مذکورہ برس میں واڈیا مووی ٹون نے 'جے بھارت' نامی فلم تیار کی جو اسٹنٹ فلم ہونے کے باوجود حب الوطنی کی تلقین کرتی تھی۔

اگرچہ ہمارے فلمی نقادوں نے اس دور کی ناڈیا جان کاؤس اور سردار منصور کی اسٹنٹ فلموں کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور عموماً انھیں نظر انداز کیا ہے (حالانکہ بچپن میں سبھی اُن سے محفوظ ہوتے رہے ہیں) تاہم یہ حقیقت ہے کہ جابر حکمرانوں کے خلاف بغاوت اور حب الوطنی کے جذبات و احساسات تقریباً ان سبھی فلموں میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔

1943 میں ہدایت کار دیوکی بوس نے گاندھی واد پر "اپنا گھر" نامی فلم بنائی جس کے اہم اداکار تھے شانتا آپٹے، چندر موہن، مایا بینرجی، جگدیش سیٹھی، جیون، مہیش کول، لیلا مصرا ڈیوڈ اور گوپ۔

1946 میں جب خواجہ احمد عباس کی بنگال کے قحط سے متعلق شہرت یافتہ فلم "دھرتی کے لال" منظرِ عام پر آئی تھی تو اسی سال گاندھی واد کی مقبولیت اور سرمایہ دارانہ استحصال کے بارے میں چیتن آنند کی عالمی شہرت کی فلم 'نیچا نگر' کی بھی نمائش ہوئی تھی جسے کینس فلمی میلے میں ایوارڈ پانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اسی فلم میں کامنی کوشل پہلی بار جلوہ افروز ہوئی تھیں۔

اس سے پیشتر دوسری جنگِ عظیم کے دوران بمبئی ٹاکیز نے پرمیندر مترا کی کہانی پر مبنی فلم "قسمت"، پیش کی تھی جس کے اہم اداکار اشوک کمار، ممتاز شانتی، وی۔ ایچ۔ ڈیسائی، مس موتی، ڈیوڈ، شاہنواز، چندر پربھا، مبارک اور کانو رائے تھے۔ اگرچہ یہ تحریکِ آزادی سے متعلق فلم نہیں تھی تاہم اس میں پردیپ کا لکھا گیت "آج ہمالہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے" اس قدر مقبول ہوا تھا کہ اسے قومی ترانے کی سی حیثیت حاصل ہو گئی تھی حالانکہ یہ گیت وار پراپیگنڈہ کے ایک حصے کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔

1945 میں بنگلہ فلم 'اُودیر پاتھے' پر مبنی فلم "ہمراہی" دیکھنے کو ملی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ ترقی پسند اور حریت پسند خیالات کی عکاس اس فلم کے اہم کردار تھے۔ رادھا موہن بھٹاچاریہ، بناتا بوس، بھوپندر کپور، ہیرالال، رمیش سنہا، دیبی مکرجی اور تلسی چکرورتی۔

حصولِ آزادی کے بعد تو آزادی اور شہیدانِ آزادی سے متعلق فلموں کا ایک تانتا سا لگ گیا۔ ان میں سے 1948 میں فلمستان کی جانب سے رمیش سہگل کی زیرِ ہدایت باکس آفس پر ہٹ فارمولے کو مدِ نظر رکھ کر تیار کی گئی فلم "شہید"، کئی لحاظ سے قابلِ ذکر ہے۔ رومانی کہانی پر مبنی اس فلم کا ہیرو ایک مجاہد آزادی ہے جو آزادی کی خاطر شہید ہو جاتا ہے۔ فلم کی موسیقی ماسٹر غلام حیدر

کی تھی اور اس کا گیت

"وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو"

بیحد مقبول ہوا تھا۔ برسوں گزر جانے پر بھی اس کی تازگی ختم نہیں ہوئی ہے آج بھی یہ نغمہ ہندوستانیوں کے دل میں حب الوطنی کا جوش و خروش پیدا کر دیتا ہے۔ اس فلم میں دلیپ کمار، کامنی کوشل اور لیلا چٹنس کے علاوہ مشہور کیریکٹر ایکٹر چندر موہن نے بھی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے خصوصاً عدالت میں ادا کئے گئے مکالموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

1950 میں رمیش سہگل کی ہدایت میں 'سمادھی' پیش کی گئی جس میں نیتاجی کا کردار مشہور اسکرپٹ رائٹر نرنجن پال کے بیٹے کالن پال نے ادا کیا تھا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس کی زندگی سے متعلق اسی نام سے 1966 میں ہیمن گپتا نے بھی ایک فلم بنائی تھی جس میں نیتاجی کا رول ابھی بھٹاچاریہ نے کیا تھا۔ اس کے بارہ سال بعد نیتاجی کی زندگی پر "سبھاش چندر بوس" نام سے بھی ایک رنگین فلم تیار کی گئی تھی۔

نیتاجی کے علاوہ دیگر شہیدانِ آزادی پر بھی بہت سی فلمیں بنائی گئی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ فلمیں شہید بھگت سنگھ کی زندگی پر مبنی تھیں۔ سب سے پہلے 1954 میں جگدیش گوتم کی زیر ہدایت "شہید اعظم بھگت سنگھ" بنی جس میں بھگت سنگھ پریم ادیب بنے تھے اور دیگر اداکار جے راج اور سمرتی بسواس تھے۔ بعد ازاں 1963 میں این بنسل نے "شہید بھگت سنگھ" بنائی جس میں بھگت سنگھ شمی کپور بنے تھے۔ لیکن مذکورہ بالا فلموں سے زیادہ مقبول و مشہور ہدایت کار رام شرما کی فلم "شہید" تھی جس میں بھگت سنگھ کا رول منوج کمار نے ادا کیا تھا اور جس کے گیت "میرا رنگ دے بسنتی چولا" اور "پگڑی سنبھال جٹا" بیحد مقبول ہوئے تھے۔ اس فلم میں بھگت سنگھ کی ماں کا رول کامنی کوشل نے بڑی عمدگی سے نبھایا تھا۔

اسی طرح مشہور انقلابی چندر شیکھر آزاد پر 1963 میں جگدیش گوتم نے مذکورہ نام سے ہی فلم تیار کی تھی جس میں آزاد کا کردار جے راج نے نبھایا تھا۔

1948 ہی میں ایک انقلابی زندگی پر اگرووت کی ہدایت میں سبیہ ساچی نامی فلم بنائی گئی۔ علاوہ ازیں للت مہتہ کی "آزادی کی راہ پر" بھی اسی سال دیکھنے کو ملی جسے تحریک آزادی سے متعلق فلموں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

1951 میں بنی مجدار کی فلم "آندولن" کے علاوہ کشمیر پر قبائلی حملے سے ملک کی آزادی و سالمیت کو درپیش خطرے سے متعلق ہدایت کار راجندر جامی کی فلم "کشمیر" منظر عام پر آئی جس میں ہندو مسلمانوں کو ملک کی آزادی کے تحفظ کی خاطر شانہ بشانہ لڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

1953 میں ہدایت کار دتہ دھرم ادھیکاری نے "مہاتما" فلم پیش کی تھی جس میں گاندھی جی کے کردار کو بڑے حقیقی اور موثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا تھا۔ اس سے ایک سال پیشتر بنکم چندر چٹرجی کے ناول 'آنند مٹھ' پر ہدایت کار ہیمن گپتا نے فلم بنائی تھی جو آزادی و حریت کے مجاہدین کی زندگی پر مبنی تھی اور جس کے گانے "بندے ماترم" کو لوگ آج بھی فراموش نہیں کر پائے۔

1953 میں سہراب مودی کی پہلی رنگین فلم 'جھانسی کی رانی' منظر عام پر آئی۔ جس کی تیاری میں ہالی ووڈ کے ٹیکنیشینوں سے مدد لی گئی تھی اور جسے ہندی کے علاوہ انگریزی میں "دی ٹائیگر اینڈ فلیم" کے نام سے بھی فلمایا گیا تھا مگر یہ فلم بری طرح فیل ہو گئی کیونکہ اس سے پہلے جگدیش گوتم نے "مہارانی جھانسی" کے نام سے فلم بنا کر نمائش کے لئے پیش کر دی تھی۔

1955 میں تیار کی گئی ستین بوس کی فلم "جاگرتی" ایک ایسی فلم تھی جس میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی فلم میں پردیپ کے لکھے گیتوں "ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے" اور "آؤ بچو تمھیں دکھائیں جھانکی ہندوستان کی" نے عوام کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور آج برسوں گزر جانے پر بھی ان کی مقبولیت ماند نہیں پڑی۔ اس میں ڈیزی ایرانی نے بھی اپنی اداکاری سے تہلکہ مچا دیا تھا۔

وِمل آہوجہ نے بھی للت سہگل کے ایکانکی پر مبنی ایک انگریزی فلم 'فائیو پاسٹ فائیو' بنائی تھی جس میں گاندھی جی کی شخصیت اور افکار کو بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا تھا۔

1963 میں جرامند کے ناول پر مبنی فلم "بندنی" منظر عام پر آئی جس کے اہم اداکار اشوک کمار اور نوتن تھے۔ اس فلم میں اگرچہ برطانوی دور حکومت میں ایک بے گناہ قیدی عورت کی دکھ بھری داستان بیان کی گئی تھی تاہم اس میں تحریک آزادی میں انقلابی سرگرمیوں اور مادر وطن کے لئے شہید ہونے والوں کے حالات بھی پیش کئے گئے تھے۔ اس فلم کا گیت "مت رو ماتا لال ترے بہتیرے" ایک ایسا لاجواب قومی گیت ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ اسی طرح آئندہ برس بننے والی فلم "لیڈر" کا گیت۔ "اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں" بھی ایک عمدہ موثر اور دل پذیر گیت ہے۔

یہاں منوج کمار کی فلموں کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ وہ ہمارے ملک کے واحد ہدایت کار ہیں جن کی فلمیں حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور ہوتی ہیں اور ملک کی آزادی اور سالمیت کا تحفظ جن کا منتہائے مقصود۔ "اپکار" ہو یا "پورب اور پچھم" "روٹی کپڑا اور مکان" ہو یا "کرانتی" ہر فلم میں انھوں نے 'دیش پریم' کو ہی مرکزی مقصد بنایا ہے۔ اسی طرح ہدایت کار وشرام بیدیکر کی تاریخی فلم 'بھارت کے شہید' کا ذکر بھی انتہائی ضروری ہے۔ ان کے علاوہ "ایک ہی راستہ، وطن مشعل، سن بیالیس، 1857، سنگھ گڑھ" سات ہندوستانی، آزاد ہندوستانی، ہندوستان، ہندوستان ہمارا، زلزلہ، امر گیہ وغیرہ لاتعداد فلمیں اس موضوع پر بن کر خراج تحسین پا چکی ہیں اور جب بھی وطن عزیز کی فلموں کی تاریخ لکھی جائے گی انھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکے گا۔

نیتاجی کے علاوہ دیگر شہیدانِ آزادی پر بھی بہت سی فلمیں بنائی گئیں ان میں سب سے زیادہ فلمیں شہید بھگت سنگھ کی زندگی پر مبنی تھیں۔

انیس امروہوی

منوج کمار
فلمی بھارت



ہری کرشن گوسوامی یعنی منوج کمار کا جنم 28 اگست 1937ء کو ایبٹ آباد (اب پاکستان) میں ہوا۔ ان کے والد جناب ہری ونش لال گوسوامی لاہور کے ایک کارخانے میں ملازم تھے اور اردو میں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ منوج کمار نے آٹھویں کلاس میں سب سے پہلے "اڑتا پنچھی" نام کے ناٹک

میں کام کیا تھا۔ اس وقت منوج کمار کو بھی معلوم نہ تھا کہ ایک دن ان کا شمار اپنے زمانے کے مشہور اداکاروں میں کیا جائے گا اور وہ ایک کامیاب اداکار کے ساتھ ساتھ کامیاب فلمساز و ہدایت کار بن کر فلمی افق پر چمکیں گے۔ دہلی میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد منوج کمار نے ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی (اور فلموں سے وابستہ ہونے سے قبل وہ لکھنؤ میں اسٹیشن ماسٹر تھے) فلمیں دیکھنے اور اداکاری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اس لئے اپنے شوق کو پورا کرنے کے لئے بمبئی آکر صرف ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ایلورا اسٹوڈیو میں نوکری کرنے لگے اور فلموں سے وابستہ ہو گئے۔

بہت سے لوگ منوج کمار کی پہلی فلم "ہریالی اور راستہ" کو مانتے ہیں مگر یہ ان کی پہلی کامیاب اور مشہور فلم کہلائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ اس فلم سے قبل وہ لگ بھگ گیارہ فلموں میں کام کر چکے تھے۔ ان کی سب سے پہلی فلم تصویرستان کی "سہارا" تھی۔ جس کے ہدایت کار لیکھراج بھاکڑی اور موسیقار ہیمنت کمار تھے۔ اس فلم میں میناکماری، ایم راجن، کلدیپ کور، کنہیا لال اور ڈیزی ایرانی وغیرہ نے بھی کام کیا تھا یہ فلم 1958ء میں منظر عام پر آئی پھر "پنچایت، چھاند ہنی مون، کانچ کی گڑیا، پیا ملن کی آس، ریشمی رومال سہاگ سندور، اپنا بنا کے دیکھو، بنارسی ٹھگ" اور ڈاکٹر ودیا" میں منوج کمار نے کام کیا اور 1962ء میں شری پرکاش پکچرس کی فلم "ہریالی اور راستہ" نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ اس کے ہدایت کار وجے بھٹ اور موسیقار شنکر جے کشن تھے۔ نغمے حسرت جے پوری اور شلیندر نے تحریر کئے تھے۔ اس فلم میں مالا سنہا نے منوج کمار کے مقابل ہیروئین کا کردار ادا کیا تھا۔ جبکہ ششی کلا سریندر ناتھ، کرشنا کماری، منموہن کرشن اور جگدیپ نے بھی اس فلم میں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس طرح "ہریالی اور راستہ" کی کامیابی تک منوج کمار نے ایک اچھے اداکار کے طور پر فلم انڈسٹری میں اپنے قدم جمائے تھے، اور ان کی ایک الگ پہچان بن چکی تھی۔ اس فلم کے بعد منوج کمار کی کئی فلمیں "ماں بیٹا، نقلی نواب، شادی، گھر بسا کے دیکھو، گرہستی" اور "اپنے ہوئے پرائے" وغیرہ منظر عام پر آئیں، جنہوں نے اچھا کاروبار کیا۔

منوج کمار نہ صرف پیار و محبت کے مناظر میں بلکہ جذباتی مناظر میں بھی اپنی اداکاری سے حقیقت کا رنگ بھر دیتے تھے۔ اسی برس فلم "شہید" سے منوج کمار کا ذہن حب الوطنی کی طرف مائل ہوا۔ اس سے قبل دلیپ کمار کی فلم "شہید" آچکی تھی۔

فلم "شہید" کی کامیابی کے بعد 1966ء کے اوائل میں فلم "دو بدن" نمائش کے لئے پیش کی گئی جو باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوئی۔ اسی سال فلم "ساون کی گھٹا" بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ 1967ء میں بھی فلم "انتہا" اور ہدایت کار راجہ نواتھے کی فلم "پتھر کے صنم" بھی بے حد مقبول ہوئیں۔ اسی برس منوج کمار نے فلمسازی کے میدان میں قدم رکھا اور وشال پکچرس کے بینر سے فلم "اپکار" بنانی شروع کی۔ فلم "شہید" کے وقت منوج کمار کے ذہن میں حب الوطنی کا جو بیج بویا گیا تھا اب اس کے پھلنے پھولنے کے دن آگئے تھے۔ اس فلم کی کہانی کا مرکزی خیال خالص حب الوطنی کے ارد گرد گھومتا ہے۔ منوج کمار اس فلم کے ہیرو کے علاوہ ہدایت کار بھی تھے۔ آشا پاریکھ، پریم چوپڑا اور پران اہم رول ادا کر رہے تھے۔ یہ فلم سماج میں آئے بکھراؤ، ٹوٹے رشتوں، لالچ، رشوت، جمع خوری کسان اور جوان، ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور وطن پرستی کا مرکب تھی۔ جو بے حد کامیاب رہی۔ فلم "اپکار" سے ہی منوج کمار کا نام بھارت پڑا اور اسی فلم سے منوج کمار نے دیش بھگتی کی چھاپ چھوڑی۔ فلم "اپکار" کو 1967ء کی بہترین فلم کا



فلم فیئر ایوارڈ حاصل ہوا، اور منوج کمار کو اسی فلم کیلئے بطور بہترین ہدایت کار، فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے بعد 1974ء میں بھی فلم "روٹی کپڑا اور مکان" کے لئے بہترین ہدایت کار کا فلم فیئر ایوارڈ منوج کمار کو حاصل ہوا۔ جب کہ اس سے قبل 1972 میں فلم "بے ایمان" کے لئے بھی انہوں نے بہترین اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

فلم "اپکار" کی کامیابی کا فارمولہ ہاتھ لگ جانے کے بعد منوج کمار نے حبّ الوطنی کے علاوہ کچھ اور سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ 1970ء میں انہوں نے اپنی ایک اور فلم "پورب اور پشچم" بنائی جس میں سائرہ بانو ان کی ہیروئن تھیں۔ یہ فلم ہندوستان اور غیر ممالک بالخصوص مغربی ممالک کے تہذیبی فرق کو نمایاں کرتی تھی۔ مگر اس فلم میں بھی بھارت کمار نے اپنا وہی کامیاب فارمولہ (اپکار والا) اپنایا تھا۔ اب تو منوج کمار بھارت کمار کے نام سے ہی مشہور ہو گئے۔ کیونکہ "پورب اور پشچم" میں بھی انکا نام بھارت ہی تھا۔ 1972ء میں منوج کمار نے پھر ایک فلم "شور" بنائی۔ اس کی کہانی، مکالمے، اسکرین پلے ایڈیٹنگ، ہدایت کاری اور اداکاری لگ بھگ سبھی کچھ منوج کمار نے کیا تھا۔ یہ شاید ایک ایسے موقع سے فائدہ اٹھانے کی بات تھی۔ جب آدمی ہر میدان میں اپنے آپ کو آزمانا چاہتا ہے۔ مگر "شور" فلم کے گیت اور موسیقی تو بہت مقبول ہوئے لیکن فلم زیادہ کامیاب نہیں ہوئی

جب منوج کمار کو خیال آیا تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ مگر ایک بار پھر بھی کوشش کر کے انہوں نے فلم "روٹی کپڑا اور مکان" کی کہانی لکھی، اسکرین پلے لکھا، مکالمے لکھے، ہدایت دی، اداکاری کی اور فلم کی ایڈیٹنگ بھی خود ہی کی۔ اس ملٹی اسٹار فلم میں منوج کمار نے حب الوطنی کے ساتھ ساتھ جسم کی نمائش کا مصالحہ ڈال کر فلم کو چٹپٹا بنایا اور یہ فارمولہ کچھ حد تک کامیاب بھی رہا۔ جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے وہ اب تک آٹے کے ڈھیر میں موسمی چٹرجی کا ریپ اور زینت امان کا کولہے مٹکانا ... نہیں بھولے ہوں گے۔ دراصل دیکھا جائے تو ان فلموں میں منوج کمار نے حب الوطنی کی آڑ میں سیکس کو پیش کر کے کاروباری فلم ساز ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یہی سب کچھ ان کی بعد کی فلم "کرانتی" میں تھا۔ "کرانتی" بھی ملٹی اسٹار فلم تھی جو حب الوطنی کے نام پر فلم کافی اچھا بزنس کر گئی تھی۔

منوج کمار کو سب سے بڑا دھکا پہنچا فلم "کل یگ کی رامائن" کی زبردست ناکامی سے۔ اس فلم کا نام سب سے پہلے "شانتی دوت" رکھا گیا تھا مگر بعد میں "کل یگ کی رامائن" کر دیا گیا۔ اس پر بہت سے اعتراضات ہوئے، تب نمائش کے وقت اس فلم کا نام بدل کر "کل یگ اور رامائن" کیا گیا۔ یہ فلم اس بُری طرح ناکام ہوئی کہ منوج کمار اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور کئی ماہ علاج کے لئے ان کو اسپتال میں رہنا پڑا۔ 1989ء میں انہوں نے فلم "کلرک" بنائی، دیش بھگتی کا فارمولہ یہاں پر کام نہ آیا۔ اور یہ فلم بھی ناکام ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی انکا بڑا بیٹا وشال گوسوامی جو غزل گائک بننا چاہتا تھا، ناکام ہو گیا۔ اور چھوٹا بیٹا کنال گوسوامی اداکاری کے میدان میں پچھڑ گیا، منوج کمار نے اپنے بھائی راجیو گوسوامی کو آگے بڑھانا چاہا۔ مگر وہ بھی "پینٹر بابو" میں ناکامی کے بعد فلمی دنیا سے سنیاس لے کر بیٹھ گیا۔

پچھلے دنوں منوج کمار نے دیش بھگتی کے فارمولے کو دوردرشن پر آزمایا، اور ایک ٹی وی سیریل "بھارت کے شہید" پیش کیا۔ جس سے ناظرین قطعی محظوظ نہ ہو سکے۔ ان لگاتار ناکامیوں نے منوج کمار کو بھلا دیا۔

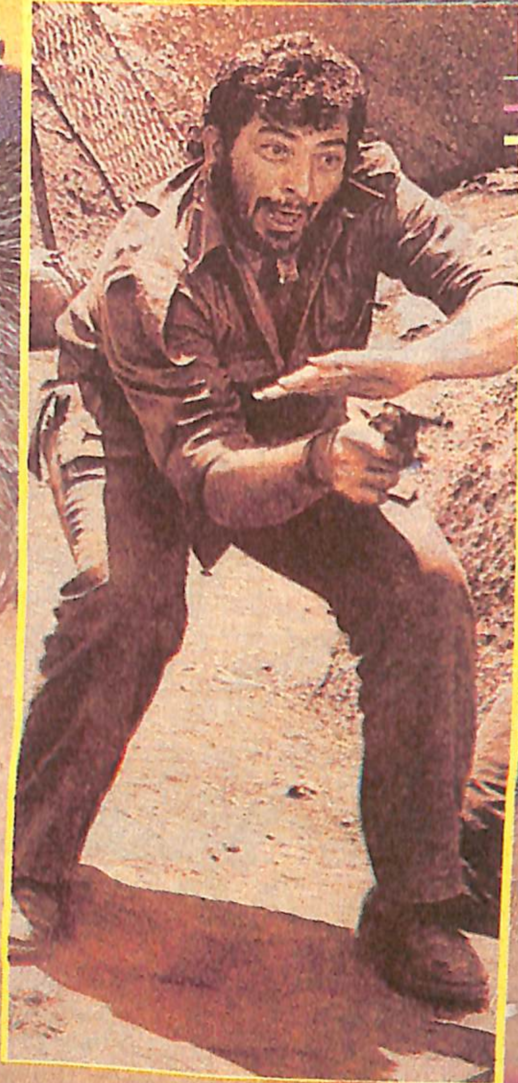
لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فلموں کے تعلق سے جب بھی حب الوطنی کا ذکر آئے گا تو منوج کمار کا نام لیا جائے گا۔

امجد

خان

ایک ناقابل فراموش شخصیت

مسز شاداں علیگ



دُنیا ایک سرائے ہے اور انسان مسافر کے مانند یہاں آتا ہے چلا جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے ان ہی دنوں میں وہ ایسے کام کر جاتا ہے جس کی بنا پر دنیا اسے یاد کرتی ہے برے شخص کو برے لفظوں میں اور اچھے انسان کو عزت و احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے، امجد خاں ایک ایسے ہی شخص تھے۔ جن کو فلمی دنیا ہمیشہ یاد کرے گی خاص کر وہ لوگ تو انہیں کبھی بھلا نہ پائیں گے جن کے وہ دامے درمے سخنے کام آیا کرتے تھے۔

امجد خاں اپنے وقت کے مشہور و معروف ولن جینت کے چھوٹے لڑکے تھے۔ ان کی پیدائش 21 اکتوبر 1943 کو ہوئی۔ وہ والد کے ساتھ بمبئی آگئے اور یہیں پروان چڑھے ہوش آیا تو گرد و پیش کا فلمی ماحول آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس لئے ان کا بھی رجحان اداکاری کی طرف ہوگیا، اور وہ اسکول کے ڈراموں میں حصہ لینے لگے۔ ان کی تعلیم بمبئی میں ہی ہوئی تھی۔ انہوں نے فلسفے میں فرسٹ کلاس سے ایم اے مکمل کیا۔

امجد خاں کی دلچسپی دیکھتے ہوئے انھیں ان کے والد نے خواجہ احمد عباس اور کے آصف کے ساتھ کردیا۔ امجد خاں اُن دونوں ہدایت کاروں کے معاون کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ دوسری طرف ان کا اسٹیج سے تعلق بھی برقرار رہا۔ وہ ڈراموں سے اپنی اداکاری کی پیاس بجھاتے رہے۔ ان دنوں فلمساز و ہدایت کار چیتن آنند ہندوستان کی قسم پر کام کر رہے تھے۔ انہیں فلم میں ایک پاکستانی فوجی کا کردار ادا کرنے کے لئے نئے چہرے کی تلاش تھی۔ انہوں نے امجد خاں کا ایک ڈرامہ دیکھا تو ان کی اداکاری سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے امجد خاں کو سائن کرلیا۔ امجد خاں نے بھی اس کردار کو بہت عمدگی سے نبھایا

"ہندوستان کی قسم" کی ریلیز سے قبل امجد خاں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور اسٹیج پلے دیکھنے کے شوقین فلمکار ہی ان کی اداکارانہ صلاحیتوں سے واقف تھے لیکن فلمسازوں کی اکثریت اس سے لاعلم تھی۔ شاید کے آصف کو بھی امجد خاں کی اداکاری کے شوق کا علم تھا تبھی تو انھوں نے جب 1969 میں "محبت اور خدا" شروع کی تو امجد خاں کو بھی ایک رول دیا لیکن اس فلم سے انہیں کوئی خاص مقام حاصل نہ ہوسکا۔ کیونکہ کے آصف کے انتقال کے بعد یہ فلم ڈبے میں بند ہوگئی، اور امجد خاں کا دوسری فلموں میں چھوٹے موٹے رول کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ 1973 میں جب جی پی سپی "شعلے" بنا رہے تھے۔ تو ڈینی کو مدنظر رکھ کر فلم میں ڈاکو کا کردار لکھا گیا تھا۔ لیکن مصروفیت کے باعث اس میں کام نہیں کرسکے۔ سپی مقررہ وقت میں اپنی فلم پورا کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران جی پی سپی اپنی بہن کا ایک ڈرامہ دیکھنے گئے جس میں امجد خاں بھی کام کررہے تھے۔ انھیں امجد کی اداکاری میں دم لگا، اور ان کی تجربہ کار آنکھوں نے مستقبل کے کامیاب فنکار کو دیکھا، اور فلم کے مصنف سلیم جاوید سے بات کرکے گبر سنگھ کا رول امجد خاں کو دیدیا۔

"شعلے" سے جو شہرت اور مقبولیت امجد خاں کو حاصل ہوئی تھی ممکن تھا کہ وہ ان کے لئے اور معاون و مددگار ثابت ہوتی۔ نیز وہ بھی ان ہیروز کے مانند جنہوں نے فلمی زندگی کی ابتدا نیگیٹو کردار ادا کرنے سے کی تھی، طرح ہیرو بنتے، اور فلم کے مرکزی کردار میں ہیروئن کے گلے میں باہیں ڈال کر ناچتے گاتے، مگر "دی گریٹ گیمبلر" کے دوران ہوئے کار ایکسیڈنٹ اور ادویات نے ان کے چھریرے جسم کو غبارے کی طرح پھلا کر رکھ دیا۔ اور فلم کار انہیں نیگیٹو رول ہی دیتے رہے۔ بعد میں جب امجد خاں نے اپنے آپ کو کیمرے کے سامنے ایک ہی طرح کے رول کرتے محسوس کیا تو فلمیں سائن کرتے وقت اپنے آپ پر کچھ پابندیاں عاید کیں۔ تب انہیں الگ قسم کے رول ملنے لگے۔ اور انہوں نے اپنے ہر کردار میں روح پھونک کر دکھائی، نیز اسے زندہ جاوید کردیا۔

امجد خاں کی اداکاری میں ہر رنگ دیکھنے کو ملا اگر انہوں نے "شعلے" میں بربریت، درندگی، اور سفاکی کا بھرپور تاثر دیا تو "لو اسٹوری" میں مزاح سے بھرپور حولدار کا کردار لیا، "قربانی" کے سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کے رنگ کو انہوں نے فرض شناس آفیسر کے رول میں پیش کیا، "دادا" کے ایک بدمعاش کا کردار بھی انہوں نے نہایت عمدگی سے ادا کیا، جو نیکی اور بدی کے دوراہے پر کھڑا ہو کر نیکی کی طرف جانے والے راستے کا انتخاب کرتا ہے فلم میں اسی کشمکش کا امجد خاں نے جو مظاہرہ کیا ہے، وہ قابل دید ہے، قابل ستائش ہے۔

امجد خاں نے تقریباً دو سو فلموں میں کام کیا جن میں وہ مختلف رنگوں میں دکھائی دیئے۔ ان کی مشہور فلموں میں شعلے، ہم کسی سے کم نہیں، ہم سے بڑھ کر کون لو اسٹوری، قربانی، پرورش، مقدر کا سکندر، انکار، نصیب، چمیلی کی شادی، دادا، شطرنج کے کھلاڑی سہاگ، قسمیں وعدے، شمع، تیرے میرے بیچ میں، یارانہ، پلکوں کی چھاؤں میں، دیس پردیس پاپی، قیدی، لو، رام گڑھ کے شعلے" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی آنے والی فلموں میں سورگ سے پیارا گھر" دل ہی تو ہے، کالنگا، گنگ، دل آگے میں پیچھے، اور حقدار وغیرہ ہیں۔ امجد خاں نے دو فلمیں "چور پولیس" اور "امیر آدمی غریب آدمی" بھی بنائیں۔ لیکن دونوں ناکام رہیں۔ ان کے پسماندگان میں دو لڑکے شاداب اور شیماہز اور ایک لڑکی احلم ہے۔

زندگی کا جو سفر امجد خاں نے 14 اکتوبر 1943 کو شروع کیا تھا۔ وہ 27 جولائی 1992 کو رات 8 بجے ختم ہوگیا۔ مسافر اپنا سفر تمام کرکے تمام رنگینیوں تمام رونقوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا جس کو خود بھی ایک دن ختم ہوجانا ہے، مٹ جانا ہے، پھر بھی جب تک یہ دنیا قائم ہے تب تک امجد خاں جیسے لوگ جنہوں نے دوسروں کے دکھ درد کو اپنا سمجھا دوسروں کی مدد کو اپنا فرض جانا، ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے، اور آنکھیں ان کے لئے اشکبار ہوتی رہیں گی۔



آنیوالی فلم

باز

دیوا کا اپنا چھوٹا سا گھر ہے جہاں اس کی ماں اور ایک چھوٹی بہن گیتا رہتی ہیں جنہیں وہ بیحد پیار کرتا ہے۔ گیتا سُمیت سے محبت کرتی ہے اس بات سے دیوا واس کی ماں بخوبی واقف ہیں اور سُمیت کو پسند کرتے ہیں۔

دیوا فوٹو گرافر ہے اسے نوکری کی تلاش ہے اسی لئے اس کی محبوبہ آشا اُسے اپنے ہی آفس میں فوٹو گرافر کی نوکری دلوا دیتی ہے۔ ایک دن دیوا ہوٹل کے سوئمنگ پُول پر ایک لڑکی مونیکا کی تصویریں کھینچتا ہے۔ یہ تصویریں دیوا کے مالک کو بہت پسند آتی ہیں تو وہ اسے اور فوٹو کھینچنے کے لئے مونیکا کے پاس بھیجتا ہے۔ مونیکا پہلے تو انکار کر دیتی ہے مگر دیوا کے منانے پر راضی ہو جاتی ہے۔ مونیکا کو دیوا اچھا لگتا ہے اور ان دونوں میں دوستی ہو جاتی ہے۔

مونیکا ایک شریف لڑکی ہے مگر وہ سومراج جیسے خطرناک آدمی کے جال میں پھنس گئی ہے، وہ ہمیشہ مونیکا سے غلط کام کرواتا ہے اور اسے یہ تمام کام مجبوراً کرنے پڑتے ہیں کیونکہ اس کے باپ کو سومراج نے قید کر رکھا ہے۔ سومراج کے دو ساتھی اور ہیں پہلا ہے گوگی جبکہ دوسرا ہے ڈی۔سی۔پی۔ داملے، داملے ہے تو پولیس کا آدمی مگر کام کرتا ہے ملک کے دشمنوں کے لئے۔

ایک دن سی۔بی۔آئی انسپکٹر ایگل کو سرکار کی طرف سے ان کی تحقیقات کے لئے بمبئی بھیجا جاتا ہے ایگل کے ہاتھوں دشمن کے سارے سراغ لگ جاتے ہیں۔ وہ ہیڈ آفس فون کر کے بتاتا ہے کہ اس نے سارے دشمنوں کا پتہ لگا لیا ہے اس کے ثبوت بھی مل گئے ہیں اور ان ثبوتوں پر مشتمل وہ ایک ڈائری تیار کرتا ہے اس سے پہلے کہ وہ یہ ڈائری پولیس کے حوالے کرے ڈی۔سی۔پی۔ کو پتہ چل جاتا ہے۔ سومراج ایگل کا قتل کر کے اس کی ڈائری لے لیتا ہے جب اس کی خبر مونیکا کو ملتی ہے تو وہ موقع پا کر ڈائری چرا لیتی ہے اور دیوا کے پتہ پر بھیجنا چاہتی ہے مگر تبھی سومراج وہاں آجاتا ہے تب مونیکا ڈائری کے ساتھ سو کا نوٹ چپکا کر دیوا کا پتہ لکھ کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیتی ہے وہ ڈائری جانی نام کے ایک شرابی کے ہاتھ لگتی ہے اور وہ سو کا نوٹ لے کر ڈائری لیٹر بکس میں ڈال دیتا ہے۔ اس بات کا بھی سومراج کو علم ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈائری دیوا کو ملے سومراج کے غنڈے وہاں پہونچ جاتے ہیں، پھر بھی ڈائری دیوا کے ہاتھ لگ ہی جاتی ہے۔

ڈائری حاصل کرنے کے لئے سومراج، گوگی اور داملے دیوا کو دھمکاتے ہیں مگر وہ انکار کر دیتا ہے تب سومراج اس کی ماں کو پھانسی کے پھندے میں لٹکا کر مار دیتا ہے۔ پھر دیوا جان کی بازی لگا کر دشمنوں کا سامنا کرتا ہے۔ جس میں سُمیت بھی دیوا کا ساتھ دیتا ہے اور جان گنوا دیتا ہے۔ آخر کار دیوا اپنے دشمنوں کو ان کے انجام تک پہونچا دیتا ہے۔ آشا کو انسپکٹر ایگل کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کے پِتا تھے جو اپنا فرض ادا کرتے کرتے قربان ہو گئے۔



فنکار

دیوا: گووندا ● آشا: سونم

سُمیت: ابھینو چترویدی ● گیتا: ریشما سنگھ

مونیکا: ارچنا پورن سنگھ ● انسپکٹر ایگل: انیل دھون

ماں: انجنا ممتاز ● سومراج: ٹینو آنند

جانی: لکشمی کانت بیرڈے ● ڈی سی پی: دیپک پاراشر

فلمساز: سریش جٹانی

موسیقی: آنند ملند ● گیت: سمیر

سونے کی سیتا

آنیوالی فلم



مندر میں پوجا چل رہی ہے تبھی کسی نوزائیدہ بچّے کے رونے کی آواز آتی ہے مندر میں موجود تمام لوگوں کی توجہ اسی طرف مرکوز ہوجاتی ہے. پجاری و دیگر لوگ مندر کی سیڑھیوں کے پاس آتے ہیں تو وہاں ایک ٹوکری میں بچّی کو روتا ہوا پاتے ہیں. پنڈت اس بچّی کو گود میں اُٹھاکر سونے کی سیتا کے نام سے پکارتا ہے وہاں کملا بھی موجود تھی جس کی کوئی اولاد نہیں ہے وہ اس بچّی کو گود لے لیتی ہے اور اس کا نام کشوری رکھ کر پرورش کرتی ہے۔ وقت تیزی سے گزرنے لگتا ہے اور کشوری کالج میں قدم رکھتی ہے. کالج کے سالانہ پروگرام میں اپنا رقص پیش کرتی ہے جس میں اس کا ساتھ کالج کا ہی لڑکا وینکٹ دیتا ہے۔ ناچتے ناچتے دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں اور یہی پسند آگے چل کر پیار کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ مگر ایک بار پنڈت کشوری کے لئے ایسا رشتہ لاتا ہے جو جہیز کے لالچی ہوتے ہیں تب کشوری کی ماں اس رشتہ کو قبول کرنے سے انکار کردیتی ہے۔

ادھر ایک دن کشوری اپنے والدین کے ساتھ مندر پوجا کے لئے جاتی ہے وہاں وینکٹ بھی اپنے بھائی، بھاوج کے ساتھ آیا ہوا تھا وہ سب آپس میں ملتے ہیں تو کشوری کے والدین وینکٹ کے بھائی بھاوج کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اپنی بیٹی کی پسند پر فخر کرتے ہیں۔ آخر کار وینکٹ اور کشوری کی شادی سب کی مرضی سے ہوجاتی ہے۔ شادی کے بعد ایک سال ہنسی خوشی گزر گیا مگر یہ خوشگوار ماحول اس وقت زہرآلود ہوجاتا ہے جب وینکٹ کی بُوا وہاں آکر رہنے لگتی ہے۔

— ایک بار وینکٹ کے بھائی بھاوج شہر چلے جاتے ہیں جبکہ وینکٹ وہیں کام کرتا ہے۔ تب گھر پر صرف وینکٹ کی بُوا اور کشوری رہ جاتی ہے. بُوا اسے تنگ کرتی رہتی ہے۔ اس کے کشوری کو ستانے میں مزید اضافہ اس وقت ہوجاتا ہے جب وہ لڑکا جس سے کشوری کی شادی جہیز کی وجہ نہ ہوسکی تھی۔ کشوری کے خلاف بُوا کے کان بھرتا ہے کہ یہ لڑکی مندر کی سیڑھیوں پر ایک ٹوکری میں رکھی ملی تھی۔ اس کی ذات پات کا کوئی پتہ نہیں. بس تبھی سے بُوا اس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے لگتی ہے جب شہر سے وینکٹ کے بھائی. بھاوج واپس آتے ہیں اور انھیں اس بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ بُوا کو بُرا بھلا کہتے ہیں مگر بُوا کو اس پر بھی چین نہیں آتا وہ گاؤں کی پنچایت کو جمع کرلیتی ہے جب سرپنچ اس معاملے میں صفائی کے لئے کہتے ہیں تو اس وقت "ناری جاگرن سمتی" کی نیتا کشوری کی حمایت لیتی ہے .مگر ان سب باتوں سے کشوری کو بیحد صدمہ پہونچتا ہے جس کے سبب وہ بیہوش ہوجاتی ہے۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا جاتا ہے جہاں ڈاکٹر انتھونی اس کے پیٹ پر تل دیکھ کر پہچان جاتی ہے کہ وہ اسی کی بیٹی ہے

. وینکٹ ان باتوں سے انجان تھا مگر جب اسے کشوری کی خبر ملتی ہے تو وہ فوراً اس سے ملنے جاتا ہے اسی دوران گاؤں میں پھر پنچایت بلائی جاتی ہے اس میں بولنے کے لئے ایک سیاسی لیڈر کو بھی بلایا جاتا ہے وہاں کشوری کے والدین اور وینکٹ کے بھائی. بھاوج کے علاوہ سبھی لوگ موجود ہوتے ہیں۔ وہ نیتا کشوری کو گاؤں چھوڑنے کی صلاح دیتا ہے مگر تبھی ڈاکٹر انتھونی اس راز سے پردہ اُٹھاتی ہے کہ کشوری اسی کی بیٹی ہے اور اسی نیتا کا باپ ہے یہ بتاکر ڈاکٹر انتھونی اس دنیا سے رخصت ہوجاتی ہے۔

آخر میں تمام غلط فہمیاں دور ہوجاتی ہیں اور پھر سے یہ چھوٹا سا کنبہ خوشگوار زندگی گزارنے لگتا ہے۔



فنکار:

ورات، پدما، اپراجتا، سدھا چندرن، راکیش بیدی امیت، سدھیر دلوی، آلوک ناتھ، روہنی ہتنگڑی اور گجندر چوہان وغیرہ۔

فلمساز و ہدایتکار : کے۔ این۔ آچاریہ

موسیقار و نغمہ نگار : کمل آنند

گلیمر کی رانی

سری دیوی



ہندی فلم انڈسٹری کے گلیمر کی رانی حسن وصلاحیت کا خزانہ، محنت ولگن کی مورت، کامیابی کی دیوی سری دیوی جوکہ اپنے نام، کام اور دام کے سبب مقبولیت شہرت اور نمبرون کے تخت پر جمی ہے۔ آج بھی اس تخت سے اُسے کوئی ہٹا نہیں پا رہا ہے۔

یہ مقام حاصل کرلینا آسان نہیں ہے۔ اگر کامیابی میسر آجائے تو پھر اسے برقرار رکھنے کے لیے ہوشیار بھی رہنا پڑتا ہے حالانکہ ہندی سینما کی ہیروئینوں کی عمریں بہت کم ہوتی ہیں چند فلمیں بطور ہیروئین کرنے کے بعد ماں، بہن، بھابھی وغیرہ کے کردار قبول کرنے پڑتے ہیں۔ مگر ایسے حالات میں کوئی مستقل ایک دہائی تک نمبرون رہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اس پر اوپر والا کچھ زیادہ ہی مہربان ہے۔ اسی مہربانی کی وجہ سے سری دیوی کا شمار ایسے فنکاروں میں ہونے لگا ہے جس کے کیریئر پر ناکامی وکامیابی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اکثر وبیشتر دیکھا گیا ہے کہ اپنے کیریئر کی شروعات بطور چائلڈ آرٹسٹ کرنے والے فنکار جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے رکھتے پردۂ سیمیں سے غائب ہوجاتے ہیں۔ مگر سری دیوی جس نے اس وقت کیمرے کا سامنا کیا جب وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کررہی ہے اس نے ساؤنڈ، لائٹس، کیمرہ، ایکشن جیسے الفاظ کے سہارے دنیا کو دیکھنا شروع کیا اور جوانی تک جنوبی ہند کے شائقین فلم کو محظوظ کرتی رہی۔ ہندی فلم انڈسٹری کی تاریخ گواہ ہے کہ ہندی ناظرین نے جنوب سے درآمد شدہ زندہ حسن کے لیے کچھ زیادہ ہی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وجینتی مالا، پدمنی، ہیما مالنی، ریکھا، جیاپردا اور سری دیوی نے ناظرین کے دلوں میں ایک خاص جگہ بنالی۔

سری دیوی جس نے فلم "ہمت والا" میں گلیمر رول کرکے نمبرون کا تاج حاصل کرنے کا دعویٰ پیش کیا اس ایک فلم کے ہٹ ہوتے ہی اس کے پاس متعدد فلموں کا انبار لگ گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد اسے نمبرون کہا جانے لگا۔ حالانکہ کہیں کہیں ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ تخت نشینی وقتی ہے مگر اس وقت اس کی ہمعصر ہیروئینوں میں کوئی بھی ایسی نہیں تھی جس کو اس کا متبادل کہا جاسکتا۔ شاید اسی کامیابی کے سبب سری دیوی کے معاوضہ کے ساتھ ساتھ اس کا وزن بھی بڑھنے لگا مگر فلم "روپ کی رانی چوروں کا راجہ" میں وہ اسی طرح نظر آئی۔ جیسے فلم "ہمت والا" میں تھی "چاندنی" کے بعد سے سری دیوی کو پھر سے کامیابی کی بلندیوں پر پہنچنا تھا۔ اس سے قبل اس کی "غیر قانونی" "میں تیرا دشمن" "گورو" "جوشیلے" "ناکہ بندی" "فرشتے" "پتھر کے انسان" وغیرہ فلمیں ناکامی کا منہ دیکھ چکی تھیں۔ یہ فلمیں بڑے بڑے بینروں کے تحت معروف ہدایتکاروں کی زیر ہدایت اور مشہور ہیروز کے ساتھ بنائی گئی تھیں اس کے باوجود یہ تمام فلمیں فلاپ ہوگئیں۔ اس ناکامی کا اسے بڑی شدت سے احساس تھا اسی لیے اس نے اپنے نمبرون کے خطاب کو بچانے کے لیے ازسرنو کوشش کی جس کا ثمرہ اسے بونی کپور کی فلم "روپ کی رانی چوروں کا راجا" کی شکل میں ملا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سری دیوی ایک طویل مدت سے نمبرون کا تاج اپنے پاس محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اسے کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ ممی کا ٹکر جس تیزی سے فلم "ٹارزن" کے ذریعے نمبرون کی دوڑ میں شامل ہوئی اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے اس کا کیریئر سُست پڑگیا۔ سونم آئی اور شادی کرکے گھر بسا لیا۔ میناکشی اور جیاپردا نے امیتابھ کی متعدد فلموں میں اس کے مقابل کردار کیے مگر نمبرون کا خطاب حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

اگر سری دیوی کی گزشتہ فلموں پر ایک تجزیاتی نظر ڈالی جائے تو چند فلمیں ہی ایسی ہیں جن میں اس نے اپنے جسم کی نمائش نہیں بلکہ فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے جیسے سولہواں ساون، صدمہ، اور جاگ اُٹھا انسان وغیرہ میں اس نے اپنے تاثراتی چہرے اور شریر آنکھوں کے کرتب دکھائے ہیں اور اپنی پوزیشن کو برقرار رکھا ہے۔ مگر ایک خوف اس کے دل میں برابر موجود ہے اور اس کا یہ خوف بے وجہ بھی نہیں کیونکہ سری دیوی کا مقابلہ اب ایک ایسی فنکارہ سے ہے جس میں صلاحیتیں تو ہیں ہی ساتھ ہی وہ خوبصورت جسم کی مالک بھی ہے اور وہ ہیروئن کوئی اور نہیں، مادھوری دیکشت ہے جس نے این چندرا کی فلم "تیزاب" کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا اور یہ ثابت کردیا کہ اب وہ ہی نمبرون کہلانے کی حقدار ہے۔ وقت کیا فیصلہ کرتا ہے یہ تو مستقبل ہی بتائے گا۔

امیت سنہا

سری دیوی نے اس
وقت کیمرے کا سامنا کیا جب
وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی
کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس
نے ساؤنڈ، لائٹس، کیمرا ایکشن
جیسے الفاظ کے سہارے دنیا کو دیکھنا
شروع کیا اور جوانی تک
شائقین فلم کو محظوظ کرتی رہی



یہ احسان فراموشی

خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں اور کسی بھی کارِ نمایاں پر حوصلہ افزائی کرتے رہیں مگر فِلم انڈسٹری میں اکثر اس کے برعکس ہوتا ہے جس کی ایک زندہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے فلم "میں نے پیار کیا" کے ذریعے بھاگیہ شری نے فلموں میں قدم رکھا اور ڈمپل کپاڈیہ کی طرح اپنی پہلی ہی فِلم کے بعد فِلم انڈسٹری کو خیرباد کہہ دیا مگر جب وہ دوبارہ فلموں میں داخل ہوئی تو اس شرط کے ساتھ کہ صرف اُسی فلم میں کام کرے گی جس میں اس کا شوہر ہمالیہ ہو۔

اب اس کو کیا کہا جائے کہ ہمالیہ صرف نام کا ہی ہمالیہ ہے اور وہ ہمالیہ کی طرح اپنی بیوی کی ترقی کی راہ میں حائل ہو گیا ہے مگر اسے بھاگیہ شری کے اس احسان کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اس نے اسے "قید میں ہے بلبل" میں چانس دلوا کر اپنے مستقبل کو داؤ پر لگایا تھا۔

کامیابی کیلئے عشق

فِلم انڈسٹری کی متعدد روایات میں سے ایک یہ بھی رہی ہے کہ یہاں قدم رکھنے والی تقریباً ہر نئی لڑکی اپنے فلمساز و ہدایتکار پر اپنے حُسن کا جال پھینکتی ہے تاکہ مستقبل تابناک ہو سکے ایک ایسا ہی تازہ معاملہ نوجوان فلمساز و ہدایتکار وِمل کمار اور اُپاسنا سنگھ کے عشق کا معاملہ روشنی میں آیا ہے۔ یعنی یہ کہ اپاسنا نے ترقی کے لیے زینہ تلاش کر لیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح سے حاصل کی گئی کامیابی دیرپا ثابت ہو گی۔



"پھول" یا کانٹے



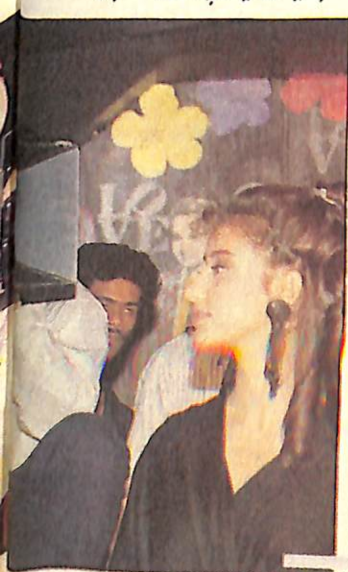
فلم انڈسٹری میں کمار گورو کی آمد فِلم "لو اسٹوری" کے ذریعے بڑے زور سے ہوئی مگر اس کے بعد وہ اپنی امیج کو برقرار نہ رکھ سکا اس کی کئی فِلمیں لگاتار فلاپ ہوئیں تو راجندر کمار فکرمند ہو گئے اور اپنے بیٹے کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے انھوں نے فِلم "پھول" کی شروعات کر دی جس میں آج کی مقبول اداکارہ مادھوری دکشت اسکے مقابل ہیروئین کا کردار ادا کر رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں فِلم کی شوٹنگ کے دوران راجندر کمار نے پریس والوں کو سیٹ پر نہیں آنے دیا اور کہا کہ فلم کا ٹرننگ پوائنٹ فلمایا جا رہا ہے۔ "گر یونٹ کے لوگوں نے بتایا کہ کمار گورو گھبرایا ہوا تھا اور اپنے پیار کا اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ "خدا جانے یہ فِلم کا ٹرننگ پوائنٹ تھا یا کمار گورو کا۔"

فِلمی دیوتا

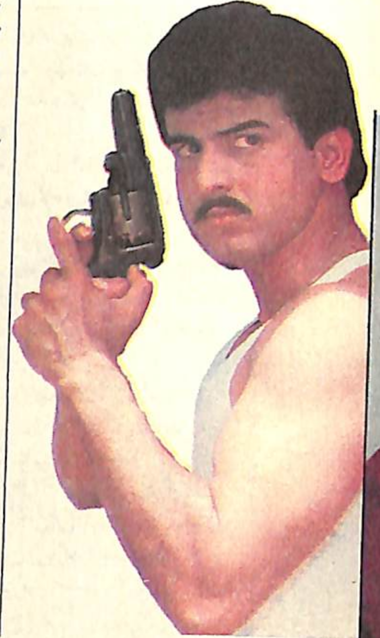
فِلم "دیویا شکتی" کے ایک سین میں امریش پوری کو پھولوں سے سجے چبوترے پر بٹھا کر دودھ سے نہلایا گیا تو انھوں نے اسے اپنی اہمیت کا جواز بتاتے ہوئے کہا "اب تک صرف دیوتاؤں کو



ہی دودھ سے نہلایا جاتا رہا ہے مگر فِلم میں مجھے دودھ سے نہلایا گیا ہے۔ اب اگر میں اپنا معاوضہ بڑھا دوں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے"۔ مگر ڈر ہے کہیں معاوضہ بڑھوانے کے چکر میں فلمی دیوتا کی پوجا ہی بند نہ ہو جائے۔



ترقی کی راہ پر رونیت



اگر دل میں کچھ کرنے کا عزم ہو اور ذہن پر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی لگن ہو تو منزل خود بخود چل کر اس کے پاس آجاتی ہے۔

رونیت رائے کی جدّوجہد کا سفر ہوٹل سی راک کی ملازمت سے شروع ہوا اور ماڈلنگ کی دنیا سے ہوتا ہوا فلمساز جمی نرولا کی فلم "جان تیرے نام" کے ذریعے فِلم انڈسٹری تک پہنچا۔ اب اِس کے پاس سینانی، بم بلاسٹ، انتا کشری، کرودھت، میگھا حساب، آگ کے ستارے اور انتقام وغیرہ جیسی فلمیں ہیں دِیکھنا یہ ہے کہ اسکی منزلِ مقصود کیا ہے۔

امیج کی فِکر

فلمی میک اپ روموں کی رنگین داستانیں بے حد مشہور ہیں۔ کبھی کبھی لوگ اپنی موجودہ امیج سے ہٹ کر کچھ کرنے کے لیے اسی میک اپ روم کا سہارا لیتے ہیں۔ فلمالیہ اسٹوڈیو کے میک اپ روم میں عامر خان اپنا میک اپ کروا رہا تھا۔ شاٹ تیار تھا مگر وہ باہر نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہر بار پکارنے پر یہی جواب مِلتا "آتے ہیں بھئی"۔ ڈائریکٹر پریشان ہوگیا کہ "کہیں اندر کچھ گڑبڑ تو نہیں..." مگر اسکا سوچنا غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ عامر جب باہر نِکلا تو بڑی مشکل سے اوپر کی طرف سیدھے کر کے بنائے گئے بال اور پتلی لمبی مونچھوں کے میک اپ میں تھا جو ڈائریکٹر کی ہدایات کے بالکل برعکس تھا۔ شاید اسلئے کہ زدہ ہیروئن کے مقابلے بچہ لگنے کی امیج کو توڑنا چاہتا ہو۔



کتنا سچ کتنا جھُوٹ

فلم انڈسٹری کی دو پُرانی اداکاراؤں میں سے ایک نندہ نے تو منموہن ڈیسائی سے منگنی کرلی اور اب فلمی حلقوں میں دو افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ناصر حسین اور آشا پاریکھ نے شادی کرلی ہے اور دوسری یہ کہ دونوں نے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔

اگر یہ سچ ہے تو انتہائی افسوس کی بات ہے کہ آشا پاریکھ کو اس عمر میں اس گھر سے باہر آنا پڑا جس کے آنگن میں وہ برسوں سے مُلکی کی طرح رہ رہی تھیں۔

شریف صدیقی

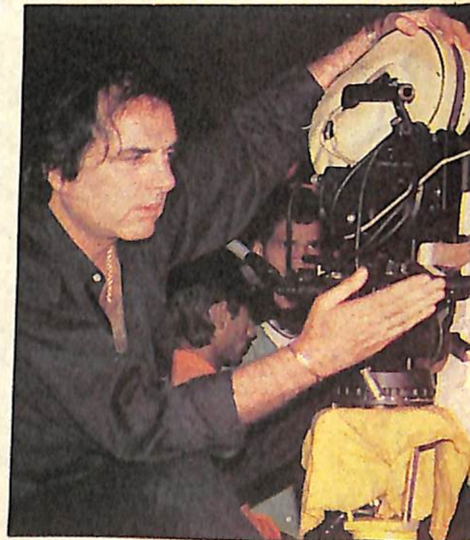


کامیابی کا نشہ

کامیابی ایسا نشہ ہے جو ایک بار کسی کے سر چڑھ جائے تو پھر نہ صرف اُترنے کا نام نہیں لیتا بلکہ ایسی حرکتیں بھی سرزد ہونے لگتی ہیں جن سے خود کو تو نقصان ہوتا ہی ہے دوسرے بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔

ڈینشا کوئرالہ کو اپنی پہلی ہی فِلم "سوداگر" سے کامیابی کا ایسا نشہ چڑھا کہ اس نے بعد کی تقریباً تمام فلموں کے فلمسازوں کو نخرے دکھانے شروع کر دیئے اور زیادہ فلمیں کرنے کے چکر میں بی اور سی گریڈ کی فِلمیں سائن کرلیں جس کا خمیازہ اسے اس طرح بھگتنا پڑ رہا ہے کہ اب اسے اکثر فلمسازوں نے اپنی فِلموں میں لینا بند کر دیا ہے۔

اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی اگر منیشا نے اپنا رویہ نہ بدلا تو یہ اسکے مستقبل کے لیے نقصاندہ ہوگا۔



"ابھی شادی کیلئے فرصت کہاں؟"

مادھوری دیکشت

کسی بھی اداکارہ کی کامیابی کا اندازہ اس کی ان فلموں سے لگایا جاتا ہے جو پوری طرح اسی کے ارد گرد گھومتی ہوں اور فلم انڈسٹری میں ایسی بھی اداکارائیں موجود ہیں جو بڑے بڑے ہیروز کے ساتھ فلمیں کرتی تو ضرور ہیں مگر فلم کی کامیابی کا کریڈٹ خود لے جاتی ہیں۔ ایسی ہی اداکاراؤں میں مادھوری دیکشت کا شمار بھی کیا جاتا ہے۔ فلم "بیٹا" کی زبردست کامیابی کے بعد ہمارے دل میں ان سے ملنے کی تمنا پیدا ہوئی اور ہم اس فلم کی کامیابی سے متعلق تفصیل جاننے کے لیے ان سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔

* بیٹا کی کامیابی پر آپ کیسا محسوس کرتی ہیں؟

⊙ "فلم کی کامیابی کی خوشی یونٹ کے تمام لوگوں کو ہوتی ہے اور میں بھی یونٹ کا ایک حصہ ہوں لہٰذا "بیٹا" کی کامیابی سے مجھے بھی خوشی ہوئی۔ ویسے مجھے پہلے سے یقین تھا کہ یہ فلم ہٹ ضرور ہوگی۔"

* فلم "بیٹا" میں انیل کپور کا رول مرکزی تھا مگر فلم کی کامیابی کا سہرا آپ کے سر گیا جس کی وجہ سے انیل کپور ناراض ہے کیا یہ صحیح ہے؟

⊙ "یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں "بیٹا" میں انیل کپور نے چاہے مرکزی کردار ادا کیا ہو مگر میرا رول بھی کچھ کم اہم نہیں تھا اس لئے ان کے ناراض ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔"

* فلم "زندگی ایک جوا" میں آپ کا رول کوئی خاص نہیں تھا پھر بھی آپ نے اسے کیا، کیوں؟

⊙ صرف پرکاش مہرہ جی کی وجہ سے کیونکہ تقریباً چار سال قبل مجھے اچھی کہانی، بہترین کردار اور بڑے بینر کی ضرورت تھی اور پرکاش مہرہ ایک معروف اور پروفیشنل فلم میکر ہیں۔ میں ان کے ساتھ پھر کام کرنا چاہوں گی۔ دنیا جانتی ہے کہ جب امیتابھ بچن کچھ بھی نہیں تھے تب پرکاش مہرہ نے ہی انھیں زمین سے آسمان پر پہونچا دیا تھا۔"

* آج آپ جس مقام پر ہیں کیا اس سے مطمئن ہیں؟

⊙ "انسان کسی حال میں بھی مطمئن نہیں رہتا۔ اس قول سے تو واقف ہی ہوں گے آپ، میں بھی مطمئن نہیں ہوں کیونکہ ابھی اور آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ میرے لئے یہ قدرت کا بہت بڑا انعام ہے کہ اب فلمی مصنف مجھے ذہن میں رکھ کر کہانیاں اور کردار لکھنے لگے ہیں۔"

* فلمیں بنانے کے طریقے میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

⊙ "لوگ فارمولہ فلموں سے بور ہو گئے تھے۔ ایک نو اسٹوری چلی تو اکثر فلمسازوں نے ایسی ہی فلمیں بنا ڈالیں پھر کوئی ایکشن فلم ہٹ ہوئی تو اسی طرح کی فلموں کا ڈھیر لگ گیا۔ جس سے شائقینِ فلم کو بوریت ہونے لگی اور اسی بوریت کو دور کرنے کے لئے فلمیں بنانے کے طریقے میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آئندہ بھی ایسی ہی تبدیلیاں ہوتی رہیں تو اچھا ہوگا۔"

* آپ کے پاس بڑے بڑے بینرس کی فلمیں ہیں۔ آفر زیادہ اور وقت کم، تو آپ فلموں کا انتخاب کیسے کرتی ہیں؟

⊙ "ہر وہ رول جو مجھے اچھا اور نیا لگتا ہے میں اسکو منع نہیں کرتی، دوسرے یہ دیکھتی ہوں کہ اس کا ڈائریکٹر کون ہے، اس کا بیک گراؤنڈ کیسا ہے؟"

* سنا ہے اب آپ صرف وہی فلمیں کر رہی ہیں جن میں ایک ہی ہیروئن ہو خواہ ڈبل رول ہی کیوں نہ کرنا پڑے یہ کہاں تک درست ہے؟

⊙ "نہیں ایسی بات نہیں، فلمساز ہی مجھے ایسی فلموں کے آفر کر رہے ہیں جن میں صرف ایک ہی ہیروئین ہو۔ حالانکہ میں نے فلم "سنگیت" میں ماں، بیٹی کے رول کئے ہیں اس کے بعد مجھے "آنسو بنے انگارے" میں بھی ڈبل رول ہی آفر ہوا جسے میں نے قبول کر لیا۔"

* آپ کامیاب ہیں باصلاحیت ہیں مگر ابھی تک نمبر ون نہیں بن سکیں کیوں؟

⊙ "میں نمبر ون پر چاہے نہ ہوں مگر مجھے خوشی ہے کہ لوگ باصلاحیت تو مانتے ہی ہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟"

* اپنی آنے والی فلموں سے کیا اُمید رکھتی ہیں؟

⊙ "مجھے اپنی ہر فلم سے اچھی اُمید ہے کیونکہ میں محنت و لگن سے کام کرتی ہوں۔"

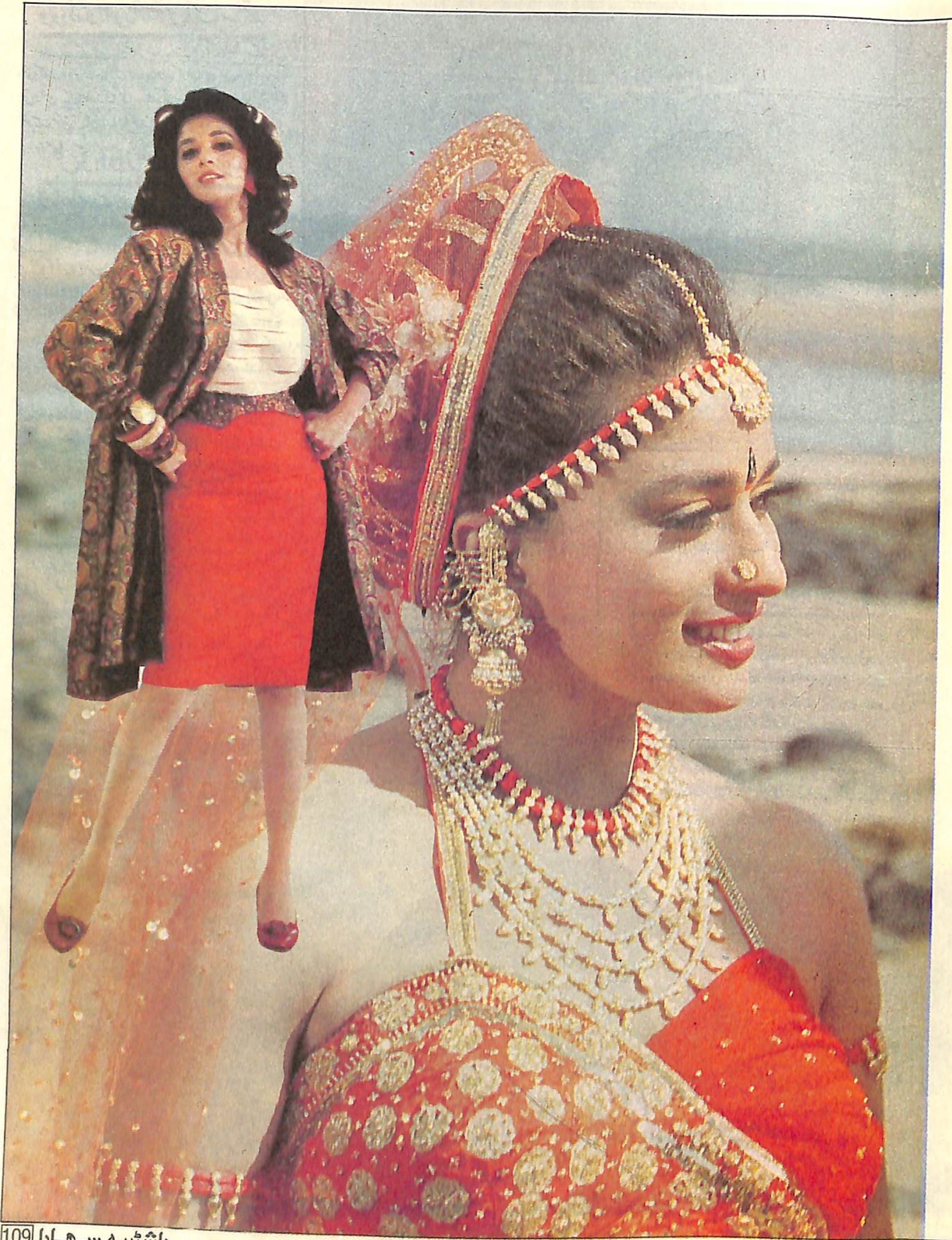
* اپنی آنے والی فلموں کے بارے میں بتائیں، ان میں کیسے کردار کر رہی ہیں؟

⊙ "فلم "کھیل" کامیڈی فلم ہے اس کی شوٹنگ بیرونِ ملک میں ہوئی تھی وہاں کے لوکیشن بہت خوبصورت ہیں۔ "آنسو بنے انگارے" میں ڈبل رول کر رہی ہوں۔ "صاحبان" "لیلیٰ مجنوں" جیسی کہانی پر مبنی ہے اس میں میرا کردار جذباتیت سے بھرپور ہے۔ ان کے علاوہ کئی دوسری فلموں میں بھی میرے اچھے اور اہم کردار ہیں۔"

* شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟

⊙ "فی الحال کوئی اِرادہ نہیں، پہلے اپنا کیریئر بنانا ہے، ویسے بھی شادی کے بارے میں سوچنے کی فرصت کہاں ہے، جب وقت اجازت دے گا اور فرصت ملے گی شادی بھی کر لوں گی۔"

نمائندہ راشٹریہ سہارا



ونود کھنہ، اوینا ش ایک ساتھ

فلمساز کے سی۔ بوکاڑیہ نے اپنی اگلی فلم کے لئے ونود کھنہ اور اوینا ش ودھاون کو سائن کیا ہے، ہدایت منی ورتن کے سپرد کی گئی ہے، زیبا بختیار اور عائشہ جلکا فلم میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔

"کل کی آواز" کا آخری مرحلہ

بی۔ آر۔ فلمز کے بینر تلے بننے والی فلمساز وہدایتکار بی۔ آر۔ چوپڑا کی فلم "کل کی آواز" کی ریکارڈنگ، ڈبنگ اور بیک گراؤنڈ میوزک کی تکمیل کے ساتھ اس کا آخری مرحلہ پورا ہو گیا۔ فلم کے ستاروں میں دھرمیندر، راج ببر، امرتا سنگھ، نینا گپتا، گوفی پینٹل، فریدہ جلال، ارجن، گرجا شنکر اور ہیمنت اِسر کے علاوہ پرتبھا سنہا اور روہت کی نئی جوڑی رومانی کردار ادا کر رہی ہے۔ کہانی اور مکالمے ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے ہیں۔ اسکرین پلے ستیش بھٹناگر کا ہے۔ یہ کلونت جانی اور ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی کاوشوں کا سنگم ہے اور سمیر کے گیتوں کو اپنی دھنوں سے سجایا ہے ندیم شروَن نے۔ اس فلم کے اگست کے پہلے ہفتہ میں منظر عام پر آنے کی توقع ہے۔

"عاشق آوارہ" نٹراج میں

اُمیش مہرہ کی زیر ہدایت بننے والی فلمساز پرویش مہرہ کی فلم "عاشق آوارہ" کی گذشتہ دنوں نٹراج اسٹوڈیو میں پندرہ روزہ شوٹنگ مکمل ہو گئی جس میں سیف علی خاں، ممتا کلکرنی، سعید جعفری، موہنیش بہل،



فلم "مسکراہٹ" میں جے مہتہ اور ریوتی

پنکج دھیر، ارچنا پورن سنگھ، راکیش بیدی اور قادر خاں وغیرہ نے حصّہ لیا۔ اسکرپٹ شکتی مان کی تحریر کردہ ہے۔ آنند بخشی کے گیتوں کو اپنی موسیقی کی روح بخشی ہے لکشمی کانت پیارے لال نے۔

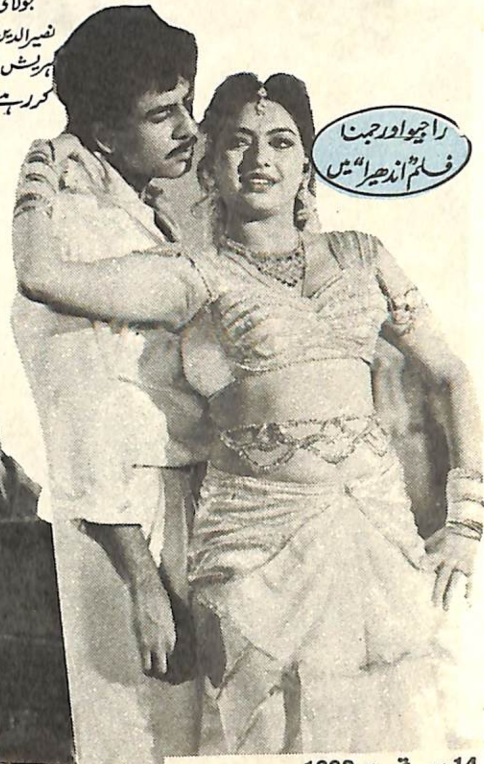
"بیدردی" کی شروعات

لاما پروڈکشنز کی فلم "بیدردی" کی شروعات بنگلور میں ایک طویل شوٹنگ شیڈیول سے ہوئی۔ نصیر الدین شاہ، ریتا رائے، گووندا، اُرملا متونڈکر، ہریش پٹیل اور کرن کمار اس فلم میں مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔ فلمساز لارنس ڈیسوزا اور منوہر پانڈیا کی اس فلم کی ہدایت کرشن کانت پانڈیا دے رہے ہیں۔ دنیش گاندھی کی پیش کردہ "بیدردی" کی موسیقی

لکشمی کانت پیارے لال نے ترتیب دی ہے۔ گیت آنند بخشی کے تحریر کردہ ہیں۔ کہانی و اسکرین پلے دیوجیوتی رائے کے اور مکالمے دلیپ شکلا نے تحریر کئے ہیں۔

متھن چکرورتی "دلال" میں

فلمساز پرکاش مہرہ نے متھن چکرورتی، عائشہ جلکا، پرسن جیت، منگل ڈھلوں اور شکتی کپور کو اپنی دو زبانوں میں بننے والی ہندی۔ بنگلہ فلم "دلال" کے لئے سائن کر لیا ہے۔ پرکاش مہرہ پکچرس کے بینر تلے زیر تکمیل اس فلم کی ہدایت پارتھو گھوش کے سپرد کی گئی ہے۔ اسکرین پلے راجیش مجومدار اور مکالمے انور خان کے تحریر کردہ ہیں۔ گیت کار پرکاش مہرہ اور انجان ہیں جبکہ موسیقی بپی لہری نے ترتیب دی ہے



راجیو اور جمنا فلم "اندھیرا" میں



سبھاش گھئی اور سنجے دت فلم "کھلنایک" کے سیٹ پر

عائشہ "101 ڈیز" میں

وکٹری انٹرنیشنل کے بینر تلے بن رہی فلمساز کرن کوہلی کی فلم "101 ڈیز" میں عائشہ جلکا کو اویناش ودھاون کے مقابل کردار کے لئے سائن کر لیا گیا ہے پارتھو گھوش کی ہدایت میں بن رہی اس فلم کے دیگر ستاروں میں نصیرالدین شاہ، جیتندر، زیبا بختیار اور الوک اگروال ہیں۔

شاہ رخ کی "پیار بے شمار"

منموہن ڈیسائی نے ایم۔ کے۔ ڈی فلمز کی اگلی فلم "پیار بے شمار" کے لئے شاہ رخ خاں کو بطور ہیرو سائن کیا ہے۔ انھیں اُمید ہے کہ شاہ رخ خاں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کریں گے

"ہم ہیں بے مثال" مکمل

دیپک یاہری کی ہدایت میں بن رہی فلمساز مسز گپتا کی فلم "ہم ہیں بے مثال" بارہ روزہ شوٹنگ کے بعد مکمل ہو گئی ہے۔ اس فلم میں اکشے کمار، سنیل شیٹی، امدھو رگھوناتھ، پران، رضا مراد، گلشن گروور اور الوہم کھیر نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ کہانی سورج سنیم کی ہے اور موسیقی رام لکشمن نے ترتیب دی ہے۔



اپاسنا سنگھ فلم "پھولوتی" میں

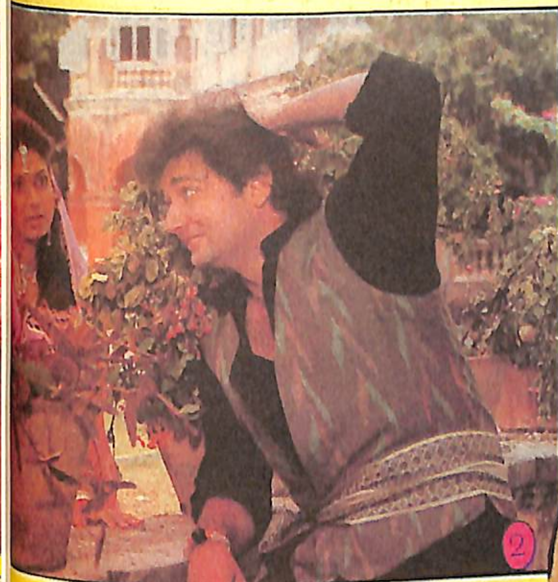
ارمان۔ عائشہ ایک ساتھ

ہیرا انٹرنیشنل پروڈکشن نمبر 4 کی پندرہ روزہ شوٹنگ بمبئی کے مختلف علاقوں میں ہوئی۔ پارتھو گھوش کی ہدایت میں بننے والی فلمساز پشپا ایس چودھری کی اس فلم میں ارمان کوہلی، عائشہ جلکا کے علاوہ پران، کرن کمار، گلشن گروور اور سداشو امراپورکر کے نام قابلِ ذکر ہیں اسکرین پلے اور مکالمے رنبیر پشپ کے تحریر کردہ ہیں اور موسیقی ترتیب دی ہے جیت جیت آہوجہ نے جنھوں نے حال ہی میں اس کے دو گانے بھی ریکارڈ کر لئے ہیں۔

مہیش بھٹ کی "تڑی پار"

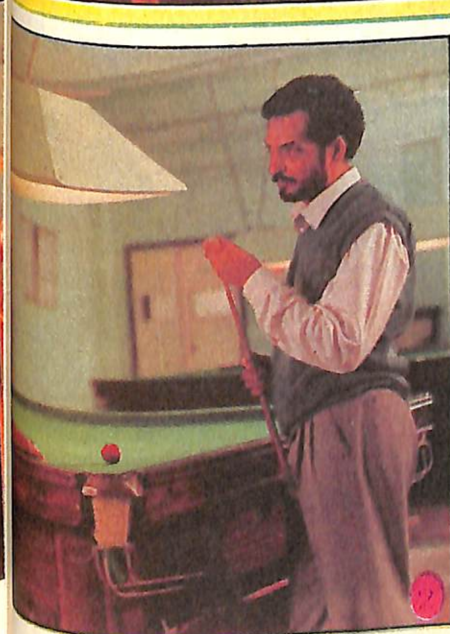
فلمساز مکیش بھٹ نے اپنی نئی فلم "تڑی پار" کا اعلان کیا ہے۔ جس کی ہدایت مہیش بھٹ کے سپرد کی گئی ہے۔ وشیش فلمز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے ستاروں میں متھن چکرورتی، اکشے کمار اور پوجا بھٹ کو سائن کیا گیا ہے۔ کہانی پروفیسر دیکشت کی تحریر کردہ ہے اور شیام سندر اپنی خوبصورت دھنوں سے اسے سنواریں گے۔

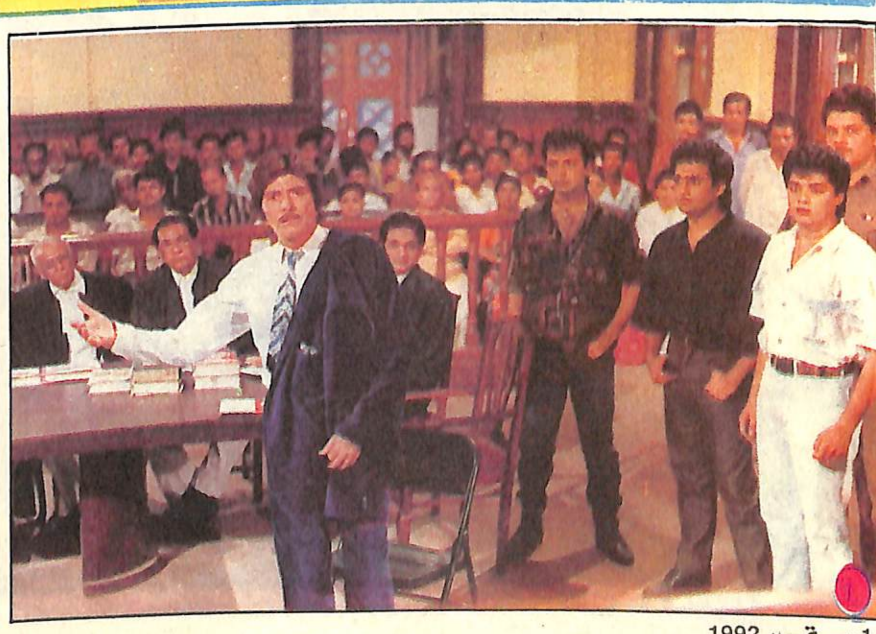












"گھر آیا میرا پردیسی"

1. اویناش ودھاون، ورشا اُسگاؤنکر
2. اویناش ودھاون، ورشا اُسگاؤنکر
3. اویناش ودھاون، ورشا اُسگاؤنکر
4. اویناش ودھاون، بھاگیہ شری
5. ورشا، آشا، گلشن گروور اور وکرم گوکھلے





ترنگا

1. راجکمار، ہریش و دیگر
2. راجکمار، نانا پاٹیکر
3. ہریش، ممتا کلکرنی
4. ہریش، ممتا کلکرنی









آپ کے سوال
راج ببّر کے جواب

شمیم انور ——— دیوبند

● آپ نے قارئین کے سوالوں کے جوابات دینے کے لیے "راشٹریہ سہارا" کا ہی انتخاب کیوں کیا؟

○ کیا آپ کو اردو میں اس سے اچھا رسالہ نظر آتا ہے۔

دلنواز احمد ——— حیدرآباد

● آپ کے پسندیدہ اداکار کون کون سے ہیں؟

○ وہ سبھی جو آپ کو پسند ہیں۔

رما شکلا ——— مان پور، گیا

● کیا اداکاری کی تربیت حاصل کرنے کے بعد فلموں میں کام مل سکتا ہے؟

○ فلموں میں کام حاصل کرنے میں لگن اور قسمت کا بہت بڑا دخل ہے۔

زاہد مرزا ——— رائے پور

● آنجہانی سمیتا پاٹل کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

○ 17 اکتوبر 1955۔

جاوید قمر ——— دہلی

● گاندھی جی نے اپنی زندگی میں کتنی فلمیں دیکھیں؟

○ گاندھی جی نے صرف ایک فلم "رام راجیہ" دیکھی تھی۔

اوم پرکاش ——— فریدآباد

● آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟
23 جون۔ آگرہ۔

○ 102، مرمیڈ، جوہو، بمبئی۔

عشرت خاں ——— جودھپور

● پیار اور کشش میں کیا فرق ہوتا ہے؟

○ کشش چہرے پر ہوتی ہے مگر پیار دل میں ہوتا ہے۔

فیروزہ ہاشمی ——— مومن پورہ

● فلم انڈسٹری میں نئے چہروں کی آمد سے آپ کو کوئی خطرہ؟

○ نہیں، میرا اپنا الگ مقام ہے، ہر آدمی اپنی جگہ بناتا ہے۔

فرحان قادری ——— پٹنہ

● بیوی کے آنسوؤں کی قیمت کیا ہے؟

○ جو اس کے پسندیدہ تحفے کی ہو۔

فرحت زیبا ——— بریلی

● آدمی کے پیار کی اصلیت کب معلوم ہوتی ہے؟

○ جب اس کو ضرورت محسوس ہو۔

نذیر احمد ——— حیدرآباد

● عورت سب سے زیادہ کسے پسند کرتی ہے؟

○ اپنے آپ کو۔

احتشام حسین ——— نئی دہلی

● انسان اور جانور میں کیا فرق ہے؟

○ جانور میں انسانیت و ہمدردی کا مادہ ہوتا ہے جبکہ انسان میں . . .

معین الدین خاں ——— جے پور

● قبر کے کتبوں پر تعریفی جملے تحریر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

○ باحیات لوگوں کو موت کا مزہ چکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے۔

منظور احمد ——— دہلی

● اگر دنیا میں کسی قسم کا کوئی قانون نہ ہو، ہر شخص اپنی اپنی خواہش پوری کرنے لگے تو کیا ہوگا؟

○ جنگل راج ہوگا۔

شاہین مرزا ——— کلکتہ

● پھولوں کے ساتھ کانٹے کیوں ہوتے ہیں؟

○ اس کی حفاظت کے لیے۔

الیاس قریشی ——— آگرہ

● انسان اپنے آپ کو کب بھول جاتا ہے؟

○ ہر نشے میں۔

سراج الدین خاں ——— پٹیالہ

● احسان فراموش کسے کہتے ہیں؟

○ جو قرضدار رہنا پسند کرتے ہوں یا بے حس ہوں۔

جواد الحق ——— دربھنگہ

● قسمت پر بھروسہ کب کرنا چاہیے؟

○ جب عمل کی طاقت نہ رہے۔

اصغر علی ——— ہاوڑہ

● بڑا آدمی بننے کے لیے کن کن باتوں کا ہونا ضروری ہے؟

○ کیسا بڑا آدمی؟

امین بٹ ——— سری نگر

● شادی کیا ہے؟

○ دو دلوں کی داستان۔

چاند خاں ——— میرٹھ

● مرد کی عقل پر پتھر کب پڑتے ہیں؟

○ جب وہ اپنے آپ کو کمزور سمجھے۔

محمد احمد ——— دہلی

● محبت کیا ہے؟

○ دلوں کی تجارت۔

صادق مرزا ——— بڑودہ

● دوستی میں نقصان کب اٹھانا پڑتا ہے؟

○ جب دوست نادان ہو۔

سہارا فلمی مقابلہ

1000

روپے کے نقد انعامات

پہلا انعام 500 ٗ دوسرا 300 ٗ تیسرا 200 روپے

شرائط

● ادارے سے متعلق افراد اوران کے اعزا کے علاوہ اس مقابلے میں راشٹریہ سہارا کے تمام قارئین حصہ لے سکتے ہیں۔ ● جوابات کے ساتھ راشٹریہ سہارا کا کوپن آنا ضروری ہے ● صحیح جواب بھیجنے والے پہلے تین حضرات میں بذریعہ قرعہ اندازی انعامات تقسیم کیے جائیں گے ● مقابلے کے بارے میں ادارہ کا فیصلہ قطعی و آخری ہوگا۔ ● 30 ستمبر کے بعد آنے والے جوابات شاملِ مقابلہ نہیں ہونگے۔

سوالات

1 اس اداکارہ کا نام بتایئے؟

2 فلم کا نام؟

3 فلمساز و ہدایتکار کا نام؟

4 وہ پہلی ہندوستانی فلم کونسی تھی جسے راشٹرپتی ایوارڈ سے نوازا گیا؟

5 فلم "آہ" میں نرگس کی بڑی بہن کا کردار کس نے کیا تھا؟

6 پرانی فلموں کے مزاحیہ اداکار گوپ کی پہلی اور آخری فلم کون سی تھی؟

7 موسیقار ہیمنت کمار کا پورا نام بتائیں؟

8 محمد رفیع کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

9 بطور گلوکار اُن کی پہلی فلم کون سی تھی؟

10 انھوں نے کس کس زبان میں اور کتنے گانے گائے؟





کوپن

سہارا فلمی مقابلہ

نام ____________

مکمل پتہ ____________

____





اَوتار گِل

مجھے تو بس پیسہ چاہئے

ایس . ایم . یونس

ٹی وی ناظرین کے لیے اوتار گِل کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ٹی۔ وی سیریل" یہ جو ہے زندگی" سے اپنے کیریئر کا آغاز کرنے والے اس فنکار نے نکڑ، شری کانت، انتظار، ایک دو تین چار (جو بچوں کے لیے تھا) گُنی رام، "تلاش، مشعل" اور صبح کے وقت دکھائے جانے والے کئی سیریلوں کے ذریعے نہ صرف اپنے فن کا لوہا منوایا ہے بلکہ اپنی ایک مکمل شناخت بھی قائم کرلی آپ کو یہ جان کر شاید تعجب ہوگا کہ یہی اوتار گِل مذکورہ بالا تمام سیریلوں سے قبل بھی کئی فلموں میں پردہ پر نظر آچکا تھا لیکن اس کے رولز صرف اتنے ہی ہوتے تھے' کہیں ایکسٹراؤں کی لائن میں کھڑے ہوئے تو کہیں کسی جلوس میں شامل ہوکر ہاتھ اُٹھائے ظاہر ہے کہ ایسی معمولی جھلک میں کون کس کو یاد رکھ پاتا ہے۔ لیکن ٹی وی کا رُخ کرتے ہی اس کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا' آنے والے ہر سیریل نے اوتار گِل کی فنکارانہ صلاحیتوں کا احساس دلایا اور فلمی دنیا کے وہ لوگ جنھوں نے اوتار کو کبھی ایک ایکسٹرا سے زیادہ کچھ نہ سمجھا تھا اس کی صلاحیت کے نہ صرف معترف ہوگئے بلکہ اُسے اچھے رولز بھی دینے لگے اس طرح اوتار گِل فلم اور ٹی وی کا ایک مصروف ومعروف اداکار بن گیا۔ آج اس کے پاس نہ صرف کئی اچھے سیریل ہیں بلکہ بڑے بڑے بینرز کی متعدد فلموں میں بھی وہ کئی اہم کردار ادا کر رہا ہے مہیش بھٹ جیسے سپرہٹ ڈائریکٹر کی تقریباً ہر فلم میں وہ کسی نہ کسی کردار میں موجود ہے اس کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اس پیشے کو فن کی خدمت کا نام دے کر فن پر کوئی احسان نہیں لادتا۔ اس کا کہنا ہے ——— "میرا سب سے بڑا شوق ہے پیسہ کمانا۔ میں ہر اس آدمی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں جو مجھے میرے کام کا بھرپور معاوضہ دے۔ میری نظر میں صرف وہی لوگ اچھے ہیں جو مجھے میرے کام کے لیے زیادہ سے زیادہ پیسے دیں۔ کیونکہ میرا اور کوئی کام نہیں ہے، میری روٹی روزی اسی کے سہارے چلتی ہے۔"

ایک ملاقات کے دوران اس نے بتایا کہ عام لوگوں کا خیال ہے کہ فلم یا سیریل کے ہر اداکار کو بہت زیادہ معاوضہ ملتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ صرف ہیرو اور ہیروئنوں کو ہی بھرپور پیسہ مِل پاتا ہے کیوں کہ فلم ان ہی کے نام پر چلتی ہے اکثر لوگ ان ہی کو دیکھنے کے لیے فلم دیکھتے ہیں ساتھ میں ہم لوگ بھی نظر آجاتے ہیں اور جب کوئی بار بار نظر آتا ہے تو خود بخود اس سے شناسائی محسوس ہونے لگتی ہے اس طرح ناظرین سے ہمارا بھی رشتہ قائم ہوجاتا ہے اس رشتے کو میں اپنی اس 15 سالہ جد وجہد کا انعام مانتا ہوں جس میں میری جوتیاں اور سر دونوں گھس گئے ہیں۔"

اس سوال پر کہ کیا وہ اب تک کے اپنے کام سے مطمئن ہے۔ اوتار نے کہا: "اس انڈسٹری میں جو کچھ کر دکھانا چاہتا ہے وہ باہر ہوجاتا ہے اس لیے میں تو صرف کام کرتا ہوں اور پیسے لے کر مطمئن ہوجاتا ہوں۔ البتہ میری اتنی کوشش ضرور رہتی ہے کہ رول کے لیے جو معاوضہ مجھے ملنے والا ہے اس کا حق ادا کروں۔"

ونیتا ملک

"ٹیلی فلموں کی رسائی بہت دور تک ہے"



اداکارہ ونیتا ملک تقریباً ایک دہائی سے مستقل ٹی وی ناظرین کے سامنے رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ذہن میں آتے ہی سیریل "ہم لوگ، دادی ماں جاگی، تصویر کا دوسرا رُخ، زندگی زندگی، یہ گلستاں ہمارا، پر پورنن، دل دریا، دوسرا کیول" اور "خالی ہاتھ" وغیرہ کے وہ تمام کردار یاد آتے ہیں جن کو اس نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے بل پر زندگی بخشی ہے، کردار کتنے ہی چیلنج سے پُر ہوں اُنھیں زندہ کر دکھانے کا فن ونیتا کو بخوبی آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج وہ ٹی وی کے ہر بڑے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ گذشتہ دنوں ہماری اس سے ملاقات ہوئی تو یہ عقدہ بھی ہم پر کھلا ٹی وی پر سنجیدہ نظر آنے والی یہ اداکارہ صرف باصلاحیت ہی نہیں خوش گفتار، ملنسار اور حاضر جواب بھی ہے، رسمی گفتگو کے بعد ہم نے ونیتا سے سوال کیا۔

● ونیتا جی — فنی دنیا میں آپ کا داخلہ اسٹیج سے ہوا یا ٹی وی سے یا اس کے علاوہ کسی تیسرے ذریعہ سے؟

"اس دنیا میں داخل تو میں اسٹیج کے ذریعہ ہی 1972 میں ہوئی تھی، لیکن اس کے بعد ٹی وی پلے "دواہ بندھن" کے ذریعہ ٹی وی اسکرین سے کچھ ایسا ناطہ جڑا کہ بس اسی کی ہو کر رہ گئی۔ اب تک میرے تقریباً 25 سیریل ٹی وی پر دکھائے جا چکے ہیں جن میں میرے کرداروں کو ناظرین نے بھرپور سراہا ہے۔"

● کیا وجہ ہے کہ آپ کی فلم "اُتیجنا" باکس آفس پر بُری طرح ناکام رہی؟

"اُتیجنا" کی ناکامی کے کئی اسباب تھے، اوّل تو یہی کہ اس کی نمائش پورے ملک میں ایک ساتھ نہیں کی جا سکی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی ٹھیک طور پر تشہیر نہیں کی گئی جبکہ فلم کی لاگت کا 20 فیصد حصہ اس کی تشہیر پر خرچ ہونا چاہیے تھا۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ اس فلم میں ایک بالکل ناتجربہ کار اداکار کو میرے ساتھ بطور ہیرو لیا گیا۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں کوئی فلم بھلا کس طرح ناظرین کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔"

● ونیتا جی — ٹیلی فلموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا ان سے کسی فنکار کے کیریئر کو استحکام مل سکتا ہے؟

"دیکھئے جناب میں نے اب تک تین ٹیلی فلموں میں کام کیا ہے۔ جن کے نام ہیں "سپا پامکیا، بیٹی" اور "شیشے کی دیوار" ان ٹیلی فلموں سے مجھے بہت اچھا ریسپانس ملا ہے بلکہ ان ہی کی بدولت مجھے فیچر فلم "اُتیجنا" "اب آئے گا مزہ" اور "پولیس پبلک" میں رولز ملے۔ لہٰذا میں تو یہی کہوں گی کہ ٹیلی فلمیں اگرچہ چھوٹے پردے پر دکھائی جاتی ہیں لیکن ان کی رینج بہت زیادہ ہوتی ہے اس لئے ٹیلی فلم اگر اچھے ڈھنگ سے فلمائی جائے اور اس میں کوئی فنکار ٹھیک طور پر اپنے فن کا مظاہرہ کرے تو اس کے کیریئر کو ضرور استحکام حاصل ہوگا۔"

● آپ کو کن کن ڈائرکٹروں کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے؟

"میں اب تک 30-35 ڈائرکٹروں کے ساتھ کام کر چکی ہوں اگرچہ ان سب کا کام کرنے کا ڈھنگ مختلف ہے لیکن ان میں ایکھ منڈن، اسمٰعیل شراف، پی کمار واسودیوا، پنکج پراشر، سمیر چودھری اور راجیشور ناتھ واقعی باصلاحیت تجربہ کار اور قابل ڈائرکٹر ہیں میری خواہش ہے کہ میں آئندہ بھی ان لوگوں کے ساتھ کام کرتی رہوں۔"

● فنی دنیا میں آنے کے لئے کیا آپ کو آپ کے والدین سے بھی کوئی مدد ملی یا محض اپنی ہی جدوجہد سے یہاں تک پہنچی ہیں؟

"دراصل میرے والد ڈاکٹر امرناتھ جی مجھے بھی ڈاکٹر ہی بنانا چاہتے تھے لیکن میں جیسے ہی اسکول سے کالج میں پہنچی ویسے ہی میرے اندر کی فنکارہ کروٹیں بدلنے لگی۔ میرے والد کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے اختلاف نہیں کیا بلکہ میری رہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ اداکاری کے ساتھ ساتھ رقص بھی سیکھو ایک فنکار کو فن کے ہر پہلو پر پورا پورا دھیان دینا چاہیے۔" ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے رقص کی تعلیم حاصل کی آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرے والد واقعی بہت دور اندیش تھے۔"

● آپ کے بھائی آلوک ناتھ کا شمار آج کل کامیاب ترین فنکاروں میں ہوتا ہے ان کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

"آلوک بھیا بہت نیک انسان ہیں ان کی تو جتنی تعریف کی جائے کم ہے اگر میں کسی وجہ سے کچھ دن بمبئی نہیں جا پاتی تو وہ خود مجھ سے ملنے دلی آجاتے ہیں۔"

● آپ اداکارہ ہیں، ٹیچر ہیں اور گھر ہستن بھی۔ اپنی حقیقی زندگی کے ان مختلف کرداروں کے ساتھ آپ ایک ہی وقت میں کس طرح انصاف کر پاتی ہیں؟

"اس بارے میں تو میں صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گی کہ میں شوٹنگ کے دوران اداکارہ، اسکول میں ٹیچر اور گھر پر صرف گرہستن ہوتی ہوں۔"



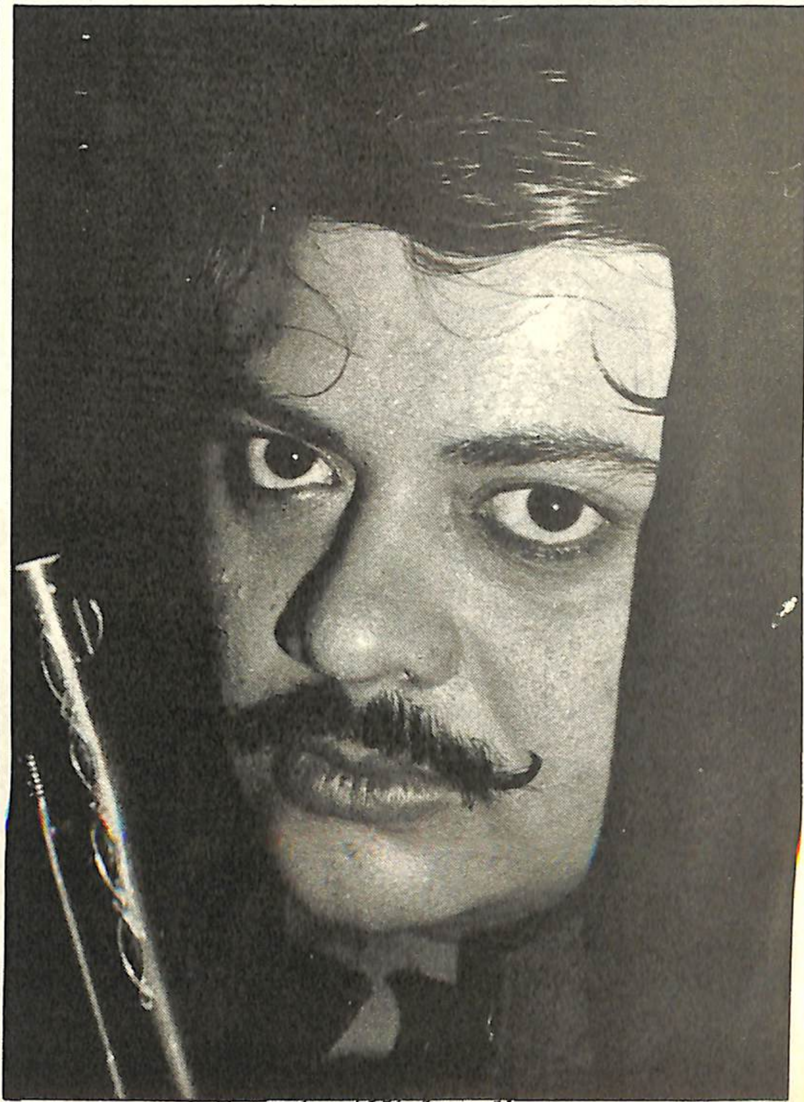
بقائے آزادی میں ٹی وی کا کردار

سیریل اور ٹیلی فلمیں بنانے والوں نے آزادی سے متعلق مناظر پیش کرتے وقت اس حقیقت کو کسی حد تک فراموش کر دیا کہ ہمارے وطن عزیز کی آزادی میں شہیدانِ وطن کی قربانیوں کے ساتھ ساتھ گاندھی جی اور دیگر وطن پرستوں کے عدم تشدد نے بھی اہم رول ادا کیا تھا۔

ٹیلی ویژن آج دنیا بھر میں سب سے مضبوط، مستعد اور برق رفتار مواصلاتی ذریعہ ہے۔ اسی لئے عوام و خواص کی اس سے کچھ زیادہ امیدیں وابستہ رہی ہیں۔ اس وقت جب اس کی ابتدا ہوئی تو اس کے تین خاص مقاصد تھے، خبروں کی ترسیل، سماجی اصلاح اور تفریح۔ ظاہر ہے کہ تینوں مقاصد نیک تھے۔ لہٰذا عوام کو اس کا بھرپور فائدہ ہوا، اور ٹی وی کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ شہر کی حدود سے نکل کر دیہات تک اس کی رسائی ہوئی تو اس سے وابستہ امیدوں میں اضافہ ہوا، اور اسے ملک کی تعمیر میں معاون و مددگار کا درجہ دیا جانے لگا۔

دوردرشن نے جنگ آزادی کے دوران کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ کیونکہ اس وقت ہمارے ملک میں کوئی ٹیلی ویژن اسٹیشن نہیں تھا لیکن آزادی کو مستحکم بنانے اور قومی یکجہتی و سالمیت کو برقرار رکھنے میں دوردرشن اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ کچھ حد تک یہ اپنی اس ذمہ داری کو پورا بھی کر رہا ہے۔ اکثر و بیشتر ٹی وی سیریلوں کے ذریعے حب الوطنی، فرض شناسی اور جذبۂ ایثار و قربانی جیسی اعلیٰ صفات کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ "ٹیپو سلطان کی تلوار، کہاں گئے وہ لوگ، مرزا غالب، بہادر شاہ ظفر، ہم لوگ، بنیاد، تمس" وغیرہ جیسے ٹی وی سیریلوں نے یقیناً ناظرین کے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کو متاثر کیا۔ لیکن شہیدانِ وطن اور مجاہدینِ آزادی کے حالاتِ زندگی چھوٹے پردے پر پیش کرتے ہوئے کبھی کبھی دانستہ یا نادانستہ طور پر تشدد اور انتہا پسندی کا پروپیگنڈہ ہونے لگتا ہے۔ اس بارے میں دوردرشن کے ذمہ داران کو احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

ٹی وی سیریل اور ٹیلی فلمیں بنانے والوں نے آزادی سے متعلق مناظر پیش کرتے وقت اس حقیقت کو کسی حد تک فراموش کر دیا کہ ہمارے وطنِ عزیز کی آزادی میں شہیدانِ وطن کی



نتین من موہن "چندر شیکھر آزاد" کے کردار میں

قربانیوں کے ساتھ ساتھ گاندھی جی اور دیگر وطن پرستوں کے عدم تشدّد نے بھی اہم رول ادا کیا۔ ملک کے موجودہ سیاسی حالات میں جب کہ کشمیر، پنجاب اور آسام میں انتہا پسندی، دہشت گردی، لوٹ کھسوٹ اور تشدّد کا زور ہے۔ بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے عدم تشدّد، ستیہ گرہ اور صبر و ضبط کی اہمیت و افادیت کو دلکش انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا دوردرشن اس ضرورت کو بحسن و خوبی پورا کر سکتا ہے۔ دور حاضر میں تشدد کے روحانی، جسمانی اور سماجی نقصانات کو اجاگر کرنا ہی دوردرشن کا فرض اوّلین ہے کیونکہ ہماری آزادی کے لئے آج سب سے بڑا خطرہ دہشت گردی، انتہا پسندی اور تشدّد ہی ہیں۔

دوردرشن نے ناظرین کے دلوں میں ہندوستانی ثقافت و تہذیب سے محبت پیدا کرنے کے لئے "رامائن" اور "مہابھارت" جیسے کامیاب سیریل پیش کئے لیکن افسوس کہ ان عظیم سیریلوں میں بھی تشدّد کی فراوانی رہی۔ ٹی وی سیریلوں کا دوسرا خاص موضوع زمیندارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کی برائیاں پیش کرنا بھی رہا ہے۔ یقیناً زمینداروں اور جاگیرداروں نے عوام کا استحصال کیا لیکن اب یہ دور ختم ہو چکا ہے۔ یہ دورِ سرمایہ داری ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام نے معاشی، جسمانی، سیاسی اور سماجی استحصال کے ایسے نئے طریقے اور ہتھکنڈے ایجاد کئے ہیں جو زمیندارانہ طریقوں کے مقابلے میں زیادہ ظالمانہ، خطرناک، اور ہیبت ناک ہیں۔ لہٰذا دوردرشن کے لئے سیریل اور فلمیں بنانے والوں کو ان کا پردہ فاش کرتے ہوئے نچلے اور درمیانہ طبقات کو ان ہتھکنڈوں سے بچنے کا راستہ دکھلانا چاہئے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ بعض ٹی وی پروگراموں میں تاجروں، ڈاکٹروں، پروفیسروں، وزیروں، اور سرمایہ داروں کی پول کھولی گئی ہے۔ اور نہایت دلچسپ و طنزیہ انداز میں کھولی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں جسپال بھٹی کے سیریل "الٹا پلٹا" "فلاپ شو" اور دلیپ سنگھ کے تحریر کردہ سیریل "تصویر کا دوسرا رخ" قابل ذکر ہیں۔

آزادی برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو بے نقاب کیا جائے، جو ملک میں رہ کر غدّاری کرتے ہیں یا غدّاری کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ دشمن صرف وہی نہیں ہوتے جو ملک کی سرحد پر حملہ کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے بڑے دشمن وہ ہوتے ہیں۔ جو ملک کے اندر فرقہ وارانہ فسادات، نوجوان نسل میں نشے کی بڑھتی ہوئی عادت اور اسمگلنگ کے لئے ذمہ دار ہیں یہ لوگ ملک کی بنیادوں کے لئے دیمک ثابت ہوتے ہیں۔ ان سب کا پردہ فاش کیا جانا چاہئے

یہ بات نہیں کہ دوردرشن نے اس معاملے میں اپنا تعاون دیا ہی نہیں، دیا تو ہے، لیکن بہت ہی کم۔ کل ملا کر ہم فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر ہی زور دیتے رہے۔ ایسے پروگراموں کی بہت کمی ہے، جس سے لوگوں کو آزادی کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ مگر اب تک اکثر یہ دکھایا جاتا رہا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، موہن داس کرم چند گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، چندر شیکھر، اور بھگت سنگھ جیسے لوگوں نے ملک کو آزاد کرانے میں کیسی کیسی پریشانیوں کا سامنا کیا، اور کیا کیا تکلیفیں برداشت کیں۔



سیریل "بھارت کے شہید" کا ایک منظر

تین گھنٹے کی فلم یا تیرہ قسطوں کے پورے سیریل میں محبانِ وطن پریشان اور غدّارانِ وطن عیش کرتے نظر آئیں گے تو نوجوان نسل کے کچے ذہنوں پر اس کا اثر منفی ہوگا یا مثبت؟

ہمارے یہاں ٹی وی پر دکھائی جانے والی بہت سی فلموں، ڈراموں، اور سیریلوں میں دکھایا جاتا ہے کہ جو لوگ ملک کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں وہ کتنے عیش و آرام سے زندگی گذار رہے ہیں اور یہی باتیں ہماری نوجوان نسل پر برا اثر ڈالتی ہیں اور آگے چل کر یہ ناسور کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اکثر فلم ساز اپنے فرض سے بری الذمہ ہونے کے لئے تین گھنٹے کی فلم یا تیرہ قسطوں پر مشتمل سیریل میں برے آدمی کو صرف پانچ منٹ میں بدحال دکھا دیتے ہیں، اب یہ بات قابل غور ہے جو شخص سیریل کی تیرہ قسطوں میں عیش و آرام کرتا ہوا دکھائی دیا اور کلائمکس میں مر جاتا ہے یا قید ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے عوام اور خاص طور پر نوجوان نسل کچھ سیکھ نہیں سکتی اور نہ ان کے خیالات میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے بلکہ کچے ذہنوں پر اس کا منفی اثر پڑ سکتا ہے۔

اب دوردرشن کے افسران کو بہت سنجیدگی سے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ عوام کے ذہنوں پر دوردرشن کے موجودہ کردار کے نقش کو کس طرح مٹائے اور ایک نیا رخ دکھلائے، جو ملک کی آزادی برقرار رکھنے کے لئے عوام کو بیدار کرے اور ملک و قوم سے محبت کرنا سکھائے۔



اڑان کے ایک منظر میں کویتا چودھری اور انل دستوگی

اپنا اپنا آسمان
ماٹی
اور کسان جاگ اٹھا

گزشتہ 7 اگست سے دوردرشن کی رات 9 بجے کی نشریات میں نئے سیریل "اپنا اپنا آسمان" کی نمائش شروع کی گئی ہے۔ جو مشہور ادیب ستیندر شرد کے ناول "کوشلیا" پر منحصر ہے۔ اس سیریل کا نام بھی شروع میں "کوشلیا" ہی رکھا گیا تھا۔ لیکن بعد میں بدل کر "اپنا اپنا آسمان" کر دیا گیا۔ جس کے پروڈیوسر وڈائرکٹر کیلاش تلی ہیں۔

یہ سیریل ویسے تو جنگ آزادی کی "انگریزوں بھارت چھوڑو" تحریک کے موضوع پر مبنی ہے تاہم اس میں ایک عورت کے غرور ایک شوہر کی قربانی ایک چچا کے پیار اور ایک بھتیجے کے مظالم کو بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ "کوشلیا" کا لڑکا میڈیکل کالج کا کی "ناڈا" میں داخلہ لے لیتا ہے اور کوشلیا اپنے ماضی کے خیالات میں کھو جاتی ہے۔ اسے وہ وقت یاد آتا ہے جب اس کا شوہر اسے حاملہ چھوڑ کر وطن کی خاطر جیل چلا گیا تھا۔ دوسری طرف اس کے شوہر کو بھی یادوں میں گم دکھایا گیا ہے۔

پانچویں قسط میں نوکرانی اور اس کے شوہر کے پیار کو دیکھ کر کوشلیا اپنے غرور کے بارے میں سوچتی ہے۔ چھٹی قسط میں کوشلیا کا شوہر وینکٹ رمیا گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے کیونکہ اس کے گھر والے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اسی دوران وینکٹ رمیا کی ملاقات لاعلمی کی صورت میں اپنے بیٹے تلک سے ہو جاتی ہے۔ تلک اور آنند (وینکٹ رمیا کا بھتیجا) آپس میں دوست ہیں۔ ایک دن جب آنند کو پتہ چلتا ہے کہ تلک اس کے چچا وینکٹ رمیا کا بیٹا ہے جس نے اس کی شادی "ان پوڑی" جیسی ان پڑھ گنوار اور غریب لڑکی سے کروادی تھی۔ جبکہ اس کی شادی جیوتی جیسی پڑھی لکھی عقلمند لڑکی سے ہونے والی تھی۔ تو وہ اس سے بدلہ لینے کی سوچتا ہے۔

13 قسطوں پر مشتمل اس سیریل میں گریش کرناڈ، ڈاکٹر شری رام لاگو، بینا، پریا دتنوا، اور للت پریمو وغیرہ اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

متعدد ایوارڈ یافتہ اور اپنے وقت کی معروف ترین فلم "مدر انڈیا" نیز سپر ہٹ فلم "آن" اور "انداز" کے مصنف علی رضا کے تحریر کردہ سیریل "ماٹی" کی تیرہ قسطوں کو لکھنؤ دوردرشن نے منظوری دیدی ہے۔ اے کے پروڈکشن کے بینر تلے بننے والا یہ سیریل عوام کی دیہات سے شہر کی طرف ہجرت کے خطرناک نتائج کو عوام کے سامنے لائے گا۔ مصنف علی رضا نے سیریل کے موضوع کو ایک دلچسپ کہانی کے ذریعے عوام کے جذبات سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر اب سے پہلے بھی متعدد فلمیں منظر عام پر آکر عوام سے خراج تحسین پا چکی ہیں لیکن ان کے پیغام کا عوام پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا ہے تاہم چونکہ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فلم کی بہ نسبت ٹی وی کی ریچ زیادہ ہے اور اسکے پروگرام عوام پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا امید کی جاتی ہے کہ یہ سیریل اپنے موضوع سے عوام کو متاثر کر سکے گا۔

ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ سیریل مشہور و معروف موسیقار خیام کی موسیقی سے لبریز ہے۔ جو ایک عرصہ سے دنیائے موسیقی سے کنارہ کئے ہوئے تھے ان کی موسیقی پر سریش واڈیکر اور کویتا کرشنا مورتی نے اپنی آواز کا جادو جگایا ہے۔ راجو خاں اس کے پروڈیوسر وڈائرکٹر ہیں جبکہ کیمرے کی کمان مشہور عکاس ریڈی نے سنبھالی ہے۔

ملبوسات بمل رائے کی بیٹی یشودھرا رائے نے تیار کئے ہیں۔ حال ہی میں فلم "اگنی پتھ" میں بہترین سیٹس کے لئے ایوارڈ یافتہ سدھیندر رائے اس سیریل کے سیٹس تیار کر رہے ہیں۔ نوین نسچل، اخلاق خان، جاگیرا، اے کے ہنگل، نینا گپتا چاندنی اور جعفری وغیرہ اس سیریل میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

اشوک نشیش کی ہدایت میں پروڈیوسر مہندر پال شرما کا دوردرشن کے ذریعہ کمیشنڈ چھ قسطوں پر مشتمل سیریل "اور کسان جاگ اٹھا" کی شوٹنگ گذشتہ دنوں کلکتہ میں ہوئی۔ یہ سیریل 17 ویں صدی میں ہندوستانی کسانوں پر انگریزوں کے مظالم کے خلاف ایک تحریک کو پیش کرتا ہے اس تحریک سے وابستہ بھوانی پاٹھک، دیوی چودھرانی، کینا سروا، اور دھیرج نارائن اس سیریل کے مرکزی کردار ہیں۔

اس تحریک کی خاص بات یہ رہی تھی کہ اس میں فقیروں اور سادھوؤں نے بھی کھل کر حصہ لیا تھا۔ پہلی قسط کا آغاز سنتوش آنند کے تحریر کردہ گیت۔

"وہ دیکھو دھرتی ڈولی
ہے سب کی خالی جھولی
پھنکار مار کر جو ناگ اٹھا
اور کسان جاگ اٹھا......"

سے ہوتا ہے جس کو سریش واڈیکر کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اس قسط میں خشک سالی سے متاثر کسانوں پر انگریزی سرکار کا ظلم دکھایا گیا ہے جس کے خلاف بھوانی پاٹھک کسانوں کو متحد کر کے آواز اٹھاتا ہے سیریل کے آخر میں تمام احتجاجی مارے جاتے ہیں۔

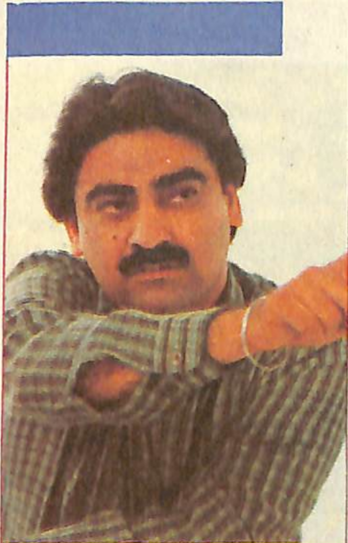
اہم کرداروں میں راکیش شرما، سونالی چٹرجی، راجیش وویک، عارف بیگ، سریندر شرما، ہیمنت مشرا، ٹام آلٹر اور آنند شرما وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ موسیقار جوڑی سوریہ اور چندر کمل نے اس سیریل کی موسیقی ترتیب دی ہے۔ ■



سیریل "رامائن" کے خالق رامانند ساگر کا نیا سیریل "کرشنا" دوردرشن پر ٹیلی کاسٹ نہ ہو سکا تو مسٹر ساگر نے اسے ویڈیو کیسٹ میں بند کر کے عوام کے لیے پیش کر دیا اور جب عوام نے بھی اس میں خاطر خواہ دلچسپی نہ دکھائی تو اب وہ اس کی دوسرے ممالک میں نمائش کے لیے وہاں مقیم شری کرشن کے عقیدتمندوں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں لیکن کیا ترقی یافتہ ممالک کے مصروف عوام مسٹر ساگر کی آواز پر کان دھر سکیں گے۔



"اور کسان جاگ اٹھا" کا ایک منظر



ٹیلی فلم "پاتال کوٹ" میں پرمیندر سنگھ

آنے والی ٹیلی فلمیں

تاریخی پس منظر پر مبنی آنیوالی ٹیلی فلم "اویناشی" اور معاشرہ میں عورت کے کردار کی عکاس "سارا دن سانجھ" کی مختصر کہانی اور تعارف قارئین کے پیش ہے

سارا دن سانجھ' فاطمہ نسیم کی لکھی کہانی پر بنائی گئی ٹیلی فلم ہے جس کی کہانی ایک معذور لڑکی کے کردار کو نمایاں کرتی ہے۔ گھر اور سماج جسے "اپنگ" کہکر نظر انداز کرتا رہتا ہے، لمحہ لمحہ اس کی انا مجروح ہوتی ہے اور احساس کمتری اس پر غالب رہنے لگتا ہے۔

مینشا (پونم سرین) ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے: بچپن سے ایک ٹانگ سے محتاج ہے اس کا ایک بھائی بٹو (اسلم خان) ہے جسکے بہت اونچے اونچے خواب ہیں، اپنے ماں باپ (نونہ سوریہ اور قیمتی آنند) کا بے حد لاڈلا ہے۔ یہ بھی اپنی بہن کو اپنے گھرانے پر بوجھ تصور کرتا ہے۔ قدم قدم پر ماں باپ اس کو بیٹی پر فوقیت دیتے ہیں۔ چونکہ والدین کی تمام امیدیں اسی پر ٹکی تھیں۔ معاشی حالت بہت بہتر نہ ہونے کے باوجود والدین بیٹے کی اعلیٰ تعلیم پر قرض لے کر پیسہ بہاتے ہیں اور بیٹی کو کسی قابل نہیں سمجھتے۔ والدین اپنے اکلوتے بیٹے کو تعلیم حاصل کرنے دوسرے ملک بھیجتے ہیں۔

مینشا روز روز کے طعنوں سے تنگ آجاتی ہے۔ اور ایک دن گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر بیٹھتی ہے۔ وہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو گھر والے بھی اسے مردہ تصور کر لیتے ہیں۔ مینشا گھر چھوڑ کر جیون جیوتی ہینڈی کیپ آشرم میں رہنے لگتی ہے اور یہاں سے اپنی زندگی کا سفر نئے عزائم کے ساتھ شروع کرتی ہے۔ داؤ' نام کا ایک کردار اس کی مدد کرتا ہے، وقت کا چکر گھومتا رہتا ہے۔ اس کا بھائی بٹو غیر ملک سے تعلیم حاصل کر کے آتا ہے لیکن اس کو اس کے خیالات مطابق نوکری نہیں ملتی۔ وہ ایسے ہی بھٹکتا ہے۔ ادھر مینشا راؤ اپنے پریمی (پکھراج ودھوا) کی مدد سے آگے بڑھتی رہتی ہے اور آئی اے ایس افسر بن جاتی ہے۔ ایک دن مینشا کے والدین اخبار میں اس کی تصویر دیکھتے ہیں اور اس کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس کے گھر والوں نے اسے بہت سی کربناکیاں سوغات میں دی تھیں لیکن وہ ایک مشرقی عورت کی طرح سب کچھ بھول کر اپنے والدین کے پاس واپس لوٹ آتی ہے۔

دلی اور درشن کے ذریعہ بنائی گئی اس فلم کے ہدایت کار ترن ماتھر ہیں جنہوں نے اس سے پہلے دھیرج کمار کے بنائے گئے سیریل "کہاں گئے وہ لوگ" اور راجیش کھنہ کی پروڈکشن "آدھا سچ آدھا جھوٹ" میں ہدایت کاری کے فرائض انجام دیئے تھے

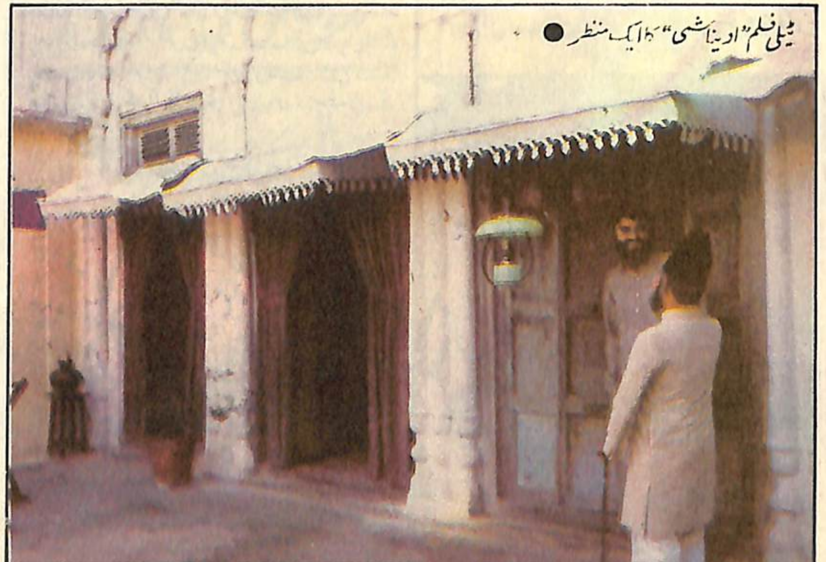
اکثر مجاہدینِ جنگ آزادی اور شہدائے وطن کی زندگیوں پر فلمیں، ٹیلی فلمیں اور ٹی وی سیریل بنتے رہے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک نئی کڑی ہے ٹیلی فلم "اویناشی"۔ جو عظیم انقلابی رہنما اور شہیدِ وطن اشفاق اللہ خاں کی زندگی پر مبنی ہے۔ لکھنؤ کے مشہور فلم ساز اُما شنکر کی فلم ڈویژن کے لئے تیار کردہ اس ٹیلی فلم کی ہدایت آشیش مکھرجی نے دی ہے۔

شہید اشفاق اللہ خاں پنڈت رام پرشاد بسمل سے بے حد متاثر تھے ان ہی کے شعر

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

سے اشفاق اللہ خاں کو وطن کی خاطر سرفروشی کی تحریک ملی اور وہ آزادی کی جنگ میں شامل ہو گئے۔

"اویناشی" میں اشفاق اللہ خاں کے بچپن سے لیکر شہادت تک کے حالاتِ زندگی کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان کی زندگی کے خاص واقعات بخوبی عوام کے سامنے آئیں گے۔ جن میں کاکوری ٹرین ڈکیتی کا منصوبہ بنانے، اسے انجام دے کر فرار ہو جانے اور پھر ڈیڑھ سال کی روپوشی کے بعد گرفتار ہونے پر جابر انگریزی حکومت کے فیصلے کے مطابق تختۂ دار کی نذر ہو جانے کے مناظر شامل ہیں۔ جنہیں ڈائرکٹر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ فلم بند کیا ہے۔ یاد رہے کہ اشفاق اللہ خاں (مرحوم) کو 26 سال کی عمر میں 19 دسمبر 1927 کو پھانسی دیدی گئی تھی۔ 90 منٹ کی اس فلم کی کاسٹ میں زیادہ تر فنکار لکھنؤ ہی کے ہیں۔ جن میں (اشفاق اللہ خاں) نتن رائے، (پنڈت رام پرشاد بسمل) راجیندر رنگم، (انسپکٹر) ڈاکٹر انل رستوگی اور (اشفاق اللہ خاں مرحوم کی ماں کے کردار میں) بھانومتی سنگھ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔



ٹیلی فلم "اویناشی" کا ایک منظر



"آل دی بیسٹ" کے سیٹ پر رونو کھنہ اور سہاس کھانڈکے

آل دی بیسٹ

اور بین الاقوامی کھیلوں پر مبنی
ٹی وی سیریل" آل دی بیسٹ"
نمائش کے لئے تیار ہے۔ جس میں فلمی دنیا کے کئی بڑے اسٹار، ونود کھنہ، ششی کپور، دارا سنگھ الوپم کھیر، چنکی پانڈے اور شکتی کپور وغیرہ پہلی بار چھوٹے پردے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اس سیریل کی ہر قسط میں ایک فلم اسٹار اور چوٹی کے کھلاڑی نظر آئیں گے۔

اس کے خالق سہاس کھانڈکے خود بھی اچھے کھلاڑی رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ایک اچھے باڈی بلڈر کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے، ساتھ ہی وہ ایک فنکار بھی ہیں۔ انھوں نے فلم" سن میری لیلا" کے ہیرو کا رول کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔ اور آج کل دلیپ کمار کی" کلنگا" نیز ہریش ملہوترہ کی فلم "ہیر رانجھا" میں ان کے اچھے خاصے رولز ہیں۔

سیریل" آل دی بیسٹ" کی پہلی قسط کا تعارف ونود کھنہ نے کرایا ہے۔ اور اسی طرح ہر قسط میں ایک فلم اسٹار بطور گائڈ نمودار ہو کر اس قسط کے کھیل کا تعارف کراتا ہے۔ اور بعد میں اس کھیل کا اسٹار کھلاڑی کھیل کے بارے میں تفصیلات ناظرین کو بتاتا ہے۔

عام ڈگر سے ہٹ کر بالکل نئے انداز سے سیریل بنانے کی تحریک سہاس کھانڈکے کو کہاں سے ملی۔؟ اس سوال پر انھوں نے بتایا۔

"ایک دن میں ٹی وی پر ہاکی کا میچ دیکھ رہا تھا میری بیوی مجھ سے بولی۔" یہ لوگ ایک ہی طرف کیوں بھاگ رہے ہیں۔ کیا کرنا چاہتے ہیں یہ؟" یہ سوال سن کر میں چونکا۔ کیونکہ سوال کرنے والی کوئی گاؤں کی جاہل چھوکری نہیں بلکہ شہر میں پلی بڑھی ایک تعلیم یافتہ عورت تھی۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی ایک عورت کی نہیں بلکہ ایک بہت بڑے طبقہ کی آواز ہے۔ جو اکثر کھیلوں سے ناواقف ہے۔ میں نے اس ضمن میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس موضوع پر فلم بھی نہیں تو کم از کم سیریل ضرور بننا چاہئے۔ میں نے کچھ کھلاڑیوں اور کھیلوں پر لکھنے والے صحافیوں سے بات چیت کی سب ہی کو میرا آئیڈیا بے حد پسند آیا۔ اور میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے ان لوگوں نے دوردرشن کے نام ایک خط بھی لکھ دیا، وہاں سے کافی وقت کے بعد جواب آیا کہ موضوع اچھا ہے۔ لیکن سیریل بنانے سے پہلے اسکرپٹ بھیجنا ضروری ہے۔ میں نے اسکرپٹ لکھوا کر بھیجدی، جسے دوردرشن نے پاس کر دیا۔"

آپ نے کن کن کھیلوں کو اس میں شامل کیا ہے۔؟

"کشتی، ٹینس، باکسنگ، کبڈی، باسکٹ بال والی بال اور ٹیبل ٹینس وغیرہ کو۔"

اس میں کرکٹ کیوں شامل نہیں ہے۔؟

"میری تجویز میں کرکٹ بھی شامل تھا، اور اس کے لئے میں نے کپل دیو کو سائن بھی کر لیا تھا، لیکن دوردرشن نے اسے یہ کہہ کر نکال دیا کہ کرکٹ کچھ زیادہ ہی مشہور ہو چکا ہے۔"

اتنے اچھے موضوع کے لئے آپ کو فلم اسٹارز کا سہارا کیوں لینا پڑا۔

"بیمار کے لئے دوا ضروری ہوتی ہے لیکن وہ کڑوی دوا نہیں پینا چاہتا۔ البتہ اگر اسے میٹھی بنا دی جائے تو وہ خوشی خوشی پی جاتا ہے۔ فلم اسٹارز کو سیریل میں اسی لئے شامل کیا تاکہ کھیلوں کے شائقین کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کے ناظرین میں شامل ہو جائیں جو صرف فلم اسٹارز کی ایک جھلک کے دیوانے ہوتے ہیں۔"

اس سیریل کا اسکرپٹ کس نے لکھا ہے؟

"زیادہ تر تو کھیل ماہرین اور صحافیوں نے ہی اس پر کام کیا ہے، ساتھ ہی چوٹی کے کھلاڑیوں سے بھی مدد لی گئی، اور خود میں نے بھی اپنے مشورے دیئے ہیں۔"

کیا آپ کو نہیں لگتا کہ یہ سیریل محض کمنٹری کے سبب عوام کے لئے کم دلچسپ ہوگا۔؟

"ایسا نہیں ہے، دراصل ہم نے کھیلوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ناظرین کو تفریح کے ساتھ ہی ساتھ کھیلوں کے بارے میں معلومات بھی حاصل ہوتی رہیں کہیں کہیں ہم نے کہانی کا تانا بانا بھی بُنا ہے، مثال کے طور پر باکسنگ والی قسط کے شروع میں دکھایا گیا ہے کہ ایک غریب طالب علم اسکول کی فیس لے کر گھر سے نکلتا ہے، راستے میں ایک غنڈہ اس کے پیسے چھین لیتا ہے۔ وہ روتا ہوا اسکے پیچھے بھاگتا ہے۔ ابھی وہ بھاگ ہی رہا ہوتا ہے کہ غنڈہ کے منھ پر ایک زوردار بلو پڑتا ہے، لڑکا قریب پہنچ کر دیکھتا ہے کہ فلموں کے ولن شکتی کپور نے اصلی ولن کو خاک چٹادی ہے شکتی اس کے چھینے ہوئے پیسے بھی غنڈہ سے واپس کرا دیتا ہے۔ تو لڑکا بڑے احسان مندانہ لہجے میں کہتا ہے کہ" شکتی انکل، آپ نے مجھے بچا لیا، نہیں تو اسکول سے میرا نام کٹ ہی جاتا۔"

اس حادثہ کے بعد شکتی کپور باکسنگ کے قواعد بتاتا ہے۔ اور باکسنگ کے پروفیشنل کوچ باکسنگ کے طور طریقے اور کرتب دکھاتے ہیں۔"

"آل دی بیسٹ" نئے انداز کا سیریل ہے۔ اور ایسا نیا موضوع ناظرین کو ضرور پسند آئے گا لیکن اس ستم ظریفی کو کیا کہئے کہ اس کو اسپانسرز نہیں مل رہے ہیں جو اسے ٹی وی پر پیش کرا سکیں۔



چنکی پانڈے اور سہاس کھانڈکے "آل دی بیسٹ" کے سیٹ پر



"رام" کے بدلتے تیور

سیریل "رامائن" کے "رام" ارون گوول نے جب اپنا نیا سیریل "مشعل" شروع کیا تو اُسے رام کی شبیہہ کے سبب اس کی توقع کے مطابق مقبولیت نہیں مل پائی لیکن کچھ ہی قسطوں کے بعد ارون نے اپنے سیریل کی ناکامی کا حل تلاش کر لیا اور بڑے پردے پر قدم جمارہے سدیش بیری کو ناظرین کی دلچسپی کے لئے بطور مسالہ پیش کر دیا خیر یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن تعجب تو تب ہوا جب مشعل کی آخری قسطوں میں ارون نے اس طرح سدیش پر کیمرہ مرکوز کیا



کہ سیٹ پر موجود باقی تمام فنکار بالکل بے وقعت محسوس ہونے لگے۔ یقین نہیں آتا کہ اپنی حقیقی زندگی میں "رام" کا پرتو بن جانے والا ارون گوول اسقدر کاروباری پن اپنا سکتا ہے۔ بہر حال ارون نے اپنا نظریہ بدل کر اچھا ہی کیا۔ ورنہ اس نمائشی دنیا میں صرف مذہب سے کام نہیں چلتا

چانکیہ" کی سیاست ناکام

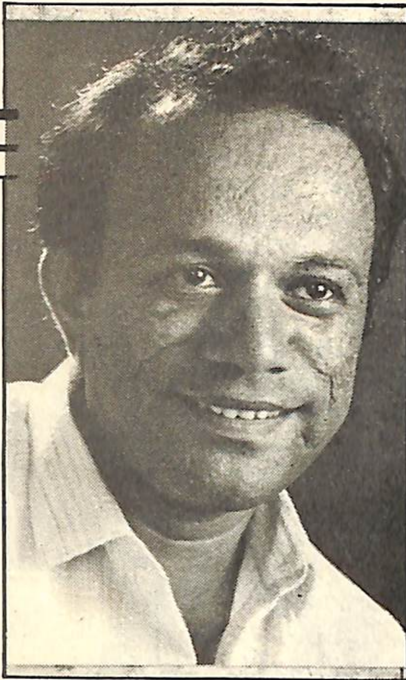
اکثر سیریلوں کے ساتھ دیکھا گیا ہے کہ وہ شروع میں کم مقبول ہوتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے ناظرین میں ان کی مقبولیت بڑھتی ہے لیکن حالیہ دور کے مشہور ترین سیریل "چانکیہ" کے ساتھ یہ معاملہ الٹا رہا وہ اپنی تشہیر، تنازعات اور تذکروں کے باعث شروع میں تو عوام کی دلچسپی کا مرکز رہا لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا ویسے ویسے اس کی مقبولیت میں کمی آتی چلی گئی یہ حال دیکھ کر اس کے اسپانسرز نے بھی ہاتھ روک لئے اور بات یہاں تک جا پہنچی کہ ایک اتوار کو "چانکیہ" ٹی وی پر نہیں دکھایا جاسکا "چانکیہ" (ڈاکٹر چندر پرکاش دویدی) پردے پر بھلے ہی اپنی سیاسی چالبازیوں کے لئے مشہور ہوں لیکن پردے کے پیچھے وہ اپنی حکمتِ عملی میں بری طرح ناکام رہے ہیں اور ان کے معاونین میں ہی بے اطمینانی نظر آتی رہی۔ گذشتہ دنوں "چانکیہ" کا میڈیا کنویئر اجے برصاۓ اس سیریل سے الگ ہو گیا۔ اس کے مطابق اس کو افسوس اس بات کا ہے کہ اسے اندھیرے میں رکھا گیا۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوئی خبروں کے مطابق کئی دوسرے لوگ بھی ڈاکٹر چندر پرکاش کا ساتھ چھوڑنے کی فکر میں تھے لیکن کچھ مجبوریوں کے سبب اب تک ان سے جڑے رہے۔

بہر حال "چانکیہ" تو جیسے تیسے اپنے اختتام کو پہنچ گیا، لیکن ڈاکٹر چندر پرکاش کو اس بات پر غور ضرور کرنا ہوگا کہ ان کی یہ حکمت عملی کیا آنے والے وقت میں انھیں کوئی اہم کارنامہ کر دکھانے کی پوزیشن میں رکھ سکے گی۔

موسمی کی نئی راہ

حالیہ سیریل "تلاش" نے موسمی چٹرجی کو پھر سے جوان بنا دیا ہے، وہ ایک جوان کردار نبھا کر ایک بار پھر امنگوں اور مسرتوں سے لبریز ہو اٹھی ہے۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ "تلاش" کے آغاز کے وقت موسمی نے اپنے کیریئر کے تئیں پھر سے سنجیدہ ہوتے کا اعلان کیا تھا۔ اور سب سے زیادہ تذکروں میں آنے والا تو اس کا یہ بیان تھا کہ "میں سیاست میں قدم رکھوں گی"۔ سنا گیا ہے کہ اسے سیاست میں آنے کا مشورہ اس کے دیرینہ دوست امیتابھ بچن نے دیا تھا۔

بہر حال "تلاش" سے فارغ ہو کر اب موسمی اپنے اعلانات کو عملی جامہ پہنانے پر تلی ہوئی ہے۔ اور اس کے لئے اس نے خدمت خلق



کی صورت میں راہ ہموار کرنی شروع کر دی ہے۔
"دیکھنا یہ ہے کہ موسمی کی ڈوبتی نیا کو یہ تنکے کا سہارا کس قدر راس آتا ہے"۔

شیکھر کے ناکام تجربات

ٹی وی سیریل "ابھیاس" کے شروع ہونے پر شیکھر کپور نے ونے دھمالے کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے



ساتھ کام کرنا بہت سے نئے تجربات حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن ونے دھمالے پر شیکھر کی تعریف کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے سیریل کے کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے شیکھر کے رول کو بالکل بے اثر کر دیا۔ 25 منٹ میں کم از کم دس منٹ تک اپنے چہرے پر فوکس رکھنے کے خواہشمند شیکھر کپور کا رول گھٹتے گھٹتے صرف پانچ منٹ کا رہ گیا۔ اور وہ بھی صرف چند ہی قسطوں میں۔ "کہیے شیکھر بابو تجربات کیسے رہے؟"

مجاہد آزادی

مرارجی ڈیسائی پر فلم

مجاہدین آزادی، تاریخی ہستیوں اور سیاسی بہار تھیوں کی زندگیوں کو سیلولائیڈ پر اتارنے کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے نوجوان فلمساز، ہدایت کار و اداکار دیویندر کھنڈیلوال نے ایک دستاویزی فلم تیار کی ہے جو مجاہد آزادی اور سابق وزیراعظم مرارجی ڈیسائی کی زندگی پر مبنی ہے۔

تحریک آزادی اور اس کے بعد کی ہندوستانی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے والے مرارجی ڈیسائی اپنے دور اقتدار اور اس کے بعد کی اپنی حکمت عملی کے لئے خاصے مشہور رہے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے زندگی میں کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

منفرد شخصیت کے مالک 95 سالہ مرارجی ڈیسائی آج بھی پوری طرح تروتازہ نظر آتے ہیں۔ جن کی زندگی سے وابستہ تمام سچائیوں کو دیویندر کھنڈیلوال نے بڑے اعتماد کے ساتھ فلمایا ہے۔ اس سلسلے میں اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر کھنڈیلوال نے بتایا کہ جب وہ ڈیسائی جی کے پاس اس فلم کی تجویز لیکر گئے تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا" میں نے ایسا کیا کام کیا ہے جو مجھ پر فلم بنائی جائے" لیکن بعد میں خاندان کے لوگوں کی سفارش پر وہ بمشکل تمام راضی ہو گئے۔

دیویندر کھنڈیلوال نے مزید بتایا کہ شری مرارجی ڈیسائی کے بارے میں کچھ لوگوں نے غلط نظریئے قائم کر رکھے ہیں۔ میری اس فلم سے ان کے کردار کی سچائیاں لوگوں کے سامنے آسکیں گی۔

نوجوان فلمساز و ہدایت کار دیویندر کھنڈیلوال سونبدھا



فلمز اور ویڈیو پبلسٹی پرائیویٹ لمٹیڈ جیسے دو بڑے بینرز کے مالک ہیں۔ وہ اس سے پہلے فیچر فلم" موت کی سزا" اور ٹی وی سیریل "بھیم بھوانی" کے علاوہ کئی مختصر فلموں کی بھی ہدایت دے چکے ہیں۔ ساتھ ہی باسو چٹرجی کی فلم "کھٹا میٹھا" میں مرکزی کردار بھی انہوں نے ادا کیا ہے ان کے ذریعے تیار کردہ مختصر فلم "مس انڈیا" چین میں مختصر فلموں کے میلے میں شامل کی جا چکی ہے۔

کھنڈیلوال مسٹر مرارجی ڈیسائی کی زندگی پر منحصر اس فلم کی دوردرشن پر نمائش کے متمنی ہیں تاہم مسٹر ڈیسائی کی سالگرہ پر وہ بمبئی میں اس کی نمائش کر چکے ہیں۔



مرارجی ڈیسائی کے بارے میں کچھ لوگوں نے غلط نظریئے قائم کر رکھے ہیں اس فلم سے ان کے کردار کی سچائیاں لوگوں کے سامنے آسکیں گے۔

بارسلونا اولمپک

آغاز سے انجام تک



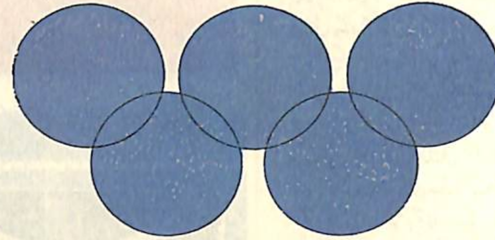
سیلی گنیل

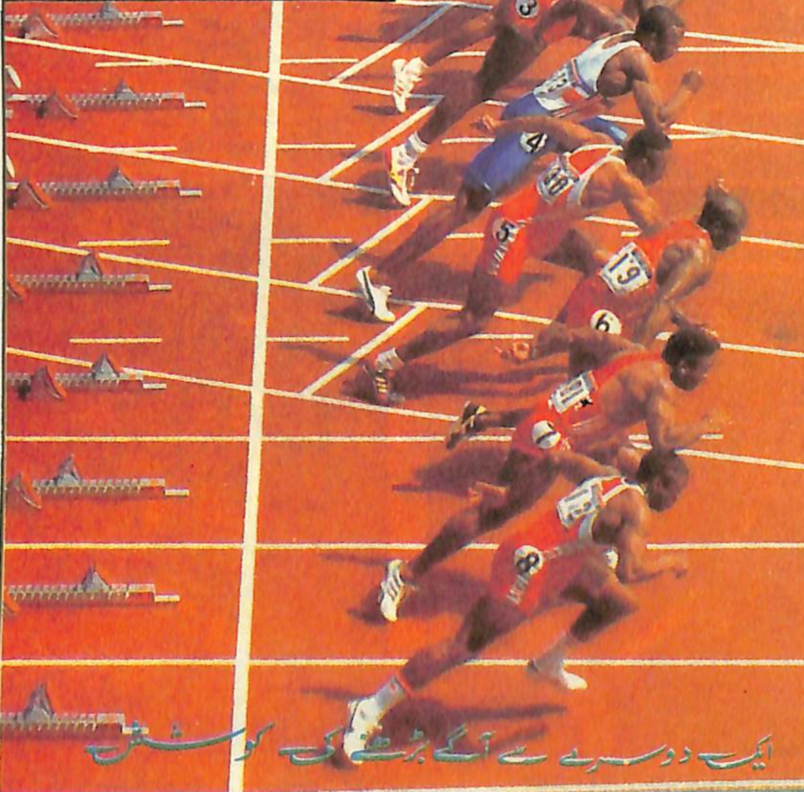


چینی تیراک



بلادی میر





ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش

بارسیلونا میں اولمپک کھیلوں کی سرگرمیاں اور چہل پہل اب ختم ہوچکی ہیں اگرچہ افتتاحی اور اختتامی تقریبات نے اس چہل پہل میں رنگینیاں اور حشر سامانیاں ضرور برپا کیں تاہم اِن کھیلوں نے ایسی کوئی شبیہ قائم نہیں کی جو برسہا برس تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ رہ سکے۔ بارسیلونا میں نہ تو کوئی سیول والا کارل لوئس پیدا ہوا اور نہ ہی لاس اینجلس والا جیکی جائنز جس کے نام سے ہی ذہن کے پردے پر اولمپکس کا حسن اُبھر آتے۔

افتتاحی اور اختتامی تقریبات کے ثقافتی پروگرام اگرچہ بہت اچھے تھے لیکن ان کے انعقاد کا وقت اتنا غلط تھا کہ لوگ چاہ کر بھی خود کو سونے سے نہ روک سکے یہ بات الگ ہے کہ ٹیلی ویژن نے اس کی ویڈیو ریکارڈنگ ناظرین کے لئے پیش کی لیکن پروگرام کو بروقت اور براہ راست دیکھنے کا مزہ ویڈیو ریکارڈنگ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

بہر حال 1992 کی گرمیاں انڈونیشیا، چین اور کیوبا جیسے ممالک کے لئے سوغات لیکر آئیں۔ انڈونیشیا نے اولمپک میں پہلی بار شامل کئے گئے بیڈمنٹن مقابلوں کے زیادہ تر تمغوں پر قبضہ جما کر یہ ثابت کر دیا کہ اس کھیل میں ایشیائی ممالک کا دبدبہ بے وجہ نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے تو یہ بھی صدفیصد سچ ہے کہ چین صرف کچھ ہی نہیں بلکہ بہت کچھ کھونے کے لئے تیار ہے اور بارسیلونا نہ صرف اس کے اس جذبے کا بلکہ اس کی طاقت کا بھی گواہ بن گیا ہے۔ اس کے کھلاڑیوں کے انداز و اطوار نے ماہرین کو یہ رائے قائم کرنے پر بھی مجبور کیا کہ آئندہ اولمپکس میں چین ضرور کوئی نہ کوئی کرشمہ دکھائے گا۔ دوسری طرف ایک طویل عرصہ بعد اولمپکس میں شرکت کرنے والے کیوبا نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر عزائم پختہ ہوں تو محدود وسائل کامیابیوں کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتے۔ اس غریب ملک کی کارکردگی

اولمپکس میں شکست خوردہ کئی بڑے ممالک کے لئے درس عبرت ہے۔ رکیو با کی ٹیم نے اپنی فتوحات کا سلسلہ بیس بال میں طلائی تمغہ حاصل کر کے شروع کیا اور پھر جب باکسنگ میں اس کے مکے بازوں نے اپنے جوہر دکھائے تو ان کے قہر سے اسٹیڈیم میں موجود ہزاروں تماشائیوں کے دل دہل اٹھے۔ اس کے ہیوی ویٹ رابرٹ بیلاڈو کے لئے یہ اولمپکس یادگار رہے۔ اس نے گولڈ میڈل کے ساتھ ساتھ بیسٹ اسٹائلسٹ مکے باز کے طور پر "بارکر کپ" بھی حاصل کیا۔

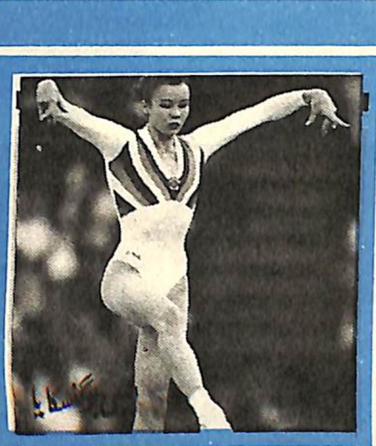
بارسیلونا میں اجتماعی کارکردگیاں تو کئی ممالک کی قابلِ تعریف رہیں لیکن انفرادی طور پر منسک نگر کا نیلی آنکھوں والا اقد آور جمناسٹ ویتالی شیربو اکیلے ہی چھ طلائی تمغے حاصل کر کے بارسیلونا اولمپک کا "سپر مین" ثابت ہوا۔ بائلوروس کے اس بہادر جمناسٹ کو اخبارات نے اگرچہ اپنی شاہ سرخیوں میں خاطر خواہ اہمیت نہیں دی لیکن یہ سچ ہے کہ اس نے واقعی ایک ناقابلِ فراموش کرشمہ کر دکھایا ہے۔

بارسیلونا روس کی آزاد جمہوریاؤں کے اتحاد سی آئی ایس کے کارناموں کا بھی آئینہ دار رہا۔ جس نے شاید آخری بار متحدہ طور پر اولمپک میں شرکت کرتے ہوئے ان مقابلوں کے چیمپئن کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا۔ کمیونزم کے خاتمہ کے بعد الگ الگ ہو جانے کے سبب روسی آزاد جمہوریاؤں کے اتحاد سی آئی ایس کی طاقت میں کمی ضرور آئی ہے لیکن اس نے امریکا کے چیمپئن شپ کے دعوے کو بالکل کھوکھلا ثابت کر دیا۔

بارسیلونا اولمپکس تمغات کی فہرست میں دوسرے نمبر پر رہے امریکا کو اپنے کھلاڑیوں کی مایوس کن کارکردگی سے جو دھچکا لگا ہے۔ اسے وہ بہت عرصہ تک یاد رکھے گا۔ اسی طرح پہلی بار متحد ہو کر کھیل رہے جرمنی نے اگرچہ تمغات کی فہرست میں تیسرا مقام حاصل کر لیا لیکن مشرقی اور مغربی جرمنی کے اس اتحاد سے کھیل شائقین نے جس تہلکہ خیز کارکردگی کی توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں۔ پھر بھی جرمنی ٹیم نے کئی کھیلوں میں بہترین مظاہرہ کیا۔ خاص طور پر گھوڑ سواری میں اس کا کارنامہ قابلِ دید رہا۔ اس میں اسے تین طلائی تمغوں سمیت کل چھ تمغات حاصل ہوئے۔

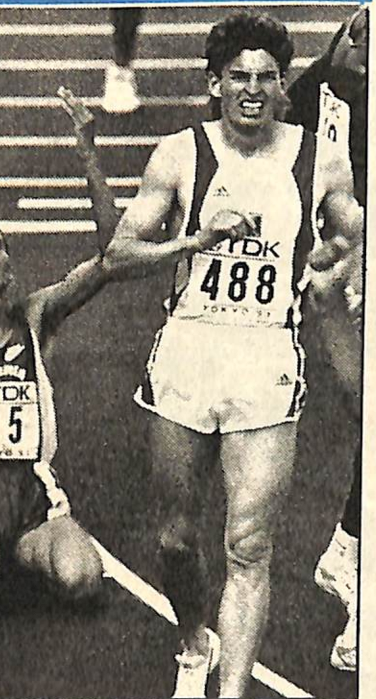
اس اولمپک کے میزبان اسپین کو اپنی ہی سرزمین پر کھیلنے کا خاطر خواہ فائدہ ضرور حاصل ہوا اور گذشتہ بارہ سالوں میں صرف چار طلائی تمغے حاصل کرنے والے اس ملک نے نہ صرف فٹ بال کا عالمی چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا بلکہ زیادہ سے زیادہ تمغات پانے والوں کی دوڑ میں 13 طلائی 7 چاندی اور 2 کانسے کے تمغے جیت کر چھٹا مقام بھی پالیا۔



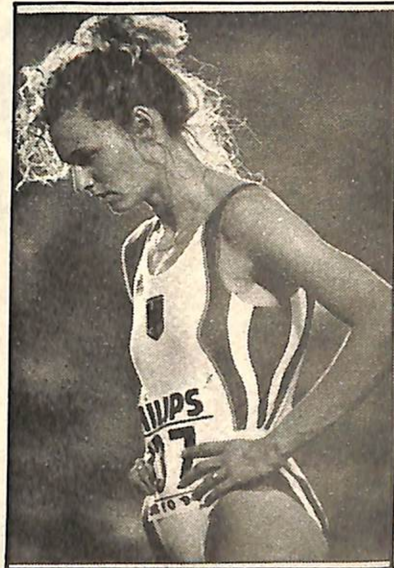


بارسیلونا اولمپک میں جنوبی کوریا کا کارنامہ صحیح معنوں میں انوکھا رہا۔ 25 ویں اولمپک کا پہلا تمغہ تو اس نے جیتا ہی تھا، ساتھ ہی آخری مقابلے یعنی مردوں کی میراتھن دوڑ بھی اس کے ایتھلیٹ ہوانگ یونگ چو نے جیت کر بارسیلونا اولمپکس کے آخری طلائی تمغہ پر بھی اپنے ملک کا نام درج کرا لیا۔ اس مقابلے میں چاندی کا تمغہ جاپان کے موریشتا اور کانسہ کا تمغہ جرمنی کے اسٹیفن فیبئی کنگ نے حاصل کی۔

اولمپکس کے جن کھیلوں پر لوگوں کی توجہ زیادہ رہتی ہے ان ہی میں ایک ہاکی بھی ہے جس کے فائنل میں جرمنی نے آسٹریلیا کو 1-2 سے ہرا کر 20 سالوں بعد کوئی طلائی تمغہ جیتنے میں کامیابی حاصل کی۔ جبکہ پاکستان نے اس مقابلہ کا کانسہ کا تمغہ جیت کر کسی طرح اپنا نام تمغات پانے والوں کی فہرست میں شامل کیا۔ ادھر ڈریم ٹیم (خوابی ٹیم) کے نام سے مشہور امریکی باسکٹ بال ٹیم نے کامیابیوں کی آخری بلندی پر اس وقت اپنا جھنڈا لہرا دیا جب اس نے



الجیریا کا کھلاڑی نور الدین



ہیک ہینکل

کروشیا کی ٹیم کو 85 ۔ 117 پوائنٹ سے شکست دے کر اس مقابلہ کا گولڈ میڈل حاصل کیا۔ یہ ڈریم ٹیم بین الاقوامی مقابلوں میں مایوس کن کارکردگیوں کے بعد ہی عالم وجود میں آئی تھی۔ جن میں 1987 کے پین۔ امریکی کھیلوں میں برازیل کے خلاف 1988 کے سیمی، فائنل میں سوویت یونین کے خلاف اور 1990 کی عالمی چیمپئن شپ میں یوگوسلاویہ کے ہاتھوں ملی شکستیں شامل تھیں بہرحال بارسیلونا میں یہ ٹیم ناقابل تسخیر ثابت ہوئی۔

کھیلوں کے آخری دن والی بال کا گولڈ میڈل حاصل کر کے برازیل نے یادگار تحفہ حاصل کیا۔ اسکے کھلاڑیوں نے بہتر بلاکنگ اور ریلنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیدرلینڈ کو 8-15 ، 12-15 اور 5-15 سے شکست دی 1984 کے سیول اولمپک میں برازیل صرف چاندی کا ہی تمغہ حاصل کر پایا تھا۔

بارسیلونا میں گولڈ میڈل حاصل کرنے تک اس نے تین سیٹ گنوائے جبکہ دوسری طرف اسپین آخری دن کھیلے گئے واٹر پولو فائنل میں زبردست مقابلے کے بعد اٹلی کے ہاتھوں 8-9 سے ہار گیا۔

اولمپکس میں سب سے زیادہ دلچسپ رہنے والے ایتھلیٹکس مقابلوں کے نتائج اس بار بالکل غیر متوقع رہے۔ لیرائے بریل اور مشیل کو پیچھے چھوڑتے ہوئے برطانیہ کے لن فورڈ کرسٹی نے 100 میٹر کی فراٹا دوڑ کا گولڈ میڈل حاصل کر لیا اسی طرح خواتین میں امریکہ کی گیل ڈیورس فراٹا دوڑ کی نئی ملکہ بن گئی۔

گذشتہ دو اولمپکس کا فاتح کارل لوئس لگاتار تیسری بار اولمپک کا چمکتا ستارہ بن کر ابھرا۔ اس کی قیادت میں امریکی ٹیم نے 4x100 میٹر ریلے دوڑ میں نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ دوڑ کو دمقابلوں میں بنا یہ صرف دوسرا عالمی ریکارڈ ہے۔

کارل لوئس اولمپک کھیلوں میں اب تک آٹھ طلائی اور ایک چاندی کا تمغہ لے کر خود کو نہ صرف اولمپک کا بلکہ ایک مکمل دہائی کا عظیم ترین کھلاڑی ثابت کر چکا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو محض ایک دہائی تک محدود نہیں رکھنا چاہتا 100 x 4 میٹر کی ریلے دوڑ میں نئے ریکارڈ کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی اسی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں آئندہ سال کے اسپرنٹ (چھوٹی دوڑ) مقابلوں پر دھیان دینا چاہوں گا۔ یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں 1996 کے اولمپکس کے لئے کوالیفائی کر پاؤں گا یا نہیں، لیکن آئندہ اولمپک میں دوڑنا میری دلی خواہش ضرور ہے"

اس بار ٹینس کے نتائج بھی کچھ کم حیران کن نہیں رہے۔ مردوں کے (سنگلز) مقابلوں میں جم کوریر، آندرے اگاسی، ایڈبرگ اور بیکر سمیت کئی عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی گمنامی کے غار میں گر گئے اور روسیٹ کی شکل میں ٹینس کا ایک نیا چیمپئن سامنے آیا۔ اسی طرح خواتین سنگلز میں 16 سالہ جینفر کیپریاتی نے زبردست تجربہ رکھنے والی مشہور زمانہ

اسٹیفی گراف سے لگاتار تیسری بار گولڈ میڈل سے حاصل کرنے کا خواب چکنا چور کر دیا۔ کشتی رانی میں جرمنی اور فری اسٹائل کشتی میں امریکا کے کھلاڑیوں نے زیادہ تر کامیابیاں حاصل کیں۔

اب اسے قسمت کی ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ جہاں 85 کروڑ کی آبادی والے ملک ہندوستان کے 84 کھلاڑی ایک عدد کانسے کے تمغے سے بھی محروم رہے وہاں بیلاروس کے جمناسٹ وتیلا کی شیربو نے اکیلے ہی چھ طلائی تمغے اپنے ملک کے لئے جیت کر تہلکہ مچا دیا۔

شیربو بارسیلونا میں روسی آزاد جمہوریاؤں کے اتحاد سی آئی ایس کی جانب سے میدان میں اترا تھا۔ منسک نگر کے 20 سالہ شیربو نے اپنے فن کا مثالی مظاہرہ کرتے ہوئے مردوں کے رنگ، والٹ اور پیرلل بار کے انفرادی اور ٹیم مقابلوں میں طلائی تمغے جیت کر ایک نئی تاریخ مرتب کر دی۔

3 اگست کو پیر کا دن تھا، جب بارسیلونا کے مونٹ جوئک سے ملحق سینٹ جورڈ ہال میں بیٹھے ہزاروں تماشائی شیربو کے اس ناقابل فراموش کارنامے کے چشم دید گواہ بنے۔ اس روز وہاں منعقد چھ مقابلوں میں سے چار (رنگ، والٹ، پیرلل بار اور ہارس) کے طلائی تمغے شیربو نے ہی جیتے۔

اس نوجوان نے سابقہ سوویت یونین کے چار جمناسٹوں کے چار چار طلائی تمغوں کے ریکارڈ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ سابقہ ریکارڈ بلادمیر اور تیموو (1988) نکولائی آندریانوو (1976) وکٹر چکیرن (1952) اور بورس شکھارن (1960) کے نام تھے۔

ماضی میں یوروپین جمناسٹک چیمپئن رہنے والے شیربو نے اولمپک میں یہ تاریخ ساز کارنامہ انجام دینے کے بعد بیحد مسرور لہجے میں کہا۔ "یہ میری زندگی کا وہ سب سے خوبصورت لمحہ ہے جس کے لئے میں ایک لمبے عرصے سے تیاری کر رہا تھا"

شمالی کوریا کے لئے یہ جمناسٹک مقابلے خوش آئند رہے کیونکہ اسے 16 سالوں کے بعد ان مقابلوں میں کوئی تمغہ مل پایا ہے۔ اس کے کھلاڑی پائی گل سو نے یہ اعزاز اپنے ملک کو دلایا۔ شمالی کوریا کو اس سے قبل 1976 میں پہلی بار تمغہ ملا تھا۔ اسی طرح امریکہ کے لئے بھی یہ پہلا موقعہ ہے جب اس کے جمناسٹ ٹرینٹ ڈمس نے بغیر کسی ملک کے بائیکاٹ کے طلائی تمغہ جیتنے میں کامیابی حاصل کی اس سے قبل اسے اس کی بساط کے مطابق کامیابی اس وقت ملی تھی جب متعدد وجوہات کے سبب کئی ممالک نے اولمپک کھیلوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔

اسی جمناسٹک مقابلے میں جرمنی کے آندریس





بیکر نے طبی معائنہ کرنے والی ٹیم کو اپنے پیشاب کا نمونہ پیش کرنے کے لئے پانچ گھنٹے لٹکائے رکھا۔ اور کہا کہ پیشاب کرنے میں اسے تکلیف ہو رہی ہے حالانکہ اس نے اس درمیان بیئر کی کئی بوتلیں پی ڈالیں۔

معائنہ کیلئے اسے آدھی رات کے وقت لیجایا گیا تھا اور معائنہ کا عمل ختم ہونے کے وقت (3 بجے) تک وہ نمونہ دے پانے میں ناکام رہا۔ بعد میں اسے کھیل گاؤں میں قائم معائنہ مرکز پہنچایا گیا۔ جہاں وہ صبح کے پانچ بجے معائنہ کے لئے پیشاب کر پایا اس سے قبل وہ ایک چاندی اور دو کانسے کے تمغے جیت چکا تھا۔

سوویت یونین میں کمیونزم کے زوال کے بعد امریکا کو بھروسا تھا کہ اس بار وہ اولمپکس میں فاتح اعظم کی حیثیت حاصل کر لے گا لیکن اسکے تقریباً سبھی کھلاڑی سی آئی ایس کے ایتھلیٹوں سے کمتر رہے۔ یہاں تک کہ دوڑ کود مقابلوں میں بھی اس کا وہ نظر نہیں آیا جس کی توقع کی جا رہی تھی البتہ تیراکوں نے اسکی مایوسیوں کو بہت حد تک دور کیا انھوں نے اولمپک سوئمنگ پول پر اپنا دبدبہ قائم رکھا جبکہ تماشائیوں نے سب سے زیادہ داد و تحسین آسٹریلیائی تیراک کرین پرکنس کو دی۔

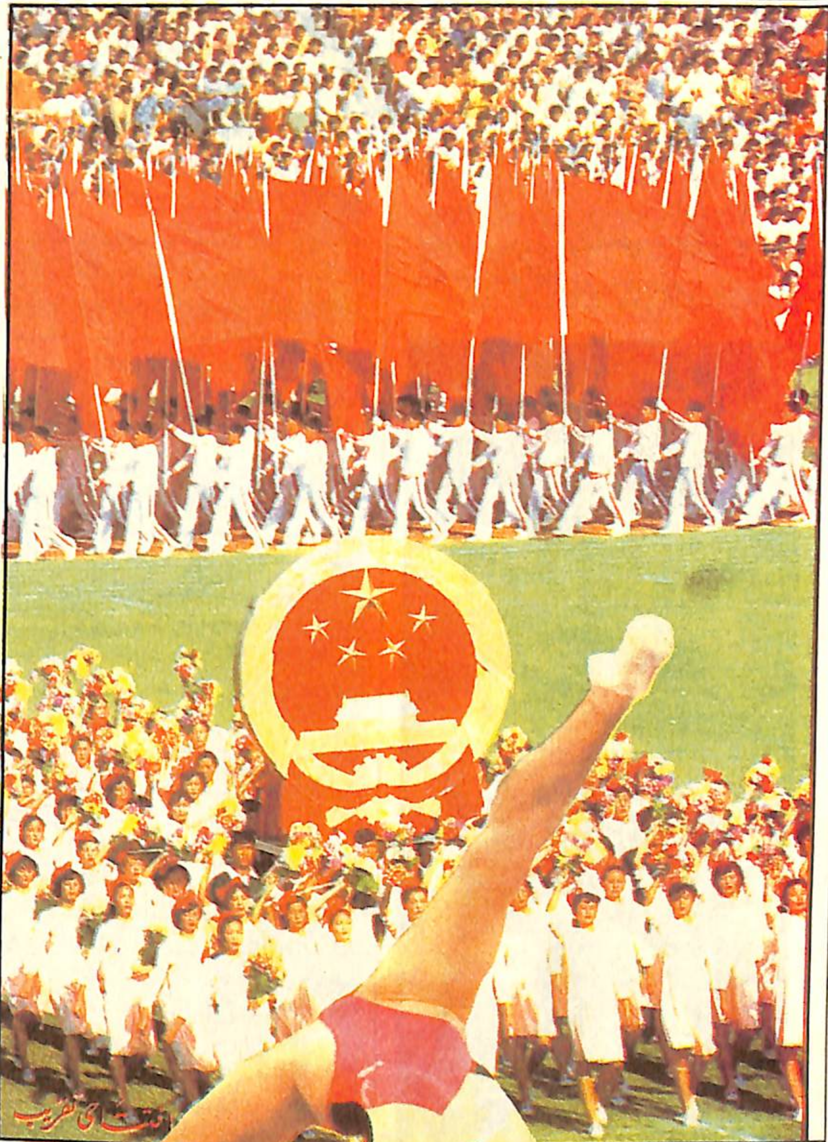
مردوں کے فری اسٹائل تیراکی ڈبلس مقابلوں میں روس کے الیکزینڈر پاپووا اور ای سادوومی نے جیتے جبکہ ہنگری کے کرسٹینا ایگرجیگی اور ٹامس ڈارنی نے مل کر پانچ خطاب حاصل کئے۔ چین کی خواتین کھلاڑیوں نے دو ریکارڈ توڑے اور پہلی بار اولمپک میں چار طلائی تمغے حاصل کئے۔

آسٹریلیا کی کیٹن پارکنس نے 1500 میٹر فری اسٹائل مقابلے میں عالمی ریکارڈ قائم کیا سیول اولمپک کے اسٹار تیراک میٹ بیونڈی سے 50 اور 100 میٹر فری اسٹائل کے خطاب روس کے الیکزینڈر پاپوو نے چھین لئے۔

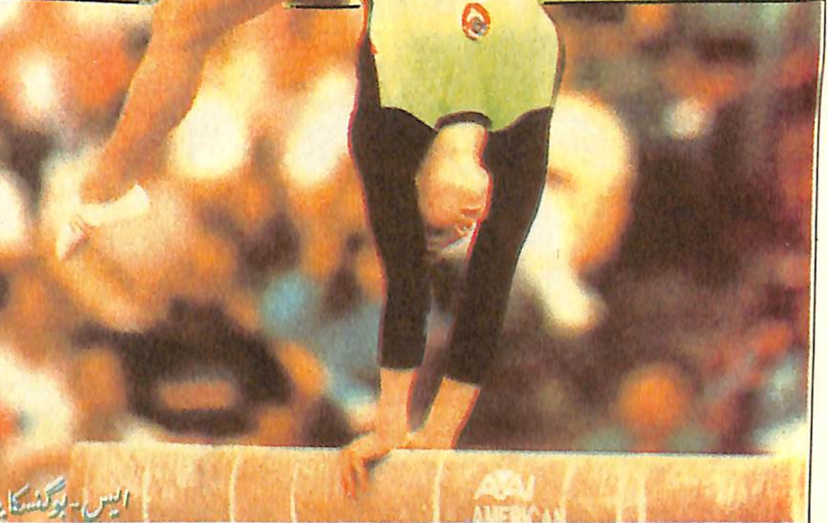
سیول اولمپک میں مائیکل بارومن اور میل اسٹیورٹ کوئی تمغہ حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے لیکن اس بار انھوں نے 200 میٹر بریسٹ اسٹروک اور 200 میٹر بٹر فلائی مقابلوں کا گولڈ میڈل اپنے نام کرانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

انڈونیشیا کے باشندوں کے لئے 5 اگست 1992 کا دن ہمیشہ یاد رکھا جانے والا تھا کیونکہ اولمپک کے بیڈمنٹن مقابلوں میں مردوں و خواتین دونوں کے خطابات انڈونیشیا کے کھلاڑیوں نے اپنے نام کر لئے! اولمپک بیڈمنٹن کے مردوں و خواتین (سنگلز) کے چیمپئن بننے کا اعزاز بالترتیب ایلن بدی کسما اور سوسی سوسانتی کو حاصل ہوا۔

عالمی اعزاز یافتہ سوسانتی نے اپنے پڑوسی ملک جنوبی کوریا کی بینگ سوہیون کو تین سیٹوں میں ہرا کر خواتین کی بیڈمنٹن چیمپئن بننے میں کامیابی حاصل کی تو محض ایک گھنٹے کے اندر ایلن بدی کسما مردوں کے مقابلوں کا سکندر بن گیا اس نے اپنے ہم وطن ارڈی ویرانتا کو ہرا کر یہ خطاب حاصل کیا جبکہ وہ گذشتہ اولمپک میں دوسرے نمبر پر ہی رہ گیا تھا۔ دراصل مردوں کے سنگلز کے تینوں خطاب انڈونیشیا



افتتاحی تقریب



ایس۔ بوگنسکایا

کے حصے میں آئے۔ ایک کانسہ کا تمغہ ہیروان سوسانتو کو ملا جبکہ دوسرا کانسہ کا تمغہ ڈینمارک کے تھامس لوریدسن ہینے حاصل کیا۔ تھامس بیڈمنٹن کے سیمی فائنل میں پہنچنے والا واحد یوروپی کھلاڑی رہا۔

اس سے قبل انڈونیشیا صرف ایک چاندی کا ہی تمغہ جیت پایا تھا جوکہ اسے تیراندازی میں حاصل ہوا تھا اس طرح بیڈمنٹن کو اولمپک میں شامل کرنے کا سب سے زیادہ فائدہ انڈونیشیا کو ہی ملا۔ خواتین اور مردوں (ڈبلز) کے خطابات جنوبی کوریا کے کھلاڑیوں نے حاصل کئے۔ ہانگ چنگ اور چینگ سوچینگ کی کوریائی جوڑی نے مجھان ویجھین اور راین کنہوا کو ہرا کر خواتین (ڈبلز) کی چیمپئن شپ اپنے نام کرلی۔ مردوں کے شعبہ میں کم مون سو اور پارک جو بونگ نے انڈونیشیا کے ایڈی ہور تینو اور ایڈی گن وان کو 7-15 , 11-15 سے آسانی سے شکست دے دی۔

خواتین ڈبلز اور مردوں کے ڈبلز کے کانسے کے تمغے چین کے کھلاڑیوں نے حاصل کئے۔

اس تاریخی کھیل میلے کے آخری دن بارش کی وجہ سے میزبانوں کو کچھ پریشانی ضرور ہوئی تاہم اپنی تیاریوں کے تئیں پُراعتماد کارکنان نے اختتامی تقریبات کو یادگار بنانے میں کوئی کمی نہ رکھی۔

بارسیلونا اولمپک کا جھنڈا اسٹیڈیم سے اتارا گیا تو موسیقی کی زبردست گھن گرج کے باوجود فضائیں سوگوار ہوتی محسوس ہوئیں۔ گام گام بکھرتی موسیقی کی لہروں کے بیچ بارسیلونا اولمپک کی شناخت کوبی نے ایک جگمگاتی کشتی سے سب حاضرین کو الوداع کہا اور دنیا بھر سے جمع ہوئے ایتھلیٹوں نے اسٹیڈیم کا چکر لگا کر رخصت لی۔ دو ہفتوں تک خوشی اور غم کے ملے جلے آنسوؤں سے تر رہے ان کے چہروں پر اطمینان کے تاثرات بخوبی نمایاں تھے۔ بارسیلونا اولمپک میں کھیلوں کے مظاہرے تو کوئی خاص تاریخی نہ رہے لیکن دیگر کئی خصوصیات کے سبب مورخین اسے موضوع تحریر ضرور بنائیں گے۔ جنوبی افریقہ کی 32 سال بعد اور کیوبا کی 21 سال بعد اولمپکس میں واپسی اس کا ایک خوش آئند تاریخی پہلو رہا تو سابقہ سوویت جمہوریاؤں کے اتحاد (سی آئی ایس) کا آخری بار ایک ملک کے طور پر حصہ لینا، یوگوسلاویہ پر اقوام متحدہ کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کے سبب وہاں کے کھلاڑیوں کا ایک ٹیم کی صورت میں نہ کھیل پانا اور تقریباً ایک دہائی تک جنگِ مسلسل کی تباہ کاریوں کے مرکز رہے افغانستان کی جانب سے کھلاڑیوں کے بجائے صرف ایک افسر کا بھیجا جانا بارسیلونا اولمپکس کی ایسی ہی کربناک یادیں ہیں جن پر مورخِ وقت کا قلم اشک بہائے بغیر نہ رہ سکے گا۔



بارسیلونا اولمپک تمغات کی فہرست

ملک	سونا	چاندی	کانسہ	کل تعداد
سی۔آئی۔ایس	.45	38	29	112
امریکہ	37	34	37	108
جرمنی	33	21	28	82
چین	16	22	16	54
کیوبا	14	6	11	31
اسپین	13	7	2	22
جنوبی کوریا	12	5	12	29
ہنگری	11	12	7	30
فرانس	8	5	16	2
آسٹریلیا	7	9	11	27
اٹلی	6	5	8	19
کناڈا	6	5	7	18
برطانیہ	5	3	12	20
رومانیہ	4	6	8	18
چیکوسلواکیہ	4	2	1	7
شمالی کوریا	4	0	5	9
جاپان	3	8	11	22
بلغاریہ	3	7	6	16
پولینڈ	3	6	10	19
نیدرلینڈ	2	6	7	15
کینیا	2	4	2	8
ناروے	2	4	1	7
ترکی	2	2	2	6
انڈونیشیا	2	2	1	5
برازیل	2	1	0	3
یونان	2	0	0	2
سوئڈن	1	7	4	12
نیوزی لینڈ	1	4	5	10
فن لینڈ	1	2	2	5
ڈنمارک	1	1	4	6
مراکو	1	1	1	3
آئرلینڈ	1	1	0	2

اتھوپیا	1	0	2	3
الجیریا	1	0	1	2
ایسٹونیا	1	0	1	2
لیتھوانیا	1	0	1	2
سوئٹزرلینڈ	1	0	0	1
جمیکا	0	3	1	4
نائجیریا	0	3	1	4
لاتویا	0	2	1	3
آسٹریا	0	2	0	2
جنوبی افریقہ	0	2	0	2
نامیبیا	0	2	0	2
بیلجیم	0	1	2	3
کروشیا	0	1	2	3
ایران	0	1	2	3
چیکوسلواکیہ (آزاد)	0	1	2	3
اسرائیل	0	1	1	2
میکسیکو	0	1	0	1
پیرو	0	1	0	1
تائیوان	0	1	0	1
منگولیا	0	0	2	2
سلووینیا	0	0	2	2
ارجنٹینا	0	0	0	1
بہاماس	0	0	1	1
کولمبیا	0	0	1	1
گھانا	0	0	0	1
ملیشیا	0	0	1	1
پاکستان	0	0	1	1
فلپنس	0	0	1	1
پیوٹوریکو	0	0	1	1
قطر	0	0	1	1
سورینام	0	0	1	1
تھائی لینڈ	0	0	0	1



اولمپک کے ہیرو

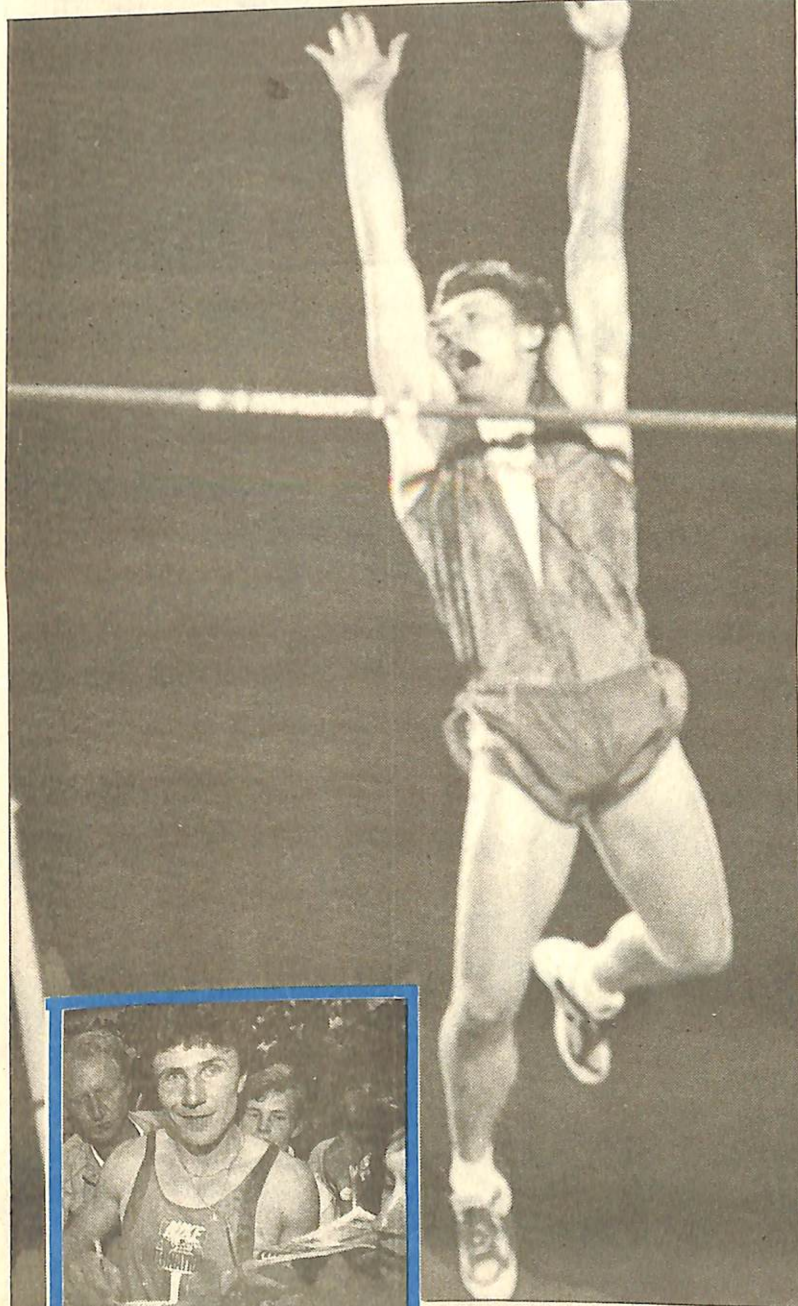
عاصم جعفری

دُنیا کا سب سے بڑا کھیل میلہ بارسیلونا میں ختم ہوگیا۔ 16 دن کی چکا چوندھ ترک بھڑک، ہنگامہ خیزی، تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور مقابلہ آرائی سرد ہوگئی لیکن اپنے پیچھے مسکراہٹوں کے خزانے اور انکوں کی لڑیاں بھی چھوڑ گئی۔ بارسیلونا اولمپک بھی دیگر اولمپک مقابلوں کی طرح یاد تو رہے گا لیکن اس مرتبہ سیول اولمپک کی طرح بڑے پیمانہ پر عالمی ریکارڈ نہ ٹوٹے نہ برابر ہوتے۔ صرف 400 میٹر کی ہرڈل میں امریکہ کے "کیون ہنگ" نے نو سال پرانا عالمی ریکارڈ توڑ کر سنسنی پھیلائی۔

سوویت یونین کے بکھراؤ کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سپر طاقت بن گیا ہے۔ اولمپک کھیلوں میں بھی یہ امید کی جارہی تھی کہ ہمیشہ کھیل کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے سوویت کھلاڑیوں کو امریکہ پیچھے دھکیل دیگا، اُدھر جرمنی کے اعناز نے جرمن والوں کو یہ خواب دکھانے شروع کر دیئے تھے کہ بین الاقوامی سطح پر کھیلوں میں اب ان کی طاقت دوگنی ہوگئی ہے۔ لیکن یہ بات امریکہ اور جرمنی کے سان دگمان میں بھی نہ تھی کہ سوویت یونین کی نو آزاد، ممتاز ریاستوں کی متحدہ ٹیم "سی آئی ایس" کھیل کے ہر شعبہ میں دنیا بھر کے کھلاڑیوں کو تختۂ مشق بنا کر آگے نکل جائے گی۔

جمناسٹک کے مقابلوں میں تو "سی آئی ایس" نے کسی کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ ادھر تیراکی اور ایتھلیٹکس میں ہمیشہ کی طرح امریکی کھلاڑی چھائے رہے۔ تیراکی کے پلیٹ فارم ڈائیونگ مقابلے میں چینی کھلاڑیوں نے امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

1984ء کے لاس اینجلس اولمپک میں کارل لوئس اپنی بہترین پرفارمنس کے باعث ہیرو بن کر ابھرا تھا۔ چار برس بعد سیول مقابلوں میں فلورنس گرفتھ جائنر ممتاز شخصیت کے طور پر چمکی تھی۔ اس کے چرچے ہر ملک کے ہر کھیل عاشق کی زبان پر تھے۔ سیول اولمپک کے ایک عرصہ بعد تک ہی نہیں کہ بارسیلونا اولمپک کی آمد آمد تک بھی وہ اخباروں کی سرخیوں کی زینت بنی ہوئی تھی لیکن بارسیلونا کے حالیہ اولمپک میں کوئی ایسی چکا چوندھ برپا کرنے والی ہنگامہ آرا شخصیت کسی مقابلہ میں کسی ملک کی طرف سے نمودار نہ ہو سکی جسے لوگ عرصۂ دراز تک یاد رکھ سکیں، یا جس نے اسٹیڈیم میں لوگوں کو دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور کر۔



سرگئی بوبکہ اونچی چھلانگ لگاتے ہوئے

دیا ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ بارسیلونا میں سانس روک دینے والے مقابلے نہیں ہوتے، بالکل ہوئے لیکن بارسیلونا کا سکندر یا ہیرو بننے کے لائق کوئی نظر نہیں آیا۔ اولمپک مقابلوں کی ابتدا سے پہلے سب سے لمبی چھلانگ لگانے والے مائک پاویل، پول والٹ میں تہلکہ مچانے والے سرگیئی بوبکہ، سو میٹر ڈیش میں سیول میں سونے کا تمغہ جیتنے کے باوجود محروم ہو جانے والے مائکل جانسن، سانڈر کار پیٹرک تانبانہ، لیدو ولسکیہ، ارنگا، برج چینا، اسٹو لوئس جیکی کرسی، امریکی تیراک، میٹس بیونڈی وغیرہ سے یہ امیدیں باندھی جا چکی تھیں کہ یہ لوگ سیول کے کرشمے دوبارہ دکھائیں گے۔ لیکن چار سال کا عرصہ ان کی چکاچوند کو ماند کر گیا۔ مائکل جانسن نے خود کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں اپنے چاہنے والوں کو بھی مایوس کیا۔ میٹس بیونڈی سونے کے بجائے چاندی کا تمغہ جیت سکے۔ جب کہ بوبکہ کوئی ہنگامہ نہ برپا کر پائے۔

کارل لوئس اور جیکی جائنر کرسی اپنے ان مقابلوں میں تو سونے کے تمغے دوبارہ حاصل نہ کر سکے۔ انہوں نے سیول میں تہلکہ مچایا تھا ہاں اسی لوئس نے لمبی چھلانگ میں سونے کا تمغہ مار لیا۔ اس نے 8.67 میٹر لمبی چھلانگ بھری۔

امریکی ایتھلیٹ کیون ہنگ نے نو برس پرانا ایڈون موسیس کا عالمی ریکارڈ توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ اس نے 400 میٹری ہرڈل میں بنا عالمی اولمپک ریکارڈ قائم کر کے سونے کا تمغہ جیتا ٹریک اور فیلڈ مقابلوں میں امریکی کھلاڑیوں کا تسلط رہا۔ انہوں نے مسلسل تیسری مرتبہ مردوں اور عورتوں کی دو سو میٹر دوڑ بھی جیتی۔ کیون ہنگ نے تو اپنے تمام حریفوں کو تقریباً چھ میٹر پیچھے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہنگ نے 46.78 سیکنڈ کا وقت لیا۔ ایڈون موسنس کے ذریعہ کوبلینج (جرمنی) میں 1983 میں قائم 40.02 سیکنڈ سے 0.24 سیکنڈ بہتر لگا ہے 400 میٹر ہرڈل کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہ 48 سے کم سیکنڈ میں پوری ہوئی۔ اس کی پرفارمنس اور بہتر ہو سکتی تھی۔ اگر وہ آخری رکاوٹ سے نہ ٹکرا جاتا اور دس میٹر پہلے ہی جیت کی خوشی میں ہاتھ نہ اٹھا دیتا۔



ایڈون موسیس



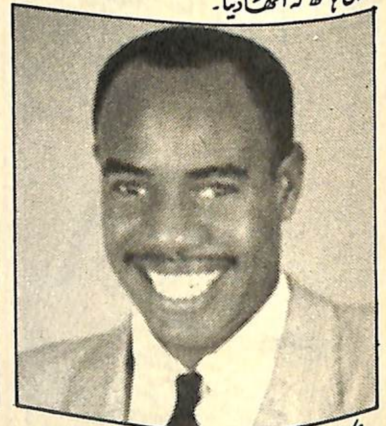
مائیکل جانسن



میٹ بیونڈی

ٹریک اینڈ فیلڈ مقابلوں میں ڈیش ایسا مقابلہ ہے جس پر دنیا بھر کی نگاہیں لگی رہتی ہیں۔ اس دوڑ کو جیتنے والے مرد اور عورت کو دنیا کے تیز رفتار ترین شخصیت تصور کیا جاتا ہے سیول اولمپک میں امریکہ کے مائکل جانسن نے تیز رفتار شخص ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا تھا لیکن وہ ڈرگ ٹسٹ میں پھنس گئے تھے۔ اور انہیں سونے کے تمغے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اور دوسرے نمبر پر آنے والے کارل لوئس کو چیمپین قرار دیدیا گیا تھا۔ دو سال کی پابندی کے بعد جانسن بڑے کر و فر کے ساتھ پھر میدان میں اترا۔ لیکن بدقسمتی ابھی اس پر مسلط ہے، وہ بارسیلونا میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ برطانیہ کا لنفورڈ کرسٹی سب کو حیرت میں مبتلا کر کے سو میٹر ڈیش میں سونے کا تمغہ لے بھاگا۔ لیکن اس کی ٹائمنگ عالمی ریکارڈ قائم کرنے کے لائق نہیں رہی۔ ادھر امریکہ کی گیل یولانڈا ڈیورز نے دنیا بھر کی عورتوں کی جماعت سب سے تیز رفتار ہونے کا سکہ جمایا۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ ڈیورز صرف 18 ماہ قبل تک دوڑنے کی تو بات جانے دیجئے، چلنے پھرنے تک سے معذور تھی۔ ایک خطرناک بیماری کے باعث ڈاکٹر تو اس کا ایک پاؤں کاٹنے تک کے متعلق سوچنے لگے تھے۔ لیکن فلورنس گرفتھ کے کوچ باب کرسی کی شاگردہ ڈیورز نے 12.61 سیکنڈ میں سو میٹر کا فاصلہ طے کر کے سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا۔ اور لوگوں کو حیرت میں بھی مبتلا کر دیا۔

بارسیلونا میں اولمپک کی گہما گہمی ختم ہو چکی ہے، اولمپک ڈسکو بھی خاموش ہے، اسٹیڈیم 16 روز کی تڑک بھڑک کے بعد تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے محروم ہو چکے ہیں۔ اب رونق کا مرکز وہ ممالک ہیں، جن کے کھلاڑیوں نے کسی نہ کسی مقابلے میں کوئی تمغہ حاصل کیا ہے۔ سی آئی ایس کے ٹیم کے کھلاڑی تو رخصت ہونے سے پہلے اس طرح آپس میں مل کر روئے جیسے گھر میں موت کے بعد آہ و زاری کی جاتی ہے۔



مائیک پاویل

بارسیلونا میں ہندوستانی کھلاڑیوں کا کارنامہ

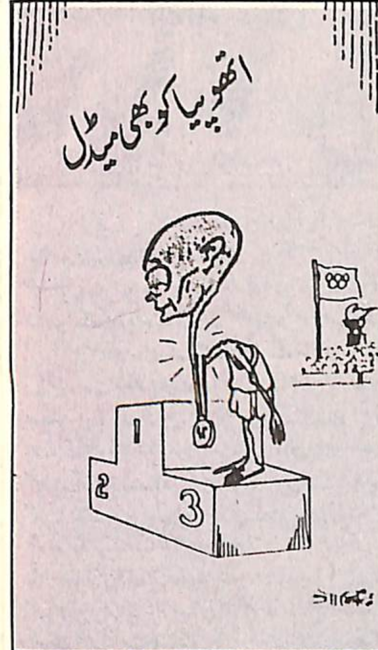
شکست
شکست
شکست

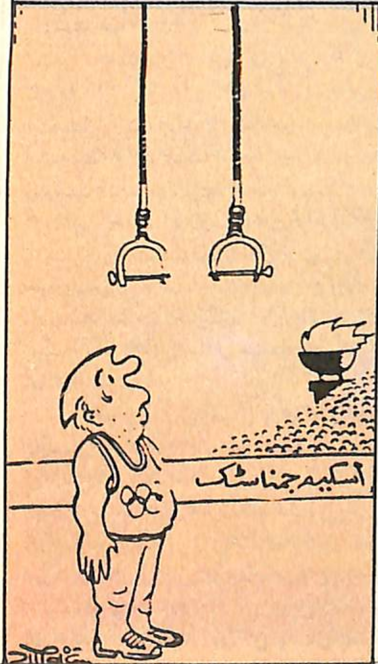
سہیل انجم

اسپین کی راجدھانی بارسیلونا میں پندرہ دنوں تک چلنے والا اولمپک کھیلوں کا تماشہ ختم ہوگیا اور ہمارے لائق وہونہار کھلاڑی اپنے ملک کا نام روشن کئے بغیر واپس آگئے۔ ان کھیلوں میں 172 ممالک کے دس ہزار سے زائد کھلاڑیوں نے شرکت کی اور پورے دو ہفتے تک پوری دنیا کی نگاہیں بارسیلونا پر جمی رہیں۔ جن ممالک کے کھلاڑیوں نے کھیلوں میں شرکت کی وہاں کے بھی اور جہاں کے کھلاڑیوں نے شرکت نہیں کی وہاں کے بھی عوام اولمپک کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ لیکن ابتدائی چند دنوں میں ہی بارسیلونا کے بارونق کھیل ہمارے لئے بے رونق اور پھیکے ہوگئے کیونکہ ہمارے جاں باز اور فنکار کھلاڑیوں نے اپنی فنکاری کا وہ شاندار مظاہرہ کیا کہ نہ صرف ہم بلکہ پوری دنیا ششدر رہ گئی۔ ہمارے کھلاڑیوں کی کارکردگی نے بارسیلونا کے جگمگاتے شہر کو ہمارے لئے شب تاریک میں بدل دیا۔ ان کھیلوں میں شرکت کرنے والے ہمارے 84 کھلاڑی اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرکے خالی ہاتھ واپس آگئے ہیں انھوں نے بارسیلونا سے لایا ہوا وہ تحفہ ہندوستانی عوام کو دیا ہے جس کو وہ کافی دنوں تک فراموش نہیں کرسکیں گے۔ 84 کھلاڑیوں نے 85 کروڑ ہندوستانی عوام کی نمائندگی کا جو حق ادا کیا ہے وہ قابلِ شرم ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے اولمپک شکست کی ہیٹ ٹرک بنائی ہے۔ 84-1988 اور اب 1992 میں تمغوں کی فہرست سے غائب ہونے کا ریکارڈ معمولی نہیں ہے۔

85 کروڑ عوام کے نمائندے 84 کھلاڑیوں نے 12 کھیلوں میں شرکت کی لیکن افسوسناک بات یہ رہی کہ وہ ایک بھی تمغہ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ سونے اور چاندی کی تو بات ہی چھوڑیے کانسے کا بھی تمغہ گلے میں نہیں لٹکا سکے اور جن پہ ہمیں ناز تھا وہ ہمیں عالمی پیمانے پر رسوا کرکے واپس آگئے۔ ہندوستان نے ہاکی، تیراندازی، ایتھلیٹکس، کشتی، مکے بازی، ٹیبل ٹینس، لان ٹینس، جوڈو، نشانے بازی، بیڈمنٹن، کشتی رانی اور ویٹ لفٹنگ میں حصہ لیا اور تمام میدانوں میں انتہائی شانِ بے نیازی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے ہمارے کھلاڑیوں کا دل تمغوں سے بیزار ہوگیا ہے اور انھیں سونے، چاندی اور کانسے کا کوئی لالچ نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن اگر ان کھلاڑیوں کو ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی تو کم از کم اپنے عوام کی خاطر ہی سہی ایسے کھیل کا مظاہرہ کرتے کہ دو ایک تمغے مار لاتے۔ ان عوام کی خاطر کھیلتے جن کے وہ چہیتے ہیں اور جن کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں۔

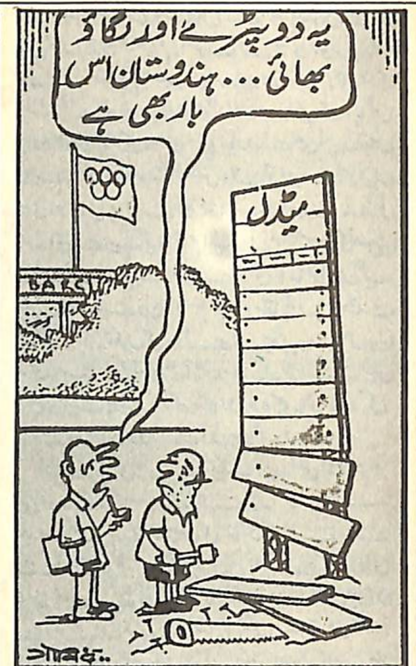
ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی بہت زیادہ اُمید بھی نہیں تھی۔ ہاں ہاکی اور تیراندازی میں ہم ضرور تمغے کی اُمید لگائے بیٹھے تھے لیکن یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ ہاکی کی شکست پر ہمیں اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی کہ تیراندازی کی شکست پر ہوئی۔ لمبارام سے







دور جاکر گرنے میں تو اس ہندوستانی کھلاڑی نے اپنے تمام ریکارڈ توڑ دیئے



ہندوستانی عوام نے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلی تھیں اور وہ اس میں حق بجانب بھی تھے۔ لیکن لمبارام پر شاید نفسیاتی دباؤ پڑگیا اور وہ اس بار کو برداشت نہیں کرسکا۔ ویسے اس کی شکست میں ہمارے کھیل ذمہ داروں کا بھی ہاتھ ہے۔ اس کے کوچ کو بارسیلونا نہ بھیج کر اچھا نہیں کیا گیا۔ اگر اس کے کوچ بھی اس کے ساتھ گئے ہوتے تو شاید لمبارام ہندوستان کے سر سے ندامت اور مایوسی کا بوجھ کچھ کم کرنے میں کامیاب ہوجاتا اور بارسیلونا کے میدان پر ہمارا ترنگا بھی لہرا جاتا۔

بیجنگ میں طلائی تمغہ حاصل کرنے والے لمبارام نے اس اولمپک میں کوالیفائنگ راؤنڈ میں 70 میٹر کے مقابلے میں اپنا سب سے اچھا مظاہرہ کیا تھا۔ اس دن کوریائی تیرانداز نے 338 پوائنٹ کا عالمی ریکارڈ بنایا تھا اور لمبارام اس کو برابر کرنے میں ایک پوائنٹ سے ناکام رہ گیا۔ نئے اولمپک راؤنڈ کے تحت کوالیفائی کرنے والے 32 تیراندازوں کو ناک آؤٹ کی بنیاد پر لڑنا تھا اور یہ مقابلہ میٹر میں ہونا تھا۔ 37 تیروں کے مقابلے میں لمبارام نے 337 پوائنٹ حاصل کئے۔ فائنل راؤنڈ 12 تیروں کا تھا۔ اس کی مناسبت سے لمبارام کی اوسط 120 پوائنٹ میں سے 112 پوائنٹ بنتی تھی۔ لیکن وہ 100 پوائنٹ ہی بنا سکا اور مقابلے سے باہر ہوگیا۔ وہ لمبارام جس کے متعلق ہندوستانی عوام یہاں تک خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ کوئی کھلاڑی طلائی تمغہ لائے یا نہ لائے لمبارام ضرور تمغہ لائے گا اسے اس کے تمغے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ کوارٹر فائنل سے پہلے ہی شکست کھا گیا اور اس کے ساتھ ہندوستانی عوام کی آرزوئیں بھی دم توڑ گئیں۔ حالانکہ لمبارام کی شکست میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیونکہ تیراندازی ایسوسی ایشن نے 6 سال سے رہے اس کے کوچ سومین داس کو بارسیلونا نہیں بھیجا۔ ایک ایسے عالمی سطح کے کھلاڑی کو تو غیر ملکی کوچ مہیا کیا جانا چاہیے تھا لیکن وہ تو دور اس سے اس کا ہندوستانی کوچ بھی چھین لیا گیا۔ اس لئے لمبا کی شکست کے ذمہ دار وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اس کے کوچ کو یہیں روک لیا۔

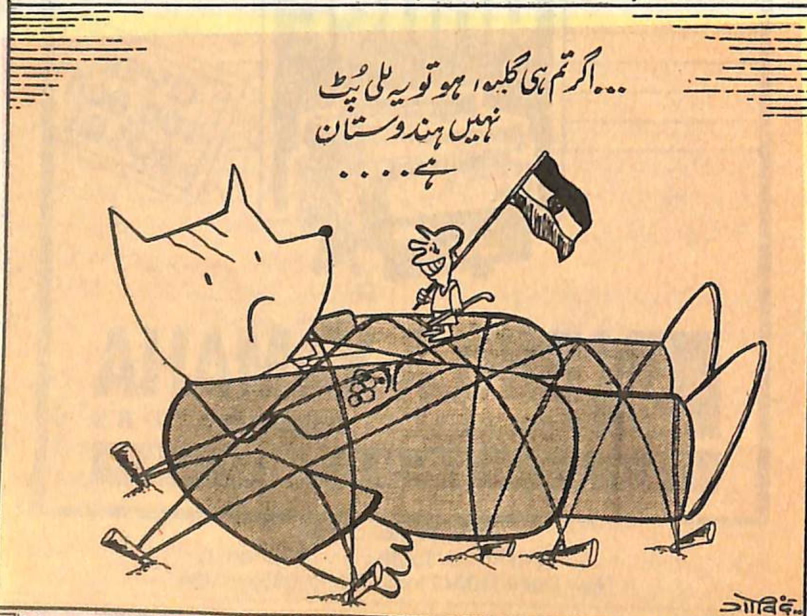
ہاکی میں ہماری شکست نے بھی ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تیر اندازی کے بعد اگر کسی کھیل سے میڈل کی توقع تھی تو وہ ہاکی ہی تھا لیکن ہمارے کھلاڑی سیمی فائنل میں بھی نہیں پہنچ سکے۔ حالانکہ ہاکی میں ہمارا دبدبہ رہا ہے کوئی ٹیم ہم سے مقابلہ کرکے نہیں نکل سکتی تھی لیکن ہم ہاکی میں تنزلی کے شکار ہوتے ہیں اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ہمارے یہاں سے ہاکی کے کھیل سے دلچسپیاں بھی ختم ہوجائینگی۔ 1908 میں پہلی بار ہاکی کو اولمپک میں شامل کیا گیا تھا اور ہندوستانی ٹیم 1928 میں ایمسٹرڈم میں پہلی بار اتری تھی اور سونے کا تمغہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی — ہندوستانی ٹیم نے چار میچوں میں 28 گول کئے تھے اور دنیا کی کوئی بھی ٹیم ایک بھی گول نہیں کرسکی تھی۔ ہماری وہ عظیم الشان روایت آج دم توڑ گئی ہے اور ہم بڑے بے آبرو ہوکر کھیل کے میدانوں سے باہر آنے لگے ہیں۔ ہندوستانی ہاکی ٹیم 1956 تک عالمی چیمپئن بنی رہی لیکن اب وہ سب خواب کی باتیں ہوگئی ہیں۔

بارسیلونا میں ہمارے کھلاڑیوں نے اتنے خراب کھیل کا مظاہرہ کیا کہ ایک بھی پینلٹی کارنر کو گول میں نہیں بدل سکے۔ جرمنی کے خلاف ہندوستان کو تین پینلٹی کارنر ملے اور تینوں ضائع ہوگئے۔ حالانکہ جرمنی کو بھی اتنے ہی پینلٹی کارنر ملے تھے لیکن اس نے اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ ہندوستانی کھلاڑی نہ تو پینلٹی کارنر کو گول میں بدل سکے اور نہ ہی پینلٹی کارنر کو روک سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پسپا ہوگئے۔ اس کے علاوہ فارورڈ بھی ٹھیک سے نہیں کھیل سکے اور جرمنی و برطانیہ اپنی مرضی سے کھیل کا رخ



موڑتے رہے۔ کپتان پرگٹ سنگھ، جگبیر پلے اور مکیش بھی اچھا نہیں کھیلے، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بری طرح نروس ہوگئے ہوں۔ نتیجتاً مقابلے سے باہر ہوگئے۔

ہندوستان کو پاکستان نے 1960 میں ہرا دیا تھا اور خود چیمپئن بن گیا تھا لیکن ہندوستان نے اپنا اعزاز 1964 میں پھر واپس لے لیا تھا۔ لیکن صرف دو ایتھلیٹکس نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ وہ ہیں شائنی ولسن اور بہادر پرشاد، شائنی سیمی فائنل میں بھی نہیں پہنچ سکی۔ البتہ 800 میٹر کا اپنا ہی ایک قومی ریکارڈ توڑا۔ ادھر بہادر بھی کوئی بہادری نہیں دکھا سکا۔



اسس کے بعد تنزلی کے جو بادل چھائے تو آج تک نہیں ہٹے۔ ہم 1984 میں پانچویں مقام پر رہے۔ 88 میں چھٹے پر اور اس بار ساتویں پر آ گئے۔ خدا جانے ابھی ہم اور کتنے نیچے جائیں گے۔

تیراندازی اور ہاکی کے بعد کوئی کھیل ایسا نہیں ہے جس پر تبصرہ کیا جائے۔ لیکن پھر بھی ہلکا سا جائزہ لیتے چلیں۔ ان دونوں مقابلوں کے علاوہ تھوڑی بہت اُمید مکے بازی میں بھی تھی۔ کیونکہ اولمپک میں مکے بازوں کی تعداد کم کر دی گئی تھی اور دوسرے یہ کہ ہمارے مکے بازوں نے کیوبا میں تربیت حاصل کی تھی اور کوالیفائنگ مقابلوں میں شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ بارسیلونا میں ہندوستان سے پانچ مکے باز گئے تھے۔ راجیندر پرساد (لائٹ ویٹ) دھرمیندر یادو (فلائی ویٹ) وی۔ دیوراجن (بینٹم ویٹ) نریندر بشٹ (فیدر ویٹ) اور سندیپ کمار (ویلٹر ویٹ) لیکن راجیندر پرشاد کے علاوہ تمام مکے باز پہلے راؤنڈ سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ البتہ راجیندر دوسرے راؤنڈ میں پہنچ گئے لیکن وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گئے۔

ایتھلیٹکس میں گذشتہ سالوں میں پی۔ ٹی۔ اوشا، شائنی ولسن، اشونی ناچپا، وندنا راؤ، بہادر پرشاد اور دینارام وغیرہ چل رہے تھے لیکن بارسیلونا میں کشتی میں ہندوستان سے 6 پہلوان گئے تھے۔ انل کمار (52 کلوگرام) اشوک کمار (57 کلوگرام) دھرم ویر (62 کلوگرام) سبھاش ورما (100 کلوگرام) تمام فری اسٹائل۔ پپّو یادو (48 کلوگرام) اور ایم۔ آر۔ پاٹل (62 کلوگرام) گریکو رومن، پپو یادو سے بھی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ خصوصاً اس وقت تو امیدوں کا غبارہ کافی اونچائی پر اڑنے لگا تھا جب وہ دو راؤنڈ بڑی آسانی سے جیت گیا۔ تمام اخباروں میں اس کی تصویریں شائع ہوئیں اور ایک طرح سے خوشی کا ماحول بن گیا۔ لیکن دوسرے دن وہ مسلسل دو مقابلوں میں شکست کھا گیا اور تمغوں کی دوڑ سے باہر ہو گیا۔ سبھاش ورما فری اسٹائل کشتی میں تین مقابلے تو جیت گیا لیکن اپنی یہ جیت برقرار نہ رکھ سکا اور وہ بھی پپّو یادو کی مانند تمغوں کی دوڑ سے دور چلا گیا۔

نشانے بازی میں صرف ایک اُمید تھی اور وہ تھی سوما دتا۔ اس کے بارے میں 6 اولمپک کھیلوں میں ہندوستان کی نمائندگی کرنے والے نشانے باز رندھیر سنگھ بہت پر امید تھے کہ وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹے گی۔ کیونکہ گذشتہ چند سالوں میں اس نے امریکہ میں تربیت حاصل کی تھی اس لئے اس کی محنت رائگاں نہیں جائے گی۔ لیکن سوما دتا اپنے ایک مقابلے میں 35 ویں مقام پر رہی اور دوسرے میں بھی ایسی ہی کارکردگی رہی۔ جبکہ اس مقابلے میں کل 40 لوگوں نے ہی شرکت کی تھی۔

اسی طرح ویٹ لفٹنگ میں شیوراج، پی۔ رنگا سوامی اور بی۔ آدی شیکھر بری طرح ناکام رہے۔ یہ لوگ اپنی اس کارکردگی کا ہی مظاہرہ نہیں کر سکے جس کی بنیاد پر انھیں بارسیلونا روانہ کیا گیا تھا۔

بیڈمنٹن میں قومی چیمپئن وِمل کمار پہلے ہی دور میں چینی کھلاڑی سے مات کھا گئے۔ جبکہ ٹیبل ٹینس میں قومی چیمپئن نیتی شاہ اپنے سے پانچویں نمبر پیچھے کھلاڑی سے پہلے ہی دور میں شکست کھا گئی۔ کملیش مہتہ اور سوچیتے گھورپڑے کا بھی یہی حال رہا۔ یہ سلسلہ ٹینس میں بھی رہا۔ رمیش کرشنن کا پہلا مقابلہ دنیا کے نمبر ایک کھلاڑی جم کوریئر سے ہو گیا اور صرف ایک سیٹ جیت کر اسے بھی واپس آجانا پڑا۔ جوڈو میں 9 بار کا قومی چیمپئن کاوس بلی موریا تین اور راجیندر گھوگرے 22 سیکنڈ میں ہی ہار گئے۔ سنگیتا مہتہ اور نریندر سنگھ کا بھی یہی حال رہا۔ کشتی رانی میں فاروق تاراپورا اور سائرس کاما کو دو مہینے تک یورپ میں تربیت دی گئی اور انھیں مہنگی کشتیاں بھی فراہم کی گئیں لیکن وہ صرف 23 ویں مقام تک ہی پہنچ سکے۔

اس طرح ہندوستانی کھلاڑیوں نے ایسی افسوسناک کارکردگی کا مظاہرہ کیا کہ کھیل شروع ہونے کے 72 گھنٹوں کے اندر ہی زیادہ تر کھلاڑی کھیل گاؤں واپس آ گئے۔ 85 کروڑ کی آبادی والے ہندوستان کو ایک بھی تمغہ حاصل نہیں ہو سکا جبکہ اس کے برعکس سورینام جیسے معمولی اور چھوٹے سے ملک کو بھی ایک تمغہ مل گیا۔ ہندوستان کی یہ شرمناک اولمپک شکست برسوں یاد رکھی جائے گی۔

اولمپک 1996 کا میزبان
اٹلانٹا

جگویر گہلوت

گذشتہ دنوں بارسیلونا میں اختتام پذیر ہوئے 25 ویں اولمپک کھیلوں میں دنیا کے 172 ممالک سے تعلق رکھنے والے تقریباً دس ہزار کھلاڑیوں اور کھیل افسران نے اس وعدے کے ساتھ ایک دوسرے کو الوداع کہا کہ 1996 میں امریکہ کے مشہور شہر اٹلانٹا میں نہ صرف 26 ویں اولمپک مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے بلکہ ان کا صد سالہ جشن منانے کیلئے ایک بار پھر جمع ہونگے۔ امریکی ریاست جارجیا کی راجدھانی اٹلانٹا نے زبردست جدوجہد کے بعد کھیلوں کی تاریخ کے اس سب سے بڑے جشن کو اپنے یہاں منعقد کرنے کی منظوری حاصل کرنے میں کامیابی پائی۔

امریکا دنیا کا وہ واحد ملک ہے، جو اب تک تین بار اولمپک مقابلے اپنے یہاں کامیاب طور پر منعقد کرانے کا فخر حاصل کر چکا ہے۔ اور 1996 میں 26 ویں اولمپکس کا میزبان بن کر وہ اپنے اس امتیاز کو مزید بلند کر لیگا۔

1980ء کے دہے میں اولمپک کھیلوں کی بڑھتی مقبولیت کے پیش نظر دنیا کا تقریباً ہر بڑا شہر اولمپک مقابلوں کے اپنے یہاں انعقاد کے لئے کوشاں ہو گیا تھا، ان ہی میں سے ایک تھا اٹلانٹا، جس نے گذشتہ دہائی سے ہی اولمپکس کی صد سالہ تقریبات کے اپنے یہاں انعقاد کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اس کی ان کوششوں کی سندِ کامیابی اس وقت ملی، جب گذشتہ سال بین الاقوامی اولمپک کمیٹی کے صدر جوان اینٹانیو سمارانچ نے باقاعدہ طور پر اس عظیم کھیل میلے کے انعقاد کیلئے اٹلانٹا کے انتخاب کا اعلان کر دیا۔ مسٹر سمارانچ کے اعلان سے قبل اس انتخاب کے لئے اٹلانٹا کی دعویداری کو بہت مضبوط نہیں مانا جا رہا تھا۔ کیونکہ یونان کا دارالحکومت ایتھنس بھی اولمپک کی صد سالہ تقریبات کے انعقاد کا دعویدار تھا، اور اس کا دعویٰ اس لحاظ سے بہت مضبوط سمجھا جا رہا تھا کہ 1896 میں جب جدید اولمپکس شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو اس وقت ایتھنس ہی وہ خوبصورت شہر تھا، جسے ان بین الاقوامی مقابلوں کے انعقاد کا اہل قرار دیا گیا تھا، لہٰذا یہ بات ممکنات کے بہت قریب تھی کہ جہاں ان مقابلوں کی افتتاحی تقریبات منائی گئی تھیں، وہیں ان کا صد سالہ جشن بھی انعقاد پذیر ہوگا۔ لیکن اٹلانٹا والوں نے اپنے شہر کو ہر قیمت پر اس جشن کا مرکز بنا دینے کی قسم کھالی تھی، اور نہ صرف اولمپک کمیٹی کے سامنے کروڑوں ڈالر کی پیشکش رکھی، بلکہ کھلاڑیوں کیلئے بھی جدید ترین اور حیرت انگیز سہولیات مہیا کرانے کا وعدہ کیا۔ اس کی پیشکش دوسرے تمام دعویدار شہروں سے زیادہ متاثر کن اور پرکشش تھی۔ لہٰذا اولمپک کمیٹی نے اٹلانٹا کو 1996 کے ان مقابلوں کے انعقاد کی منظوری دیدی۔ کہا جاتا ہے کہ ٹھنڈے مشروب تیار کرنے والی عالمی شہرت یافتہ کمپنی "کوکا کولا" نے اس ضمن میں ایک زبردست کردار ادا کیا ہے۔ کیونکہ اٹلانٹا کو "کوکا کولا کا شہر" بھی کہا جاتا ہے، اور اب تو 'اٹلانٹا' اور 'کوکا کولا' کا ذکر ہی ایک دوسرے کے بغیر ادھورا رہ جاتا ہے۔ 3، مئی 1886 کو اٹلانٹا کے ہی باشندے ڈاکٹر جان اسٹیو بیمبرٹن نے پہلی بار یہیں پر ٹھنڈا مشروب تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اور آج بھی دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے مشہور ٹھنڈے مشروبات کی کمپنی وہیں پر قائم ہے۔ 1996 کے اولمپک مقابلوں کا میزبان شہر اٹلانٹا "چاتا ہوچی ندی" کے جنوب میں بلو رج ماؤنٹین کے نشیب و فراز میں بسا ہوا ہے۔ اس شہر کا وجود ریل روڈ کے سبب عمل میں آیا۔ آج جہاں فائیو پوائنٹ قائم ہے، اس جگہ کا انتخاب 1837 میں ریل روڈ کے جنوبی ٹرمنس بنانے کے لئے کیا گیا تھا۔ پہلے اس جگہ کو ٹرمنس کہا گیا لیکن 1843 میں گورنر ولسن لمپکن کی بیٹی 'مارتھا' کے اعزاز میں اسی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اور پھر ٹھیک دو سال بعد 1845 میں اس شہر کا نام اٹلانٹا رکھ دیا گیا۔ کیونکہ مغربی اور اٹلانٹک ریل روڈ یہاں سے ہو کر گزرتا ہے۔

جدید اٹلانٹا آمد و رفت، سیر و سیاحت، مارکٹنگ، ثقافتی تقریبات اور عالمی شہرت یافتہ کمپنیوں کے مرکزی دفاتر کو اپنے سینے پر سجائے ماضی کو بہت پیچھے چھوڑتا ہوا اپنے تابناک مستقبل کی طرف گامزن ہے۔ اس شہر کی تاریخ بہت ہی دلچسپ اور دردناک ہے۔ جو اس کے قومی پرندے 'فونکس' سے بہت مشابہ ہے۔ وہاں کی زبان زدِ عام روایت کے مطابق 'فونکس' 500 سال تک زندہ رہنے کے بعد چتا میں زندہ جل کر راکھ ہو گیا۔ اور پھر راکھ کے ڈھیر سے ازسرِ نو زندہ ہوا تھا۔ کچھ ایسا ہی اٹلانٹا کے ساتھ بھی ہوا۔

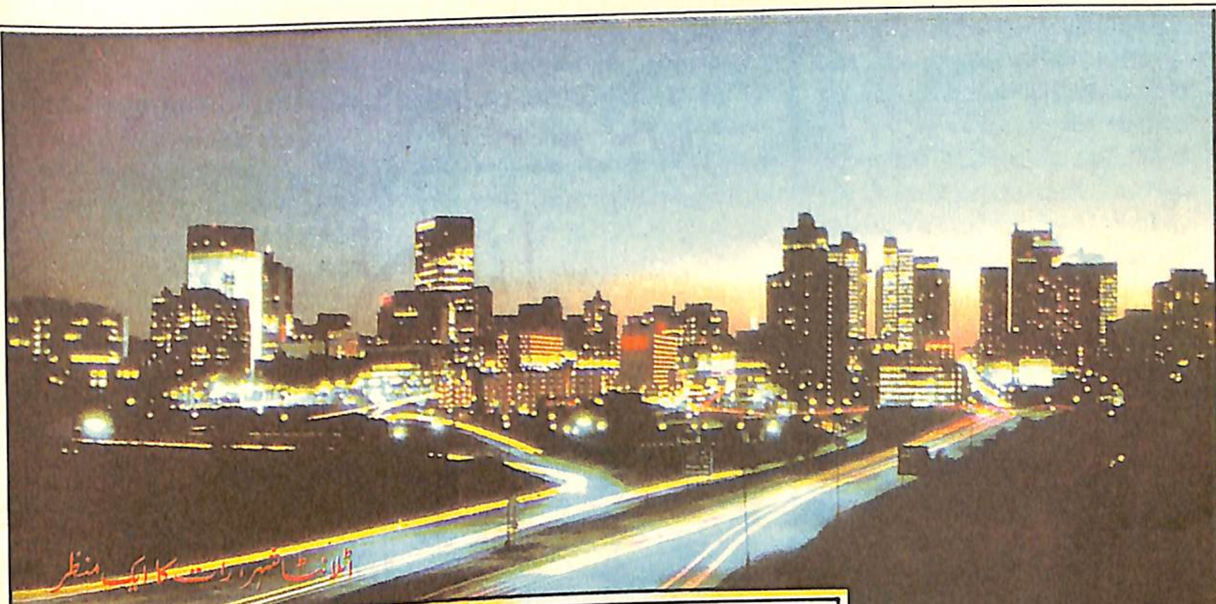
تقریباً ایک صدی قبل امریکا میں خانہ جنگی کے دوران یہ شہر بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ لیکن سب کچھ خاکستر ہو جانے کے بعد جب یہ شہر پھر سے زندگی کی طرف گامزن ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ترقی دنیا بھر کے تمام بڑے شہروں کے لئے ایک مثال بن گئی۔ اگرچہ دوبارہ وجود میں آنے تک اس شہر نے متعدد صورتیں اختیار کیں۔ لیکن اس کی تہذیبی اور ثقافتی ترقی بہرحال قابل دید ہے۔

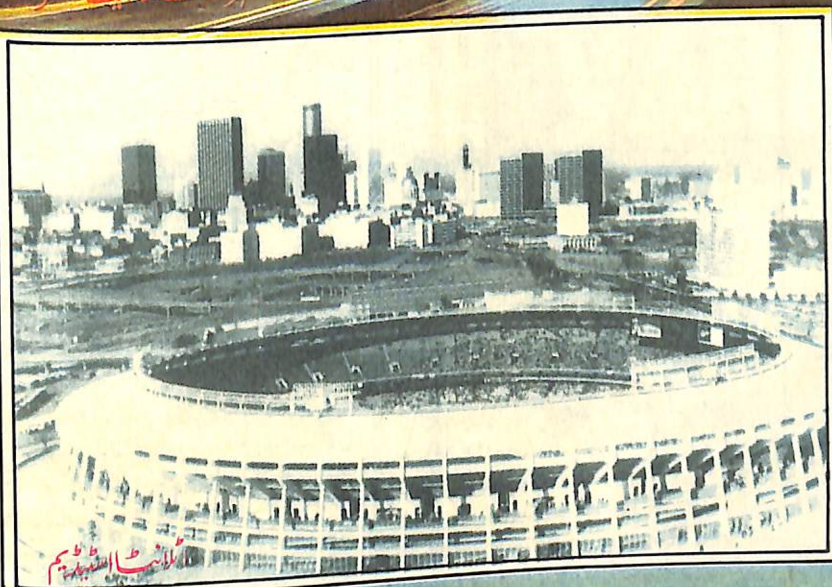
اٹلانٹا پرکشش مقامات سے بھی مالا مال ہے۔ وہاں کی کاروباری سرگرمیوں کا مرکز "پیچ ٹری" سینٹر ہے۔ اس کو ایک گمنام جنوب مشرقی شہر سے عالمی شہرت یافتہ سیاحتی مرکز بنانے میں جان پورٹ مین نے اہم کردار ادا کیا ہے، جان پورٹ مین اپنے ہوٹلوں اور سیاحتی مراکز قائم کرنے کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان کے ذریعے بنائے گئے ہوٹلوں، اور سیاحتی مراکز نے اس شہر کی ایک امیر و کبیر شہر کے طور پر شناخت قائم کی ہے، اور انہی کے ذریعے تعمیر کردہ "پیچ ٹری سینٹر" نے اٹلانٹا کو جدید کاری کا ہم معنی بنا دیا ہے۔

فی زمانہ اٹلانٹا لاس کے بعد دنیا کا دوسرا مصروف ترین کاروباری مرکز بن گیا ہے۔ وہاں کے موسم، وہاں کے معیار زندگی، اور وہاں فراہم روزگار کے موقعوں نے سبھی کو لبھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کی کاروباری سرگرمیوں میں روز بروز وسعت آتی جا رہی ہے وہ لوگ جنہوں نے اس شہر کو بنظرِ خود دیکھا ہے۔ وہ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے، 20 لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں "چاتا ہوچی" ندی کے علاوہ بھی کئی ایسے مقامات ہیں جو اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ باہری علاقوں میں ہرے بھرے جنگلات نہ صرف شہر کی حدود متعین کرتے ہیں بلکہ فردوس بر روئے زمیں کا نظارہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ہالی ووڈ کے فلمسازوں کو بھی اس شہر نے بے حد متاثر کیا ہے، متعدد فلمسازوں نے گذشتہ 20 سالوں میں یہاں تقریباً 250 کروڑ ڈالر خرچ کئے ہیں۔ وہاں پہنچنے والے سیاح 'سکس فلیگ' نامی تفریحی پارک سے اپنی سیاحتی مہم کا آغاز کر کے عالمی شہرت یافتہ "اسٹون ماؤنٹین میموریل پارک" تک اپنے ذوق کی مکمل تسکین پاتے ہیں۔

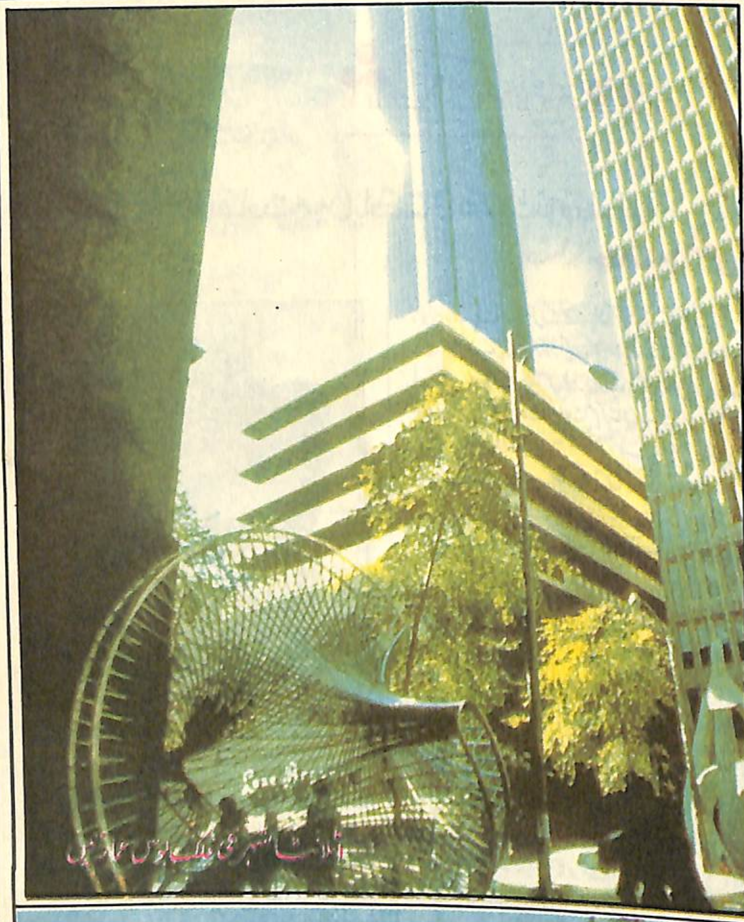
یہ 'اسٹون ماؤنٹین پارک' 1923 میں بنایا گیا تھا۔ جب سنگتراش گٹزن بورگلم نے امریکی خانہ جنگی کے تین ہیروز، رابرٹ لی، اسٹونوال جیکسن اور جیفرسن ڈیوس کے اعزاز میں چٹانوں کو تراش کر ان کے مجسموں کی شکل دی تھی۔ اب یہی مجسمے وہاں پہنچنے والوں کی دلچسپی کا خاص مرکز ہیں۔ اس کے نیچے گولف کورس، ٹینس کورٹ اور وسیع جھیل کا لطف لینے کے لئے کشتیوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

سالانہ اوسط درجہ حرارت 16 سے 20 ڈگری سیلسیس رہنے کے سبب وہاں کے گولف کلب اور ٹینس کورٹ کبھی بند نہیں ہوتے۔ سائیکلوراما اور ٹائی میوزیم ایسے مقامات ہیں جہاں پہنچ کر ہر عمر کے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔


اٹلانٹا شہر رات کا ایک منظر


اٹلانٹا اسٹیڈیم


اٹلانٹا شہر کا ایک منظر



اٹلانٹا شہر کی فلک بوس عمارتیں

سائیکلورما میوزیم میں اٹلانٹا جنگ کی سہ ابعادی (تھری ڈائمنشن) تصادیر آویزاں ھیں. سیاحوں کی تفریح کے لئے تقریباً 85 لاکھ ڈالر کی لاگت سے یہ میوزیم تیار کرایا گیا ہے۔ اسی طرح ٹائے میوزیم میں رکھے گئے تقریباً ایک لاکھ عجیب و غریب کھلونے بچوں سے بوڑھوں تک سبھی کو مسحور کرتے ہیں۔ اسی میوزیم سے ملحق ہے اٹلانٹا میموریل آرٹ سینٹر جو 1968 میں قائم کیا گیا تھا۔ سمفنی ہال آرٹ اسکول اور تھیٹر اس آرٹ سینٹر کی اہم خصوصیات ھیں۔

مشرق کی زندہ دلی اور جنوب کی مہمان نوازی کا حسین امتزاج یہ شہر امن کے لئے نوبل انعام یافتہ مارٹن لوتھر کنگ جونیر کا بھی پسندیدہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی رزمیہ نظم "گوم وددی ونڈ" کی مصنفہ مارگریٹ شیل نے بھی اپنی اس عظیم کتاب کی تخلیق اسی شہر کی آغوش میں کی تھی۔

یہی وہ تمام خصوصی دلچسپیاں ہیں، جنہوں نے اٹلانٹا کو دنیا بھر کے تمام شہروں میں امتیازی مقام کا حقدار بنا دیا ہے اور اب بارسیلونا اولمپکس کے اختتام کے ساتھ ہی اٹلانٹا میں 26 ویں اولمپکس اور ان کی صد سالہ تقریبات کے انعقاد کی تیاریاں جنگی پیمانے پر شروع ہو گئی ھیں۔ 80 کے دہے میں کروڑوں ڈالر کی لاگت سے بنایا گیا اسٹیڈیم 1996 میں وہاں پہونچنے والے کھلاڑیوں اور کھیل افسران کے استقبال کے لئے سجا کر دلہن بنایا جائے گا۔ اور اسی اسٹیڈیم میں 26 ویں اولمپکس کی افتتاحی تقریبات منعقد ہوں گی۔



اسٹون ماؤنٹین

سہارا کلب

راشٹریہ سہارا

نام:
مشغلہ:
پتہ:

SAHARA CLUB
RASHTRIYA SAHARA,
URDU MONTHLY,
C-3, SECTOR 11,
NOIDA-U.P.

سہارا کلب کا ممبر بننے کے لیے اپنے پاسپورٹ سائز فوٹو کے ساتھ مندرجہ بالا کوپن بھر کر بھیجیں

نام: سید نجف علی
مشغلہ: قلمی دوستی، مختلف رسائل کا مطالعہ
پتہ: کمرہ نمبر 14، رواق خالد، دار العلوم، دیوبند

نام: طارق رضا خاں
مشغلہ: مطالعہ کتب و دوستی۔
پتہ: اکبر پور، پوسٹ روہتاس، ضلع روہتاس۔ بہار

نام: ایم۔ آصف شمسی
مشغلہ: سیر و سیاحت قلمی دوستی۔
پتہ: تحصیل سواز، ضلع رامپور (یو۔ پی)

نام: محمد اطہر اللہ خاں
مشغلہ: کرکٹ کھیلنا، قلمی دوستی۔
پتہ: محلہ کوٹ غربی سنبھل (یو۔ پی)

نام: محمد علی چاند
مشغلہ: قلمی دوستی۔
پتہ: 201، رحمت پورہ، اسلام آباد، میرٹھ۔

نام: حفظ الرحمٰن
مشغلہ: رسائل پڑھنا، غزلیں سننا اور اشعار جمع کرنا
پتہ: مہدی ٹیلرنگ، القطیف الجارودیہ، سعودی عربیہ

نام: مسرور مرزا
مشغلہ: رومانی گانے سننا، قلمی دوستی۔
پتہ: ادریس کالونی، کانٹا ٹولی۔ رانچی۔ بہار

نام: ڈاکٹر عقیل ملک
مشغلہ: اخبار و رسائل کا مطالعہ۔ قلمی دوستی۔
پتہ: محمد پارہ اسٹریٹ ہاپور (یو۔ پی)

نام: امتیاز احمد بیتاب
مشغلہ: قلمی دوستی، مطالعہ شعر و شاعری، کرکٹ دیکھنا
پتہ: کیو 55، ایس۔ اے فاروقی روڈ، گارڈن ریچ کلکتہ

نام: محمد حسن فیضان (گڈو)
مشغلہ: قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا۔
پتہ: مکان نمبر 607 جمالپور، علی گڑھ (یو۔ پی)

نام: وقار احمد صدیقی
مشغلہ: شعر و شاعری، کتابیں پڑھنا
پتہ: صدر چوک محلہ صدیقیان راجہ کا تاجپور، ضلع بجنور۔

نام: سید وسیم الدین
مشغلہ: قلمی دوستی، سیاست میں دلچسپی
پتہ: محلہ پولیان، قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر (یو پی)

نام: ایم۔ اے۔ اکبر
مشغلہ: دوستی کرنا، کرکٹ کھیلنا، فلم دیکھنا
پتہ: فینسی ہوزری 6-22-166، پتھر گھٹی حیدر آباد

نام: مسٹر وسیم احمد راجا
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا، کتب بینی۔
پتہ: کوارٹر نمبر EF-614، بی۔ ٹی۔ پی۔ ایس، بیگو سرائے بہار

نام: شبنم منصور
مشغلہ: قلمی دوستی، غزلیں لکھنا، راشٹریہ سہارا پڑھنا
پتہ: خلاصی محلہ، مدھوپور، دیوگھر (بہار)

نام: محمد شاہد
مشغلہ: بیڈمنٹن کھیلنا، راشٹریہ سہارا پڑھنا
پتہ: محلہ نجوپورہ، ٹانڈہ، باؤلی، رامپور (یو پی)

نام: محمود الحسن انصاری
مشغلہ: کتابوں کا مطالعہ، کرکٹ کھیلنا
پتہ: جے 3/38، کٹھیر، وارانسی (یو پی)

نام: محمد اسلام قریشی
مشغلہ: قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا
پتہ: پڑاؤ چوک، قصبہ میرانپور ضلع مظفر نگر (یو۔ پی)

نام: انور خاں
مشغلہ: قلمی دوستی، مطالعہ سے دلچسپی
پتہ: جھرنا کالونی، کوارٹر نمبر 323/A صاحب گنج، بہار

نام: اویس احمد عثمانی
مشغلہ: راشٹریہ سہارا پڑھنا، قلمی دوستی۔
پتہ: محلہ کوڑے بندان، سہارنپور (یو پی)

نام: محمد اکرم عمر
مشغلہ: عام معلومات حاصل کرنا، سیر و سیاحت
پتہ: مکان نمبر 16-3-232 چنچل گوڑہ، حیدر آباد۔

نام: معراج عالم
مشغلہ: قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا، چٹکلے کہنا۔
پتہ: محلہ دیوی داس، کھتولی، مظفر نگر (یو۔ پی)

نام: شیخ عبدالقادر
مشغلہ: تاریخی عمارات دیکھنا، راشٹریہ سہارا پڑھنا
پتہ: F187۔ شاہین باغ، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا۔

نام: سکندر امروہوی
مشغلہ: قلمی دوستی، غزل افسانے لکھنا
پتہ: حبیب سائیکل ورکس پنجابی گیٹ، بلی ماران، دہلی

نام: محمد عرفان
مشغلہ: ریڈیو پروگراموں کو دلچسپی سے سننا۔
پتہ: معرفت محمد عثمان چھوٹی سبزی منڈی، بہرائچ بہار

نام: عرفان عالم
مشغلہ: قلمی دوستی، پڑھنا لکھنا
پتہ: عرفان اسٹورس، نیا ٹولی، چوک لانچی۔ بہار

نام: اشفاق احمد انصاری
مشغلہ: قلمی دوستی۔
پتہ: نیوز پیپر ایجنٹ کیبن نمبر 21 تین بتی۔ بھیونڈی۔

نام: سید صفی احمد عاصم
مشغلہ: قلمی دوستی، مطالعہ کرنا۔
پتہ: مکان نمبر 20-1-434 حسینی عالم۔ حیدر آباد

نام: بلال احمد
مشغلہ: راشٹریہ سہارا پڑھنا، کرکٹ میچ دیکھنا۔
پتہ: نظامپورہ، بھیونڈی۔ ضلع تھانہ۔ مہاراشٹر

نام: محمد جاوید
مشغلہ: قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا۔
پتہ: مکان نمبر 38-5-3 مدینہ مسجد، محبوب نگر (اے۔پی)

نام: اعجاز احمد قریشی
مشغلہ: قلمی دوستی۔ کرکٹ کھیلنا
پتہ: 224-3-17 ایس۔ کے۔ روڈ، الی بن یاقوت پورہ، حیدرآباد

نام: محمد سراج الدین گیاوی
مشغلہ: قلمی دوستی کتب بینی
پتہ: پریم چھنج۔ گیا، بہار۔

نام: محمد شبیر عالم
مشغلہ: قلمی دوستی
پتہ: 67- مفید الاسلام لین، کلکتہ:

نام: زبیر احمد انصاری
مشغلہ: اچھے اشعار اور ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: مسجد روڈ، دنکولر مغربی بنگال۔

نام: ثنا الرحمن
مشغلہ: زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا۔
پتہ: 31/1۔ دیبندرا ملک اسٹریٹ۔ کلکتہ

نام: نوشاد علی
مشغلہ: دوستی کرنا۔
پتہ: کمرہ نمبر 24۔ ایس آر کے ہوسٹل، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

نام: محمد ناصر عباسی
مشغلہ: قلمی دوستی
پتہ: محلہ مسندی نزدیک کوردی بی بی کا گیٹ شاہجہانپور

نام: محمد آصف وارثی
مشغلہ: قلمی دوستی، معلوماتی ادبی رسائل پڑھنا۔
پتہ: ملینے منوچہنٹ لکھنو، اترپردیش

نام: محمد عالم
مشغلہ: قلمی دوستی، رسالہ پڑھنا۔
پتہ: محلہ مفتی سرائے، چاندپور، ضلع بجنور (یو۔پی)

نام: جمال احمد
مشغلہ: دوستی کرنا، مزاحیہ کردار کرنا۔
پتہ: محلہ چمن پورہ، چمن روڈ، کوپاگنج، ضلع مئوناتھ بھنجن۔

نام: سعود گلریز
مشغلہ: تاریخی مقاموں کی سیر، ہاکی کھیلنا۔
پتہ: محلہ قاضی سرائے نگینہ ضلع بجنور (یو۔پی)

نام: محمد علی صدیقی
مشغلہ: قلمی دوستی، بزنس کرنا۔ فٹ بال کھیلنا۔
پتہ: نوراللہ مسجد، گلی نمبر 4، آدم پارک، شاستری نگر۔ دہلی

نام: محمد منیر الدین
مشغلہ: کتابیں پڑھنا، ٹی وی کے پروگرام دیکھنا۔
پتہ: مکان نمبر 102-4-1 محبوب نگر (آندھرا پردیش)

نام: عرفان احمد
مشغلہ: قلمی دوستی، اسکرپٹ لکھنا
پتہ: A307/1۔ بدھا مارگ، منڈاولی۔ فاضل پور، دہلی۔

نام: محمود احمد
مشغلہ: قلمی دوستی
پتہ: A307/1 بدھا مارگ منڈاولی۔ فاضل پور۔ دہلی

نام: محمد رفیق
مشغلہ: قلمی دوستی، حق بات بولنا
پتہ: 62 تلتلہ لین، کلکتہ

نام: مظفر سجابی
مشغلہ: اردو رسائل پڑھنا، قلمی دوستی
پتہ: بدر بک سینٹر، راجدھانی روڈ، تاجپور، سمستی پور، بہار

نام: سید ریاض حیدر
مشغلہ: قلمی دوستی، کھیل سے دلچسپی۔
پتہ: محلہ نواڈیہ، پوسٹ اورنگ آباد (بہار)

نام: محمد توقیر عالم نظمی
مشغلہ: قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا
پتہ: ہوم کلکشن، چرچ روڈ، رانچی (بہار)

نام: عبدالناصر خاں
مشغلہ: کمنٹری سننا، کرکٹ کھیلنا۔
پتہ: 3342 کوچہ پنڈت گلی سوار خاں۔ دہلی۔

نام: شگفتہ نسرین
مشغلہ: قلمی دوستی، پڑھائی کرنا
پتہ: 51/17 کاوینر گھاٹ روڈ سب پور، ہوڑہ، کلکتہ

نام: محمد حمید
مشغلہ: دوستی کرنا، کتابیں پڑھنا، تفریح
پتہ: بیلا ٹیلرنگ کم کلاتھ، سیر ہپور بازار ضلع بردوان۔

نام: شاہد اقبال انصاری
مشغلہ: قلمی دوستی۔ اشعار جمع کرنا۔
پتہ: محمود پور، لوہتہ رانسی (یو۔پی)

نام: مشتاق احمد
مشغلہ: قلمی دوستی۔
پتہ: محلہ ہٹھی مداری مئوناتھ بھنجن (یو۔پی)

نام: محمد قمر صدیقی
مشغلہ افسانہ نویسی، ٹکٹ جمع کرنا۔ دوستی
پتہ: روم نمبر 35 آفتاب ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نام: ایم۔ ناظم۔ صدیقی
مشغلہ: قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا۔
پتہ: فلورل۔ جی۔ جی۔ آئی کی روڈ، کچھا۔ وارڈ نمبر 4 مینی تال

نام: محمد متین
مشغلہ: قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا
پتہ: ندیم جنرل اسٹور ٹیلر مارکیٹ گڈا سمبھل۔ یو۔پی

نام: محمد سیف الاسلام سیف
مشغلہ: قلمی دوستی، رسالے پڑھنا
پتہ: روم نمبر 44 اقبال ہاسٹل، پٹنہ کالج، پٹنہ

نام: دبیر احمد کریمی
مشغلہ: قلمی دوستی، مطالعہ کرنا
پتہ: کھتل پور مینا پور وایا اورائی۔ مظفر پور (بہار)

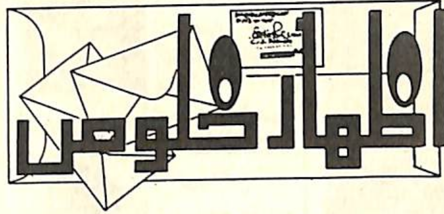
نام: محمد آصف
مشغلہ: مطالعہ کرنا، قلمی دوستی۔
پتہ: سی۔ ایچ 16 سلیمان ہال اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

نام: حاجی جلیس احمد
مشغلہ: قلمی دوستی، سیر و سیاحت
پتہ: سلیم کٹ پیس سنٹر ٹانڈہ۔ باد لی۔ رامپور۔

نام: کے۔ آر۔ "گوڑے"
مشغلہ: قلمی دوستی، شعر و شاعری، غزل گوئی
پتہ: فاضل پور پوسٹ شاہ پور پھلواری ضلع سمستی پور۔ بہار

نام: زیب النساء
مشغلہ: قلمی دوستی سیر و سیاحت
پتہ: 5412 کوچہ رحمن، اونچی گلی، چاندنی چوک۔ دہلی

نام: محمد جہانگیر خاں زخمی
مشغلہ: قلمی دوستی، لوگوں کے کام آنا
پتہ: بڑا اکبر شریف، پوسٹ سلاؤ۔ ضلع نالندہ (بہار)



محترمی ــــــــ گلہائے عقیدت

جس طرح سرسبز شاداب پتوں کو دیکھ کر دل مچل اٹھتا ہے، مسرت کی لہریں رگوں میں دوڑ جاتی ہیں۔ "راشٹریہ سہارا" کا ہرا بھرا آنگن دیکھ کر میرا بھی یہی حال ہوا۔ ماشاء اللہ کیا نکھرا نکھرا چہرہ ہے اس کے ہونٹ بھی پرکشش ہیں خدا نظر بد سے بچائے آپ کو بھی اور "راشٹریہ سہارا" کو بھی ــ!

اس کے خوبصورت دالان میں داخل ہوتے ہی آپ کی عرق ریزی اور دماغ سوزی کی خوشبوئیں محسوس ہوتی ہیں۔ یہ رسالہ نہیں گلہائے رنگا رنگ ہے۔ اسے ادبی گروپ بندی کا شکار ہونے نہیں دیجئے گا۔ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کی بانسری سُریلی نہیں ہوتی۔

ــــــــ جلیل بازید پوری، بمبئی

مکرمی ــــــــ تسلیمات

اُمید کرتا ہوں کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

"راشٹریہ سہارا"، موصول ہوا۔ آپ نے اُردو رسالوں کو ایک نیا وژن دیا ہے۔ آپ کا رسالہ تمام مسائل اور زندگی کے تمام شعبوں کو ادب سے براہ راست جوڑنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ "راشٹریہ سہارا" کی بقا کے لئے ہم سبھوں کو حسب توفیق کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ خدا اس میں آپ کو مکمل طور سے کامیاب کرے۔

ــــــــ احمد نثار

جھریا (بہار)

مکرمی ــــــــ سلام عقیدت

"راشٹریہ سہارا"، کے ذریعہ آپ نے اُردو والوں کے ذوق کو جو جلا بخشی وہ قابلِ تحسین ہے۔ یقیناً اب سے پہلے سارے بھارت میں اتنا صاف وشفاف جریدہ نکالنے کی جسارت کسی نے نہیں کی، بڑے بڑے اُردو کے ٹھیکہ داروں کی شیخی دھری رہ گئی اور اپنے بہت ہی قلیل وقفے میں اردو کے قارئین کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایسا رسالہ شائع کیا جو مدتوں کی تشنگی دور کرنے کے لئے کافی ہے۔

ــــــــ حکیم آذر

بی گیس اسٹریٹ، لاجا بازار، کلکتہ

محترمی ــــــــ تسلیمات!

"راشٹریہ سہارا"، کے لئے افسانہ "تاخیر سے کیا گیا فیصلہ"، روانہ کر رہی ہوں۔ اُمید ہے افسانہ پسند آئے گا۔

بہت خوبصورت رسالہ نکال رہے ہیں آپ، اردو والوں کے لئے ایک نایاب تحفہ۔

"راشٹریہ سہارا" کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ۔

ــــــــ بانو سرتاج

چندر پور (مہاراشٹر)

محترم ــــــــ خلوص و مبارکباد

مستقل "راشٹریہ سہارا" پڑھ رہا ہوں، آپ نے ملک کے معتبر اور مستند ادیبوں کی خدمات حاصل کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے اس سے اُمید ہے کہ نئی جہتوں کا سفر آسان ہوگا، "بساطِ سیاست" کے تحت اس بار اسد رضا، م۔ک۔ مہتاب اور صہبا وحید کے علاوہ "نظریات" کے تحت رفعت سروش اور گوپی چند نارنگ کے تاثرات پڑھنے والے مضامین ہیں، اُردو میں اب تک کسی ماہنامے نے اس طرح کی کوشش نہیں کی، اب اس کو وسائل کی کمی کہئے یا اور کچھ۔ بہر حال آپ نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔

ــــــــ فصیح اکمل

تھانہ (مہاراشٹر)

مکرمی ــــــــ سلام خلوص

"راشٹر سہارا" اُردو کے تین شمارے دیکھ چکا ہوں۔ کیا خوب پرچہ آپ نے جاری کیا ہے۔ مجھے حسرت آمیز حیرت ہوئی۔ رسالہ ہمہ خوبیوں سے آراستہ ہے۔ کاش میں نے پہلی فرمائش پر کہانی بھیجی ہوتی۔ تاخیر سے سہی اپنا تازہ ترین افسانہ "چنبیلی" بھیج رہا ہوں۔ کہانی کسی اور پرچہ کے لئے قلمبند کی گئی تھی لیکن "راشٹریہ سہارا" کی صوری و معنوی خوبیوں سے متاثر ہو کر میں اسے آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں یقین ہے کہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔

رسالہ میں سیاسی حصّہ کچھ کم کر کے ادبی حصّہ کے لئے وقف کر دیجیے تاکہ پرچہ کا اوّلین تاثر ادبی رسالہ کا بنے۔ جواب کا انتظار رہے گا۔ فقط والسلام

ــــــــ موسیٰ مجروح

بانسی، سدھارتھ نگر، یوپی

محترم ــــــــ آداب و تسلیمات

آپ کے رسالے "راشٹریہ سہارا"، کی تعریف کرنے کے لئے میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جو اس کے شایانِ شان ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ کوزے میں سمندر ہے، پھولوں میں خوشبو ہے، ہواؤں میں تازگی ہے۔ پریوں سا حسن ہے، کائنات جیسی شوخی، رسالہ کامیابی کی منزلوں سے گزرتا ہوا حدِّ امکان سے آگے بڑھ رہا ہے، یہ آپ کی ادارت کا ہی ثمرہ ہے۔

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے

ــــــــ معین مختصر

اناؤ۔ یوپی 209801

آہ! آیت اللہ خوئی

8 اگست: عظیم شیعہ عالم زمانہ آیت اللہ ابوالقاسم خوئی کا نجف اشرف (عراق) میں انتقال ہوگیا۔ آپ 96 برس کے تھے۔ آقا خوئی نے اپنی پوری زندگی ملت اسلامیہ کے لئے وقف کر دی تھی اور ظلم و جبر کی شدت کے باوجود وہ راہ مستقیم سے کبھی نہیں ہٹے۔ آپ کی عمر کے آخری سال قید و بند میں گزرے اور وہ سختیوں و اذیتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ نے اپنے جد امجد حضرت امام حسین علیہ السلام کے اس قول پر عمل کیا کہ "عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے"۔ آیت اللہ خوئی مرحوم گذشتہ دو دہائیوں سے زائد شیعوں کی دینی رہنمائی کر رہے تھے۔ عراق میں ناکام شیعہ مزاحمت کے بعد آپ کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ آقا خوئی مرحوم کو اپنے شاگردوں اور معتقدین سے ملنے تک کی اجازت نہیں دی گئی۔ آپ کے انتقال پر دنیا بھر کی شیعہ تنظیموں اور انجمنوں نے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستان کے متعدد قصبوں اور شہروں میں آقا خوئی کی رحلت کی خبر سُن کر مجالس عزا اور جلسے منعقد کئے جا رہے ہیں۔ حکومتِ ایران نے خوئی مرحوم کے انتقالِ پُر ملال پر تین دن کا سوگ منایا۔

راشٹریہ سہارا

ماہنامہ — نئی دہلی

ایک سال تک مفت حاصل کریں

محترم قارئین

اُردو ماہنامہ "راشٹریہ سہارا" کا 10 واں شمارہ (خصوصی نمبر) آپ کے زیرِ نظر ہے۔ اس سے قبل کے 9 شمارے بھی آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ راشٹریہ سہارا سرزمینِ ہند سے شائع ہونے والا اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہے جس میں سیاست، ادب، گوشہ خواتین، فلم، ٹی وی، اسپورٹس سب کچھ ایک ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسے اور بہتر بنانے کے لیے آپ کی گرانقدر رائے ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی لہٰذا ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ جلد از جلد ہمیں اپنی رائے اور مشوروں سے نوازیں۔

- اظہارِ رائے میں شمولیت کے لیے ایک خاکہ دیا جا رہا ہے اسے بھر کر بھیجیں۔
- پسند آنے والے 100 خطوط پر ایک برس کے لیے اُردو ماہنامہ "راشٹریہ سہارا" 'مفت' ارسال کیا جائے گا۔

آپ کی نظر میں

	بہت اچھا ہے	بس ٹھیک ہے	اچھا نہیں ہے	یہ کالم بند کر دینا چاہیے	راشٹریہ سہارا میں آپ کو سب سے اچھا کیا لگتا ہے	یہ کالم شروع کرنا چاہیے	راشٹریہ سہارا میں آپ کو کیا اچھا نہیں لگتا	اسے اور بہتر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔
سیاست								
مداخلت								
ادب								
خواتین								
فلم								
ٹی۔ وی								
کھیل								
پرنٹنگ								
تزئین و پیش کش								

✓ کوئی ایک خانہ ٹِک کریں

ضرورت پڑنے پر الگ سے کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

راشٹریہ سہارا

سالنامہ

نام ---------------- عمر ---------- تعلیم ----------

مکمل پتہ

اب تک راشٹریہ سہارا کے کُل کتنے شمارے زیرِ مطالعہ رہے ؟

جواب:

سب سے اچھا شمارہ کون سا لگا اور کیوں ؟

جواب:

آپ راشٹریہ سہارا کے علاوہ اور کون سے رسالے پڑھتے ہیں ؟

جواب:

کیا راشٹریہ سہارا مِلنے میں آپ کو کوئی پریشانی ہوتی ہے ؟

جواب:

آپ کے شہر میں اردو کے کون کون سے رسالے پہنچتے ہیں ؟

جواب:

راشٹریہ سہارا کے کس کالم میں آپ کیا کمی محسوس کرتے ہیں ؟

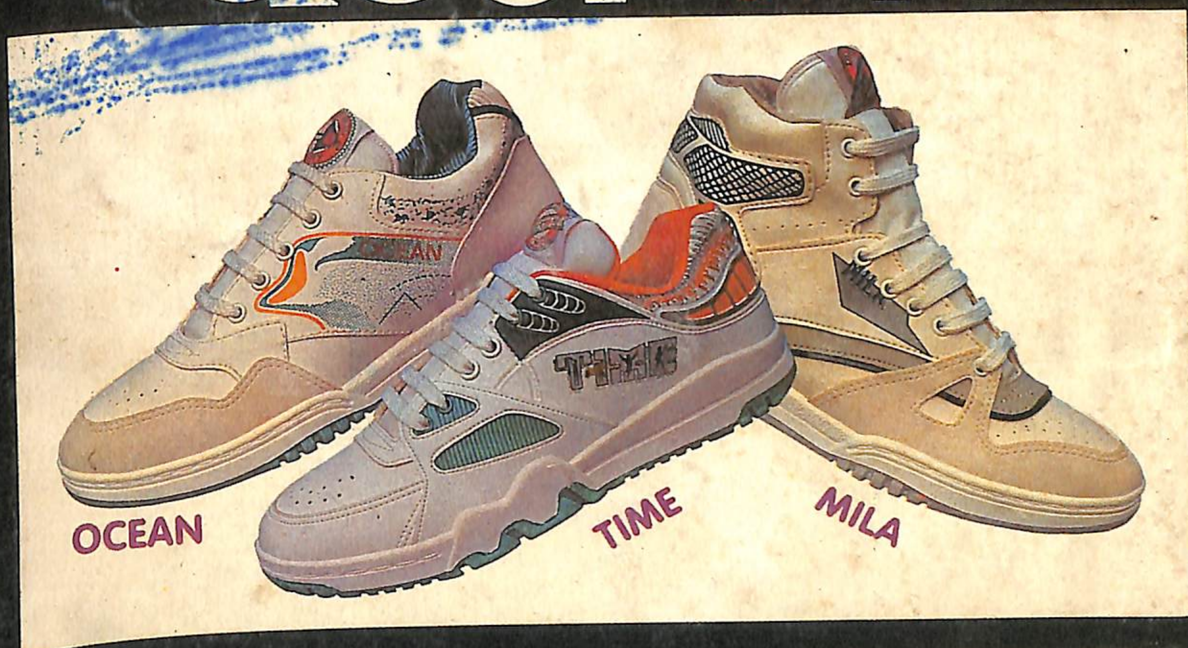
جواب:

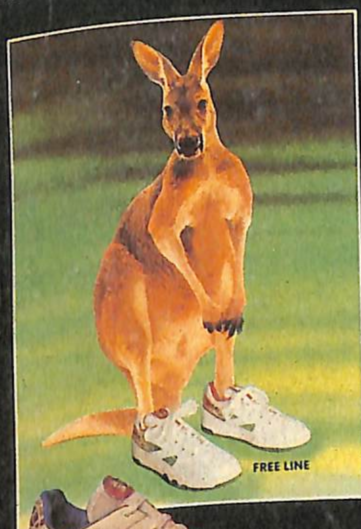
شرائط

آپ کی رائے ہمیں 15 ستمبر تک موصول ہو جانی چاہیے۔
آپ کی رائے اسی کوپن کے ساتھ آنا ضروری ہے الگ سے یا فوٹو کاپی پر رائے قبول نہیں کی جائے گی۔ اس کے ساتھ چاہیں تو الگ کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
تحریر صاف اور خوشخط ہونا چاہیے تاکہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔
ایک شخص کی ایک سے زیادہ آرا قابلِ قبول نہیں ہوں گی۔
ایک ہی گھر یا خاندان کے الگ الگ افراد اپنی اپنی رائے کا الگ الگ اظہار کر سکتے ہیں۔

نوٹ: ادارہ راشٹریہ سہارا کے ذریعے منتخب تمام افراد کے نام پتے 15 اکتوبر کو شائع ہونے والے سالنامے میں شائع کیے جائیں گے۔

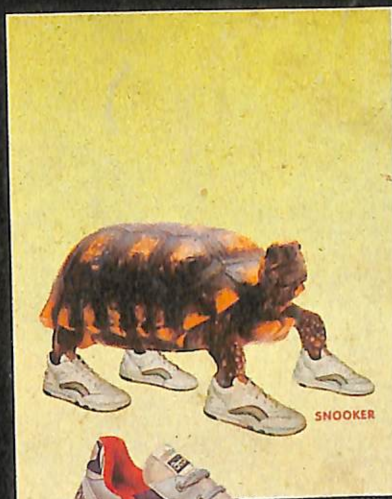
action®





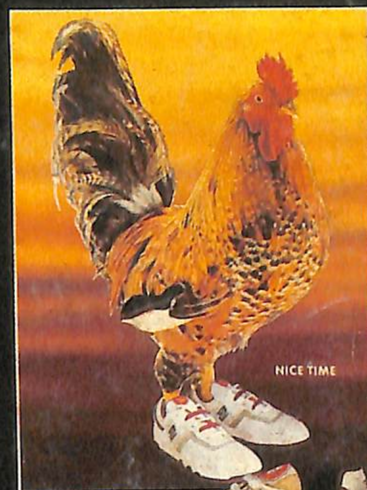


CUB AMERICAN





MELBOURNE





HI-TIME



WE ARE IN STEP WITH TIME.